UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224224

UNIVERSAL
LIBRARY

جلد ۱۸ ـ عدد

محرم ۱۳۶۰ھ

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پنچھ روڈ۔ لاہور

قیمت فی

فہرست مضامین

(سلسلۂ سیاسی کشمکش حصہ سوم)

اصلی مسلمانوں کے لئے ایک ہی راہ عمل - - -	۱
اسلام کی راہ راست - - -	۱۲
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے - - -	۴۷
جماعت اسلامی کی تشکیل - - -	۸۳

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس میں طبع ہو کر
دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک، پونچھہ روڈ، لاہور سے شائع ہوا

اصلی مسلمانوں کیلیے ایک ہی راہِ عمل

پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لیکر آیا ہے۔ اُسکا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتی کہ اُسکے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہوجائے۔ اور اسکا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کردیں، یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرمانروائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اُسکی رعیت پر صرف اُسکا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتداء سے لیکر آتے رہے ہیں۔ اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی و جہد کو مرکوز کیا ہے۔ اور مسلمان، جو انبیاء کے وارث اور انکے پیرو ہیں، اُنکے لیے بھی اسکے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہِ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپکو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہِ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کرلیے ہیں جنکو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اس اعتراض کو سُن کر اصولی حیثیت سے صحیح تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں:

"آزادی پسند"[1] علماء اور اُنکے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، جیسی مصر ایران عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اسکے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں۔ اکثریت غیر مسلم ہے، حکومت الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اسکی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اسوقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر، انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کرینگے اور اپنے اصلی نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دینگے۔ اسکے سوا اور کوئی راستہ اسوقت قابل عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اُسکے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اول تو قلیل التعداد ہیں پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے۔ اور مزید برآں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دور ہٹاتی ہے، مگر سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ "ہم ہندوستانی قوم" میں شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو

[1] یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ مغربی تصورات کی تقلید میں اب علماء تک آزادی اور غلامی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کرنے لگے ہیں کہ غیر قوم کے تسلط میں ہونا "غلامی" اور اس سے نجات پا جانے کا نام "آزادی" ہے۔ حالانکہ اسلام کا تصور یہ نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک خدا کے سوا ہر ایک کی، حتیٰ کہ اپنی خواہش نفس کی اطاعت بھی غلامی ہے اور اس سے رہائی پا کر صرف خدا کا مطیع ہونا آزادی ہے۔

اس مقصد میں اسکے کامیاب ہوجانے کے معنی یہ ہونگے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھودیں، پھر بھلا حکومت الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جاسکے گا۔ لہٰذا سرِدست اسکے سوا کوئی قابلِ عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی لڑکر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصورِ جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کریں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آجائینگے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور انکی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کرکے رفتہ رفتہ حکومت جمہوریہ کو حکومت الٰہیہ میں تبدیل کرلینگے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہینگے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومت الٰہیہ کے راستہ میں انکو اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریق کار (Technique) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہوجاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے، اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لیکر اُٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اس کے ساتھ ہوجاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا سمندر اسکے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اسکے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اس قہر و تسلط کی سرے

سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جسکا نوحہ کرتے کرتے ہمارے "مسلم قوم پرست"[1] بھائیوں کے آنسو خشک ہوئے جا رہے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجۂ ظلم و شکنجۂ قہر میں اُنکو کستی تھی، اُسکو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریز فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جا سکتی جنکے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی رات دن رویا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہرحال رسول اور اصحابِ رسول حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اس مقصد میں ناکام ہوئے ہیں، اُنکو اور اُنکے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اسکے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی تھا، انہوں نے آخری سانس تک اسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگاری کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے نہ فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے، اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اُسکی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر ہی کی کوئی حاجت ہے کہ اُس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت ماننے والے سب انسان اسکے لیے

[1] یعنی مسلم قومیت کے پرستار۔

یکساں ہیں۔ سب کی اس سے اور اسکی سب سے یکسان لڑائی ہے۔ مسیحؑ سے رومیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اس سے زیادہ ہولناک برتاؤ وہ تھا جو ابراہیمؑ سے انکی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پا رہے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں قوی بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اُسکے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اسکی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اسکی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اسکی معاشی حالت کیسی ہے؟ اسکے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھروں کا؟ انہی سوالات کے جواب پر اسکا مستقبل منحصر ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اسکو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی خاص قوم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک دعوت لے کر اُٹھے، اسکے سامنے اِن سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اُسکے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اُسکی کامیابی و ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اسکے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم انسانی فطرت کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اسکی طرف دعوت دینے والے خود اسکی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آ رہی ہے اسکی اصلی وجہ یہی ہے کہ انکے سوچنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے اندر خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جنکا تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور انکی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بنکر رہ جاتے ہیں، اُس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچتی ہیں، ایسے مسائل میں اُلجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اِس طرزِ فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو

سدِّ راہ پاتے ہیں جو محض قومی مفاد ہی کے لیے سدِّ راہ ہوا کرتی ہیں۔ اِن لوگوں نے آج تک اِن دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر فیصلہ کیا کہ دراصل یہ ہیں کیا، اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین نہ کر سکے جو تناقض سے خالی اور الجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت، یا ہندوویت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ انکی طرف دوسروں کو دعوت دی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انکو پیش کیا جا سکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ ان دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہو سکتی ہے اُنہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو ان دائروں کے اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو اِن سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اسکی برتری کے معاملہ میں اسکا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ تو صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ انکے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ تو ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلہ کار بنا لیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لا کر جرمنوں کا ولی حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار کر کے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اسکی مقتضی ہو۔ اور جہاں انکے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلاتِ جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقتور ہو وہ اسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہو گئے؟ فن لینڈ اور رومانیا

کو روس اور جرمنی سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہٰذا جسکی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اُس نے کمزور کو دبالیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اسکو دوست ملتے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنایا ہوا ایک ایسا گروہ (Group) ہیں جسکی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابلِ تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی اپنی قومی اغراض و مقاصد کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرۃً غیر ممکن ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مقاصد اُسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جنکا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (National state) ہے جسکے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرت تعداد ہوا کرتی ہے؟ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (National minority) کی رہ جاتی ہے جسکے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنیکے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے؟ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہلِ وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے، تو بلاشبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اسوقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا سہارا لیکر ہندو امپیریلزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور مسلم قوم پرستی

بھی صحیح جسکی بنا پر حق اور اصول سے قطع نظر کرکے ہر اُس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے، قومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہشمند ہو، ان تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدبیریں اختیار کرسکتی ہے؟ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرسکیں گے حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

دراصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک ہی میں ہے، جو انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہو اور اسکے سامنے خود اسکی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اسکا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اسکی طاقت کا انحصار اپنے پیروؤں کی تعداد یا انکے وسائل پر نہیں ہوتا۔ ایک اکیلا آدمی اسکو چلانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اُسکے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں ان پر وہ صرف اپنی توپ و تفنگ سے ہی آتش باری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے۔ خون کے پیاسے دشمنوں میں سے وہ اپنے گرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سپاہی، جرنل، ماہرین فنون، سرمایہ دار، صناع اور کاریگر سب انہی میں سے اسکو مل جاتے ہیں اور بے سروسامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اسکے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھیر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اسکے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح پگھل کر اس آب رواں میں جذب ہوجاتے ہیں۔ اُسکے لیے اقلیت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں۔ وہ

اسکی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور بادسیلہ قوم کی طاقت اُسکی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کرسکیں۔ اُسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں، مگر جب فطرت انسانی پر لگا ہوا زنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے کہ

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بامید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

مسلمان قرآن اور سیرت رسول کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں۔ جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپکو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوع کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے رہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پاکر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپکو قوم کہتے کہتے وہ سب محدودیتیں بھی انھوں نے اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کرلی ہوں جو ایک قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصلی حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیرووں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد کانفرنس، سب کی اس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرف باطل کی طرح محو کردینے کے لائق ٹھیرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ وہ حکومت ہمارے کسی کام کی ہے جو انگریز کی حاکمیت کے بجائے جمہور کی حاکمیت پر مبنی ہو، نہ اُن ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے،

نہ اکثریت کی بنیاد پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اُس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیان ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان، سب کے سامنے پیش کر دینگے۔ جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلا لحاظ اس کے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اس تحریک کو لے کر اُٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد و اغراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں، اور اُن چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹا لیں جن سے ہمارے حقیر دنیوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندوستانیت کا تعصب ہوگا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہرے ہو جائیں۔ اگر ہم نام نہاد مسلم قومیت کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے۔ اگر ہم حیدر آباد، بھوپال، بہاول پور اور رام پور جیسی ریاستوں کی حمایت محض اس لیے کریں کہ انکے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا مل جاتا ہے، تو کوئی احمق ہی ہوگا جو اسکے بعد بھی یہ باور کریگا کہ ہم اسلام کے نظریۂ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری ادارات میں مسلمانوں کی نمائندگی پر جھگڑا کریں تو ہماری اس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصولِ اسلام کی فرمانروائی قائم کرنے اُٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسب آبادی کے لحاظ سے تقسیم ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرے سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک

وطنی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اِس فعل میں اور ہماری اُس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی، صحت عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائیگی۔ اس راستہ پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ہمیں بہت نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اٹھائے بغیر اسلامی تحریک کبھی چلی ہے نہ کبھی چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سیدنا مسیحؑ کے بقول جبہ جاتا ہے تو کُرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔

اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں

مسلمانوں میں سے جو لوگ پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جمائے ہوئے ہیں، اور جو انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی پر اپنی آئندہ کی تمام امیدوں کا انحصار رکھتے ہیں، اور جو ان دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف براہ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب لوگ جھجکتے ہیں۔ مشکلات کا ایک بہت بڑا پہاڑ انکو اس راستے میں حائل نظر آتا ہے اور اُس کو دور سے دیکھ کر یہ دائیں یا بائیں جانب مُڑ جاتے ہیں تاکہ پہیر کے راستوں سے نکل جائیں۔ حالانکہ میں علی وجہ البصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی نصب العین تک کسی پہیر کے راستے سے پہنچنا غیر ممکن ہے۔ اسکی طرف اگر پیش قدمی کی جاسکتی ہے تو براہِ راست ہی کی جاسکتی ہے، اور جو مشکلات اس راستہ میں نظر آتی ہیں وہ ناقابلِ عبور نہیں ہیں بلکہ ہر وقت قابلِ عبور ہیں بشرطیکہ انکو صحیح طور سے سمجھنے اور دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اوپر کے فقرے میں جو مجمل دعوے میں نے کیا ہے اب میں اس کا تجزیہ کر کے ایک ایک جزو پر الگ الگ بحث کرونگا۔

۱۔ اصل اسلامی نصب العین کیا ہے؟

۲۔ اسکی طرف پیش قدمی کا سیدھا راستہ کونسا ہے؟

۳۔ اس راستہ میں جو مشکلات نظر آتی ہیں وہ کیا ہیں؟

۴۔ ان مشکلات کو دیکھ کر پہیر کے راستے کونسے اختیار کیے جا رہے ہیں؟

۵- ان مختلف راستوں میں غلطی کیا ہے اور یہ اصل مقصود تک کیوں نہیں پہنچا سکتے؟

۶- مشکلات کی حقیقی نوعیت کیا ہے اور وہ کس طرح دور ہو سکتی ہیں؟

یہ سوالات ہیں جن پر مجھے اس مضمون میں مختصراً بحث کرنی ہے۔

۱- اسلامی نصب العین

پہلے سوال کا جواب قرآن مجید میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِۦ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔

"وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسکو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ یہ کام مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو"

اس آیت میں الھدیٰ (ہدایت) سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام، سوسائیٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمت عملی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسان کی زندگی کے لیے صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے، یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا کر بھیجا ہے۔

دوسری چیز جو اللہ کا رسول لے کر آیا ہے وہ دینِ حق ہے۔ دین کے معنی اطاعت کے ہیں کیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ اس کا اصل معنی موضوع لہٗ نہیں ہے بلکہ اسکو دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان خیال و عمل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ ورنہ دراصل دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانۂ حال میں لفظ "سٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اسکی اطاعت کرنا، یہ "اسٹیٹ" ہے۔ یہی دین کا مفہوم بھی ہے، اور "دین حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کی

اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اُسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے۔

پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اِس نظامِ اطاعت (دین) اور اُس قانونِ حیات (الھدیٰ) کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے۔ پوری جنسِ دین سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کر رہا ہے وہ سب "جنسِ دین" کی مختلف انواع ہیں۔ بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا، ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا، رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا، پیروؤں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا، یہ اور ایسی ہی دوسری بے شمار اطاعتیں بحیثیت مجموعی ایک نظامِ اطاعت بناتی ہیں اور اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ اطاعت اپنے تمام اجزاء سمیت ایک بڑی اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جائے، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں، اُن سب کو منضبط (Regulate) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو، اور اُس بڑی اطاعت اور اُس ضابطۂ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اِس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے، خواہ شرک کرنے والے اُس پر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔ شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں۔ جہاں تک اللہ کے قانونِ طبیعی (Law of nature) کا تعلق ہے، ہر انسان طوعاً و کرہاً اسکی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ اس اطاعت کے بغیر تو اُسکے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے دائرۂ

اختیار کا تعلق ہے، اس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کسی حصہ میں خدا کے بھیجے ہوئے قانونِ اخلاقی (شریعت) کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی دوسرے حصہ میں اپنے نفس کی یا دوسروں کی اطاعت کرتے ہیں۔ اسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری اطاعتوں کو شریک کرنا ہے، اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں، اُن کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکلیہ اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ خواہ نادانی کے سبب سے، یا اخلاقی کمزوری کے سبب سے، بہرحال وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں، لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی مزاحمت کے باوجود وہ اپنے مشن کو پورا کرے۔

۲۔ اسلامی نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین، اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راہِ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو "الھدیٰ" اور "دینِ حق" کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں، اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنا لیں اُن کا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے۔ پھر یہ جتھا تمام اُن اخلاقی، علمی اور مادّی ذرائع سے جو اسکے امکان میں ہوں، دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرے یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں اُن سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے نظام اطاعت پر وہی الھدیٰ اور دینِ حق غالب ہو جائے۔

اِس راہِ راست کا ہر جزء قابلِ غور ہے:

پہلا جزء یہ ہے کہ انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اسکے بھیجے ہوئے

قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہونی چاہیے۔ ہر وقت جاری رہنی چاہیے اور اسکے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے۔ قوموں اور نسلوں اور ملکوں کے باہمی جھگڑے خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی بحثیں، غیر الٰہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایسے نظامِ فاسد کی خود غرضانہ حمایت کرنا، یا کسی نظامِ فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ الھدیٰ اور دینِ حق کی دعوت کے ساتھ میل نہیں کھاتیں بلکہ صریح طور پر اُس کے منافی اور اسکے لیے مضرت رساں ہیں۔ پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوتِ حق کی خدمت انجام دینی ہو تو اسے اِن تمام جھگڑوں اور بحثوں سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قضیے کو شامل نہ کرنا چاہیے۔

دوسرا جزء یہ ہے کہ جتھا صرف اُن لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ واقعی شریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانونِ زندگی بنا لیں۔ رہے دوسرے لوگ جو اس طرزِ خیال یا اس طرزِ زندگی کے محض معترف ہوں، یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں، تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتھے کے لیڈر کیا معنی، کارکن بھی نہیں بن سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جس درجہ میں بھی اس کا ہمدرد یا بیرونی معاون بن جائے بسا غنیمت ہے، مگر ارکان اور ہمدردوں کے درمیان جو حقیقی فرق و امتیاز ہے اُسے کسی حال میں نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

تیسرا جزء یہ ہے کہ براہِ راست غیر الٰہی نظامِ اطاعت پر حملہ کیا جائے، تمام کوششوں کا مقصود صرف اِس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو، اور اسکے سوا کسی دوسری چیز کو مقصود بنا کر اسکے پیچھے قوتیں ضائع نہ کی جائیں۔

۳۔ مشکلات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں، قریب قریب اُن سب کا

دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا نصب العین اسلامی نصب العین ہی ہے، مگر ان سب نے اُس راہِ راست کو چھوڑ دیا ہے جسکی تشریح ابھی میں نے بیان کی ہے۔ وہ نہ تو "الھدیٰ" اور "دینِ حق" کی خالص، بے آمیز دعوتِ عام دیتی ہیں۔ نہ اُس پارٹی کی تشکیل کرتی ہیں جسکی قیادت و رکنیت صرف اُن لوگوں تک محدود ہو جو واقعی اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خاص کرتے ہوں۔ اور نہ وہ غیر متعلق مقاصد کو چھوڑ کر صرف اُس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا ہدف بناتی ہیں جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ راہِ راست سے اِن تینوں اجزاء سے یہ سب جماعتیں منحرف ہو گئی ہیں۔

اس انحراف نے مختلف جماعتوں کے مسلک میں کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں؟ اسکی تفصیل میں بعد میں بیان کرونگا۔ پہلے میں اس انحراف کا سبب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اِن لوگوں کو اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے میں تین بڑی زبردست مشکلات نظر آتی ہیں جنکا کوئی حل انکی سمجھ میں نہیں آتا۔

(۱) سب سے پہلی مشکل جو انکے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ الھدیٰ اور دینِ حق کی طرف دعوت عام کا نتیجہ خیز اور کامیاب ہونا موجودہ حالات میں انکو محال نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری تحریکیں تو محض سیاسی، تمدنی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور جن لوگوں کو اُنکا تجویز کردہ حل اپیل کرتا ہے وہ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کیے بغیر اُن تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام محض دنیوی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد کا ایک نظام اور عبادات اور قوانین شرعیہ کا ایک ضابطہ بھی پیش کرتا ہے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ لوگ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کر دیں۔ پھر یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ اسلام کی دعوتِ عام اُس طرح پھیل سکے گی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں؟

(۲) دوسری مشکل جو اس راستہ میں انہیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف لوگوں میں شدید تعصبات پھیلے ہوئے ہیں۔ انکا خیال یہ ہے کہ دوسری تحریکوں کا پھیلنا آسان ہے کیونکہ اُنکے خلاف تعصبات

موجود نہیں ہیں، مگر اسلام کا پھیلنا مشکل ہے کیونکہ اس کا نام سنتے ہی ماضی اور حال کے تعصبات کا ایک طوفان اُٹھ جاتا ہے۔

(۳) تیسری مشکل اُنکی نگاہ میں یہ ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی ایک قوم یہاں موجود ہے جو "قومیت" کے اعتبار سے تو "مسلمان" ہے، مگر اسکا اخلاقی مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے کہ وہ اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کر سکے۔ اِس قوم کو لے کر اُس راستہ پر چلنا چاہیں تو چل نہیں سکتے۔ اسکو چھوڑ کر چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ سوال بھی دماغ کو پریشان کرتا ہے کہ اگر تمام مقاصد کو نظر انداز کر کے صرف ایک الٰہی حکومت کے مقصد پر توجہات مرکوز کر دی جائیں تو آخر موجودہ سیاسی حالات اور آئندہ کے دستوری تغیرات میں "مسلمانوں" کے قومی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔

۴۔ انحراف کی راہیں

یہی تین مشکلات ہیں جنکو اِس راہ میں حائل دیکھ کر لوگ دائیں اور بائیں رخ پر راستہ کترا کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جزئیات کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے نظریات اور عملی طریقوں میں جو اختلافات ہیں انکو نظر انداز کر کے بڑی اور اصولی تقسیم اگر کی جائے تو یہ سب تین گروہوں میں منقسم ہو جاتے ہیں:

ایک وہ گروہ جو کہتا ہے کہ پہلے ہمیں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ موافقت کر کے اس ملک کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرا لینا چاہیے تاکہ یہاں ایک مشترک جمہوری اسٹیٹ قائم ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم بتدریج اُس اسٹیٹ کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشش کرینگے۔

دوسرا وہ گروہ جس کا خیال یہ ہے کہ پہلے انگریزی اقتدار کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں مستقل ہندو اکثریت کے تسلط کا سدِ باب کرنا چاہیے، اور ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس ملک میں ایک

جمہوری اسٹیٹ کے بجائے دو اسٹیٹ قائم ہوں، ایک وہ اسٹیٹ جس میں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے اور دوسرا وہ اسٹیٹ جس میں ہندو اکثریت کی وجہ سے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جائے مگر زیادہ سے زیادہ جو آئینی تحفظات ممکن ہیں اُنکے ذریعہ سے مسلمانوں کی پوزیشن محفوظ ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد ہم مسلم اکثریت والے اسٹیٹ کو بتدریج اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرینگے اور پھر ہندو اکثریت والے اسٹیٹ میں تغیر و اصلاح کی کوشش کرینگے۔

تیسرا وہ گروہ جو موجودہ حالات میں دعوتِ عام اور ایک انقلابی پارٹی کی تشکیل کو آسان بنانے کے لیے اسلام کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے تاکہ وہ اُن لوگوں کے لیے قابل قبول ہو جائے جو اسلامی عقائد اور عبادات اور نظامِ شریعت کی بندشوں سے گھبراتے ہیں۔ اس گروہ نے اگرچہ ابھی کوئی مستقل جماعتی صورت نہیں اختیار کی ہے، مگر مجھے معلوم ہے کہ اس طرزِ خیال کے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں اور انکی تجویزیں اِس وقت حالتِ جنینی (Embryonic stage) سے گذر رہی ہیں۔

۵۔ منحرف راستوں کی غلطی

اب میں ان میں سے ایک ایک گروہ کے طریقہ پر الگ الگ تنقید کر کے بتاؤنگا کہ ان طریقوں میں غلطی کیا ہے، اِن میں سے ہر ایک نے اسلام کی راہِ راست سے کس طرح انحراف کیا ہے، اور ان پھر کے راستوں سے اصل اسلامی نصب العین تک پہنچنا ابداً غیر ممکن الوقوع کیوں ہے۔

"آزادیِ ہند" کو مقدم رکھنے والے | پہلا گروہ زیادہ تر علماء اور مذہبی خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور بالعموم اِس گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی بہ نسبت زیادہ مذہبی ہیں۔ اسی وجہ سے اِن کے انحراف پر مجھ کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔ اِن حضرات نے مذکورۂ بالا مشکلات سے خوف زدہ ہو کر یہ خیال قائم کر لیا کہ موجودہ حالات میں اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی نہیں کی جا سکتی، اس لیے

انہوں نے اپنی کوششوں کا مقصود یہ ٹھیرایا کہ ہندوستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے۔ مقصود بدل جانے سے لامحالہ راستہ بھی بدل گیا۔ اسلام کی راہِ راست کے تین اجزاء جو میں نے ابتدا میں بیان کیے ہیں، ان کا راستہ ہر جزء میں اس سے مختلف ہے:

(۱) دعوت کے باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلایا جائے۔ مگر یہ ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بلاتے ہیں کہ تم خود مالک الملک بنو۔ یہ غیر الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اسکی جگہ باشندگانِ ملک کی خود اختیاری اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرک ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدارِ اعلیٰ اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ مخالفِ اسلام دعوت ہے۔

انکے نزدیک انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں جمہورِ اہلِ ہند کا اختیار، اور انگریزی شریعت کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی قانون سازی قابلِ ترجیح ہے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں بغاوت، یکساں کفر اور یکساں طغیان و معصیت ہیں۔

پھر یہ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان قومی و وطنی عداوت و تعصب کی آگ بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں، حالانکہ اسلام کی دعوتِ عام کے راستہ میں یہ رکاوٹ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں اپنی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا جھگڑا انگریز سے اس بات پر نہیں ہے کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہو کر دوسرے ملک پر حکومت کیوں کرتا ہے۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کی اطاعت کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ بعینہٖ اسی بات پر اس کا جھگڑا ہندوستانی سے بھی ہے۔ وہ دونوں کو ایک ہی بات کی طرف بلاتا ہے۔ ایک کا حامی بن کر دوسرے سے لڑنا اس کی حیثیت کے منافی ہے کیونکہ اگر وہ ہندوستانی اور انگریز کے وطنی و قومی جھگڑے میں

ایک کا طرف دار اور دوسرے کا مخالف بن جائے[۱] تو انگریز کے دل کا دروازہ اُس کی دعوت کے لیے بند ہو جائیگا۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ ایک طرف اسلام کے داعی بنتے ہیں اور دوسری طرف اِس وطنی و قومی جھگڑے میں فریق بھی بنتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مفاد کو ہندوستانیت کے مفاد پر قربان کرتے ہیں۔

اِن تمام بنیادی غلطیوں کے ساتھ یہ حضرات کبھی کبھی اسلام کی تبلیغ بھی فرمایا کرتے ہیں۔ مگر ایسی تبلیغ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ایک سامع سے دو بالکل مختلف آوازیں سُن کر اور ایک زبان سے دو قطعی متضاد باتیں سماعت کر کے آخر کون متأثر ہو سکتا ہے؟

(۲) تشکیل جماعت کے باب میں یہ حضرات اس سے بھی زیادہ مختلط ہیں۔ اول تو دعوت کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ہی جماعت کی ترکیب اور اجزائے ترکیبی کے متعلق انکا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ دوسرے "مسلمان قوم" کے تخیل نے پریشان خیالی کے لیے ایک اور وجہ بھی پیدا کر دی ہے۔ اِن اسباب سے یہ ہر قسم کے رطب و یابس آدمی اکٹھے کر لیتے ہیں، اور اُن آدمیوں کے اقوال و افعال میں بیک وقت بیسیوں قسم کی متضاد باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک متحد المزاج نظریہ کی حمایت کے لیے آپ اٹھیں تو لا محالہ آپ اپنی پارٹی کے لیے انہی آدمیوں کا انتخاب کرینگے جو یکسوئی کے ساتھ اُس خاص نظریہ کے متبع ہوں بخلاف اِسکے ایک مخلوط اور غیر معیّن مزاج رکھنے والے نظریہ کو لے کر جب آپ اٹھینگے تو آپ کا معیار انتخاب اکثر اُن قیود سے آزاد ہو جائیگا جو متحد المزاج نظریہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے مجھے ایک مجلس

[۱] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرے یا اسکے حقوق تلف کرے تو اسلام مظلوم قوم کی حمایت نہ کریگا۔ بلکہ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر دونوں قوموں میں جو تنازع ہوگی، اسلام اس میں کوئی حصہ نہ لیگا۔ وہ ظالم کو ملامت کریگا، نہ اس لیے کہ وہ فلاں قوم کا آدمی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور اسی طرح وہ مظلوم کی حمایت بھی اس حیثیت سے نہ کریگا کہ وہ فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ مظلوم ہے۔

میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی ذمہ دار جمعیت کی مقامی شاخ کو منظم کرنے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد جو بات قرار پائی وہ یہ تھی کہ رکنیت کے فارم طبع کرا لیے جائیں اور پندرہ دن کے اندر زیادہ سے زیادہ ممبر بھرتی کر کے ارکان کا ایک جلسۂ عام کر لیا جائے جس میں عہدہ داروں کا انتخاب ہو جائے۔ لیجیے، بس جمعیت کی مقامی شاخ منظم ہو گئی۔ اس طرح بھانت بھانت کے آدمی محض رکنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اور بہ رسالانہ فیس ادا کر کے ان جماعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں، پھر اپنی آدمیوں کے ووٹوں سے منتخب ہو کر وہ لوگ برسرِ کار آتے ہیں جنکا کام رہنمائی و سربراہ کاری ہوتا ہے، اور ایسے ہی لوگوں کی متفقہ خواہشات سے پالیسیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کیا کوئی شخص توقع کر سکتا ہے کہ جماعتی تشکیل کے اس طریقے سے کبھی اسلامی نصب العین کی طرف بھی کوئی پیش قدمی کی جا سکتی ہے؟

(۳) اسی طرح تیسرے جزء میں بھی انکا طریقہ اسلام کی راہ راست سے ہٹا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اسلام براہِ راست غیر اسلامی نظام اطاعت پر حملہ کرتا ہے اور اُسکا تقاضہ یہ ہے کہ تمام مساعی کو حاکمیتِ رب العالمین کے قیام و اثبات پر مرکوز کر دیا جائے۔ لیکن اسکے برعکس یہ لوگ اپنی سعی و جہد کا رُخ برطانوی نظام اطاعت کی تخریب اور حاکمیتِ عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہ صریح انحراف ہے صراطِ مستقیم سے۔ اس انحراف پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظام اطاعت اسلامی نصب العین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، اہم تنہا اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے، اسلیے پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دور کر لیں، پھر اصل منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ آسان ہو جائیگا۔ مگر میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جائیگا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک نظام اطاعت یا دین کو ہٹا کر اُسکی جگہ دوسرا نظام اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ نفوسِ انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جائے۔ اگر ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظام اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب صرف

اسی طرح ممکن ہے کہ آپ باشندگانِ ہند کے دلوں میں حاکمیتِ انگریز کے بجائے خود اپنی حاکمیت کے برحق ہونے کا تخیل اور عملاً مالک الملک بن جانے کا عزم پوری شدت کے ساتھ پیدا کر دیں۔ برعکس اس کے اگر آپ ہندوستان میں الٰہی نظامِ اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب بغیر اسکے ممکن نہیں ہے کہ عوام الناس کو خود اپنی حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہونے اور ہر غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے پر آمادہ کریں اور اللہ کے مالک الملک ہونے کا عقیدہ اُنکے دلوں میں اتنی قوت کے ساتھ بٹھائیں کہ وہ اُسکی حاکمیت کے آگے برضا و رغبت سر جھکا دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد الٰہی نظامِ اطاعت کا قیام ہے وہ کس طرح بجائے ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ذریعہ کے طور پر یہ تدبیر اختیار کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دیں کہ اسکے زور سے دینِ انگریز کی مضبوط جمی ہوئی جڑیں اکھڑ جائیں اور دینِ جمہور کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں؟ جہاں عامۂ خلائق کے دلوں میں اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور عزم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو کیا وہاں لوگوں کو خداوندِ عالم کے آگے اپنی حاکمیت سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرنا موجودہ انگریزی حاکمیت کی جڑیں اکھاڑنے سے کچھ کم مشکل ہے؟ کیا امریکہ، جاپان، جرمنی اور انگلستان جیسے اصطلاحاً "آزاد" ممالک میں حکومتِ الٰہی کا قیام اس سے کچھ کم دشوار ہے جتنا ہندوستان جیسے اصطلاحاً "غلام" ملک میں دشوار نظر آتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برطانوی اقتدار کی جگہ ہندوستانی اقتدار کا قیام آخر کس معنی میں حکومتِ الٰہی کے قیام کی طرف ایک گونہ پیش قدمی ہے۔

تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تدبیر عملاً کارگر ہو سکتی ہے تب بھی میں اسکے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہوں ـــــ لازم نہیں کہ ہر تدبیر جو کارگر ہو وہ صحیح بھی ہو ـــــ دراصل یہ ایک سخت ناپاک تدبیر ہے جسے اختیار کرنے کا خیال بھی ایک مسلمان دل میں نہیں لا سکتا۔ جو شخص درحقیقت پوری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک الملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو وہ آخر کس دل سے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ایمان

کے خلاف عوام الناس میں اس عقیدہ کی تبلیغ کرے کہ تم خود مالک الملک ہو؟ جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی صرف حدود اللہ کی پابند ہونی چاہیے اور حکومت وہ ہونی چاہیے جو اللہ کے سامنے جواب دہ ہو وہ کیونکر اپنی کوششوں کا مقصود یہ قرار دے سکتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر حدود جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت جمہور کے سامنے جواب دہ ہو؟ کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے عقیدے کی اشاعت یا حمایت میں کھل سکتی ہے جسکو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے، اور کس طرح وہ اُس چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اس کے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے؟

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ تو محض اس امر کا ثبوت ہے کہ ان لوگوں کا راستہ اسلام کی راہِ راست سے منحرف ہے۔ رہی یہ بات کہ اس پھیر کے راستہ سے یہ لوگ کبھی اسلام کے نصب العین تک نہیں پہنچ سکتے، تو اس دعوے پر میرے پاس یہ دلیل ہے کہ جن مشکلات سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے یہ پھیر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہندوستان کے انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہینگی۔ اوپر میں نے مشکلات کی جو تشریح کی ہے اس پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں سے کوئی مشکل بھی خود مختار ہندوستان کے دور میں دُور ہو جائیگی؟ اگر نہیں تو جو لوگ آج ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی حکمت اور ہمت نہ رکھنے کی وجہ سے راستہ کترا کر نکل رہے ہیں وہ کل بھی اسی وجہ سے اصل مقصد اسلامی کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے جی چرائینگے۔ خوب جان لیجیے کہ اس مقصد کی طرف جب بھی آپ اقدام کرنا چاہینگے، بہر حال آپکو ان مشکلات سے سابقہ پیش آئیگا۔ جو لوگ ان کا مقابلہ کرنے کی تدبیر اور عزم نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات ہی میں نہیں بلکہ کسی حال میں بھی اس طرف اقدام نہیں کر سکتے۔ اور جنکے پاس تدبیر اور عزم دونوں موجود ہیں، اُن کے لیے کسی پھیر کے راستہ پر چلنا تضیع وقت اور حماقت ہے، وہ تو اس پہاڑ کو کاٹ کر براہِ راست ہی اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھائینگے۔

پاکستانی خیال کے لوگ دوسرا گروہ زیادہ تر اُس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے۔ یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی ماخذ سے لیتے ہیں، مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب اِن کے اندر موجود ہے، اور "مسلمان قوم" ہونے کا شعور اِن کے اندر بیدار ہو گیا ہے اسلیے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں "مسلمان قوم" کے لیے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اِنکے اقوال اور اعمال میں اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرز فکر و عمل عجیب طریقہ سے خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس خلط مبحث کا تجزیہ کر کے تفصیل کے ساتھ اِس مخلوطہ کے ایک ایک جزء کی اصل و نوعیت کا نشان دے سکوں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پہلے گروہ کی طرح اس گروہ کا راستہ بھی راہِ راست کے تینوں اجزاء سے منحرف ہے۔

(۱) پہلے دعوت کو لیجیے۔ انکے ذمہ دار لیڈروں کی تقریریں، انکی نمائندہ مجلسوں کی قراردادیں، اِنکے کارکنوں کی باتیں، اِنکے اہلِ قلم کی تحریریں، سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ انکی دعوت اصل میں ایک قوم پرستانہ دعوت ہے، یعنی اِنکی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے بلکہ اِس طرف ہے کہ اِن کی قوم متفق و متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے اُسی طرح اِنہوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنا لیا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ اور "آزادی پسند" حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں۔ لیکن جس چیز نے اُنکی بہ نسبت اِنکی روش کو اسلام کے لیے اور زیادہ مُضر بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو وطن اور وطنی مفاد کے نام پر لڑتے ہیں، مگر یہ اپنی قومی اور دنیوی لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلمان کا نام لیتے ہیں جسکی وجہ سے اسلام خواہ مخواہ ایک فریق جنگ بن کر رہ گیا ہے اور غیر مسلم قومیں اُس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں۔ اِس طرح اِنہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اسلام کی دعوت کے لائق نہیں رکھا ہے، بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں

تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لیے متفضل پائینگے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قوم پرستانہ دعوت کے ساتھ یہ لوگ کبھی کبھی اسلام کی خوبیاں اور اسکے اصولوں کی فضیلت بھی بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر اول تو قوم پرستی کے پس منظر میں یہ چیز ایک اصولی دعوت کے بجائے محض ایک قومی تفاخر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور مزید براں دعوت اسلام کے ساتھ جن دوسری باتوں کی یہ آمیزش کرتے ہیں وہ بالکل اس دعوت کی ضد ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظام حکومت کی تبلیغ اور دوسری طرف اُن "مسلمان" ریاستوں اور حکومتوں کی حمایت جنکا نظام بالکل غیر اسلامی ہے، ایک طرف اسلامی نظام معاشی کی تشریح اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے قارونوں کی تائید و مدافعت، ایک طرف انسانی قانون سازی کا اصولی ابطال اور دوسری طرف خود قانون ساز مجلسوں میں اپنے حصہ کا مطالبہ، ایک طرف حاکمیت رب العالمین کا اقرار و اثبات اور دوسری طرف حاکمیت جمہور کے اصول پر خود اپنی قومی حکومت کے قیام کی فکر، ایک طرف انسانیت کی نسلی، قومی اور وطنی تقسیم کا ابطال اور دوسری طرف ہر وقت قوم قوم کا شور اور خود قومیت ہی کے اصول پر دوسری قوموں سے جدال و کشمکش، ایک طرف بے غرضانہ حق پرستی کا دعویٰ اور دوسری طرف شب و روز اپنے دنیوی مفاد ہی کا نوحہ و ماتم، ایک طرف اسلامی تہذیب و تمدن پر فخر و ناز اور اسکی حفاظت کے لیے پُرشور لام بندی اور دوسری طرف اسی تہذیب و تمدن کے باغیوں اور قاتلوں کی سرداری و پیشوائی، یہ دونوں چیزیں آخر کس طرح ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں؟ منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن۔ ایسی متضاد باتوں سے دنیا نے کب کوئی اثر قبول کیا ہے کہ آج اِن سے اسلام کا جھنڈا زمین میں گڑ جانے کی امید کی جاتی ہے۔

(۲) اب دیکھیے کہ یہ اپنی جماعتی تشکیل کس ڈھنگ پر کرتے ہیں۔ اِنکا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو جو از روئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی جماعت کی رکنیت کا بُلاوا دیتے ہیں اور جو اُس کو قبول کرلے اسے ابتدائی رکن بنا لیتے ہیں۔ پھر انہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمہ دار

کارکن اور عہدہ دار منتخب ہوتے ہیں اور انہی کی کثرت رائے سے تمام معاملات انجام دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صرف قومی تنظیم ہی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اور اس طریقہ سے جو نظام بنے وہ اسکے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک قوم کی خواہشات جیسی کچھ بھی ہوں اُنکے حصول کی کوشش کرے۔ رہی ایک اصولی تحریک، تو اسکو چلانے کے لیے یہ طریق جماعت سازی نہ صرف بیکار بلکہ مُضر ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ اُنکے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہِ عظیم جسکو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اسکے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اسلیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ انکی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستہ پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(۳) اسکے بعد اُس طریقہ کا جائزہ لیجیے جس سے یہ بزعم خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں۔ انکی تجویز یہ ہے کہ پہلے اُسی جمہوری دستور کے مطابق، جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائیگی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظام حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے[1]۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی

[1] اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اسکے انکی طرف سے بصراحت اور تکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انکے پیش نظر محض ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ ہو)

"آزادی ہند" کو مقدم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اُنکی تجویز پر مجھے جو اعتراضات ہیں بعینہٖ وہی اعتراضات اِنکی تجویز پر بھی ہیں۔ اِنکا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مدد گار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اِس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی، بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ٹرکی اور مصر میں موجود ہے اور وہاں اُسکو وہ "پاکستان" حاصل ہے جسکا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومت الٰہی کے قیام میں مدد گار ہے یا ہوتی نظر آتی ہے؟ مدد گار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں کیا آپ وہاں حکومت الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلاوطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکینگے۔ اور جب صورت حال یہ ہے تو آپکو غور کرنا چاہیے کہ آخر اسلامی انقلاب کے راستہ میں مسلمان قوموں کی اِن آزاد حکومتوں کے سدِّ راہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ اس معاملہ کی جتنی تحقیق آپ کرینگے جواب اِسکے سوا کچھ نہ پائینگے کہ دراصل اصطلاحاً و نسلاً مسلمان ہونا اور چیز ہے اور نظریۂ حیات و مقصدِ زندگی کا اسلامی ہونا بالکل ایک دوسری چیز۔ جو لوگ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷ ۔ غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظ دیگر انکو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، باقی رہا نظام حکومت تو وہ "پاکستان" میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ہندوستان میں ہوگا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے، تو ذمہ دار لیڈروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا، البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صفِ آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جنکی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت نہیں ہے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائیگی تب ہم نظامِ حکومت کو بدلنے کی کوشش کرینگے۔

روح و اخلاق کے اعتبار مسلم نہ ہوں، بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں اُنکو اگر بیرونی اثر و اقتدار سے کامل آزادی نصیب بھی ہو جائے، اور اگر اُنکے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظام حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو، تب بھی حکومتِ الٰہی وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے دنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان میں حق اور صداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، بلکہ اسکے برعکس جب کبھی انکی اغراض دنیوی سے حق و صداقت کا تصادم ہوتا ہے تو وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اُس طرف جاتے ہیں جدہر اُنکی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ عام انتخاب میں اُنکے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہونگے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا، قدرتی بات ہے، کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائیٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آئینگے جو اس سوسائیٹی کی خواہشات نفس سے سندِ قبولیت حاصل کرسکینگے۔ پس جو لوگ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائیگی، اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اسکے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کرکے، اُنکے نقطۂ نظر کو تبدیل کرکے، اور انکے نفسیات میں انقلاب برپا کرکے ایک جمہوری نظام کو الٰہی حکومت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائیٹی کے مادّی مفاد سے اپیل کرکے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہونگے ان سے آپ امید کرسکتے ہیں کہ وہ حکومت کا روپیہ، اسکے وسائل، اُسکے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کرینگے جسکا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومت

الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اِس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اِس انقلاب میں مدد دینے کے بجائے الٹی اسکی مزاحمت کرینگے کیونکہ وہ خوب جانتے ہونگے کہ اگر عوام کے نفسیات میں تغیر واقع ہو گیا تو اس بدلی ہوئی سوسائیٹی میں انکا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں، اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور اُنکے نام اُنکے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہونگے۔ جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اُسکے مقصد کی راہ میں حائل ہو گی؟

تحریف دین کے مجوزین اب تیسرے گروہ کو لیجیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی تجویزیں سوچ رہے ہیں۔ کوئی فکر اسلامی کے ساتھ غیر اسلامی افکار کا جوڑ لگا کر ایک نئی "خوشگوار" معجون بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس خیال میں ہے کہ "ہندوستانی اسلام" کا ایک نیا ایڈیشن نکالے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اسکے سیاسی و معاشی اصولوں کو لے لیا جائے اور انکی بنیاد پر ایک ایسی جماعت بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے عقائد، عبادات اور احکام شرعیہ کی پابندی لازم نہ ہو۔ یہ سب لوگ اپنے نزدیک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان طریقوں سے رفتہ رفتہ وہ تنفر دور ہو جائیگا جو اسلام کے خلاف طبیعتوں میں پیدا ہو گیا ہے، اور جب وہ بعضِ اسلام سے کسی حد تک مانوس ہو جائینگے تو پورے اسلام سے مانوس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ سب خیالاتِ خام ہیں۔ نہ اصولی حیثیت سے اِنکو صحیح کہا جا سکتا ہے اور نہ عملی حیثیت سے ہی اِن کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرے نزدیک ایسی تمام تجویزیں ضعفِ دل اور ضعفِ دماغ کا نتیجہ ہیں۔

اصولی حیثیت سے درحقیقت ہم اسلام میں کسی ردوبدل، کسی کمی و بیشی، اور کسی ترمیم و تشکیلِ جدید کے

مجاز ہی نہیں ہیں۔ ہم اسلام کے مالک نہیں ہیں، اُسکے صانع نہیں ہیں، اُسکے شارع نہیں ہیں۔ اسلام ہمارا مال نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جیسی طلب ہو اسکے مطابق اپنے اس مال کو بنا کر بازار میں لائیں۔ ہماری حیثیت صرف پیرو اور مبلّغ کی ہے۔ مالک نے عقائد، عبادات اور احکام کا یہ پورا مجموعہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم خود اسکی پیروی کریں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ اس مجموعہ میں کوئی ترمیم کرنے کا، یا اسکی اصلی صورت کو بدل کر اسکی کوئی اور صورت بنانے کا ہم کو ہرگز کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جسکو لینا ہے اسے پورے مجموعہ کو لینا پڑیگا اور اسی صورت میں لینا ہوگا جس میں مالک نے اُسے دیا ہے۔ اور جو اسکو اس ہیئت مجموعی اور اس مقرر صورت کے ساتھ نہ لینا چاہے اسکی خوشامد کرنے اور اسے کم و بیش پر راضی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام تو ایک حکم ہے خالق کی طرف سے مخلوق کی طرف۔ خالق کا کام مخلوق کی خوشامد کرنا اور اسکو راضی کرنا نہیں ہے۔ مخلوق کو یا تو اس کا حکم، جیسا کہ وہ ہے، جوں کا توں ماننا پڑیگا۔ ورنہ وہ خود اپنا ہی کچھ بگاڑ لیگی، خالق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے اسکے جو رسول دنیا میں آئے انہوں نے پورے حکم کو لوگوں کے سامنے بعینہٖ پیش کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ چاہو اسکو لو اور چاہو رد کر دو، بہرحال تمہاری خواہشات کے مطابق اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائیگا۔ ٹھیک یہی پوزیشن رسولوں کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی ہے۔

پھر یہ کتنی غیر معقول تجویز ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اسکے معاشی و سیاسی اصولوں کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجاآوری اور احکام شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ کیا کوئی صاحبِ نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحہ عمل کو اُسکے بنیادی فلسفے، اُسکے نظام اخلاق اور اسکے تعمیر سیرت کرنے والے ارکان سے الگ کر کے چلایا جا سکتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا نظامِ سیاسی آخر ہے کس چیز کا

نام ہو؟ اور اگر قرآن کو ماخذِ قانون اور محمد رسول اللہ کو رعیت (انسان) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان نزولِ احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے تو کیا اسلامی طرز کے اسٹیٹ کی تعمیر ہوا پر کی جائیگی؟ نیز وہ کونسا نظامِ تمدن وسیاست ہے، جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا لیے بغیر قائم ہو سکتا ہو؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اُس نظامِ تمدن وسیاست کے لیے کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو آپ مادّہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ مزید برآں وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظامِ تمدن وسیاست کے لیے درکار ہے، نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں سکتا ہے؟ پس یہ غایت درجہ کا افلاس فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حُسن دیکھ کر کہنے لگے کہ آؤ جڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

عملی حیثیت سے بھی اس قسم کی تمام تجویزیں سراسر غلط ہیں۔ ان سے اصل مقصد تک پہنچنے کے بجائے خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہم خود ہی راستہ میں گم نہ ہو جائیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جس نام نہاد اسلام کی تبلیغ کی جائیگی، ایک روز وہی اصلی معیار بن جائیگا، اور جو لوگ اس پر ایمان لا کر جماعت میں شریک ہونگے، نہ صرف وہ خود اصل اسلام کی طرف رجوع کرنے سے انکار کرینگے بلکہ وہ مصلحت پرست مسلمان بھی، جنہوں نے اُن سے کم و بیش پر سودا کیا تھا، انکے ساتھ انکی گمراہی میں شریک ہو جائینگے۔ مدارات (Compromise) پر جو کام مبنی ہوتے ہیں ان میں ہمیشہ یہی خرابی ہوتی ہے۔

۶۔ مشکلات کا جائزہ

اب ہمیں ایک نظر ان مشکلات پر ڈالنی چاہیے جن سے خوف زدہ ہو کر یہ انحراف کی راہیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ کیا حقیقت میں وہ ایسی ہی مشکلات ہیں کہ ان کو حل نہیں کیا جا سکتا؟

تکرارِ بیان سے بچنے کے لیے میں ناظرین کو پھر ایک مرتبہ تکلیف دونگا کہ پیچھے پلٹ کر مضمون کے اُس حصہ پر نگاہ ڈال لیں جہاں میں نے ان مشکلات کی تشریح کی ہے۔

پہلی مشکل | پہلی مشکل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام صرف تمدنی، سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد، عبادات اور ضوابط شرعیہ کا ایک مجموعہ بھی اُسکے ساتھ دیتا ہے، اور اسکو قبول کرنے کے معنی انسان کی پوری زندگی کے تبدیل ہوجانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اسلام کو اُس طرح پھیلنے نہیں دیتی جسطرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔ لیکن یہ مشکل بظاہر جتنی زبردست نظر آتی ہے، بباطن اتنی ہی کمزور اور بے حقیقت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کا مجرد حل پیش کرتا ہو اور اسکے ساتھ اپنے کچھ اعتقادات اور اپنا ایک مخصوص فلسفہ نہ رکھتا ہو۔ چند امور مابعد الطبیعہ Metaphysical problems ایسے ہیں جنکے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک رائے قائم کرنا بہرحال ہر اس مسلک کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک لائحۂ زندگی بنانے کا عزم کرے۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کے لیے ہے مگر انسان خود کس کے لیے ہے؟ یہ دراصل زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جنکا ایک قابلِ عمل حل Workable solution پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جاسکتا، اور کسی نظام کے بھی محض عملی پہلوؤں کو لے کر آدمی کام نہیں کرسکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کے بنیادی فلسفہ، یا بالفاظ دیگر اسکے اعتقادات کو بھی قبول نہ کرلے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس بہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک فی الواقع ایک مذہب ہی ہے،

اور جو بھی اسکی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر یہ کہتا اور سمجھتا رہے کہ بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک سیدھی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کرونگا۔ یہ کمیونزم آپکے سامنے ہے۔ اسی کو مثال میں لے لیجیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم یہ کہ اس کا وجود و عدم وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اُس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے۔ اگر اسلام یہ پہلو لیتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ وحی کے ذریعہ سے آتی ہے تو کمیونزم یہ پہلو لیتا ہے کہ کوئی ہدایت درکار نہیں ہے اور وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سلوک کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسان کو اپنی موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہے تو کمیونزم اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اور بعد میں نہ زندگی ہے نہ حساب کتاب۔ دیکھیے، یہ دونوں یکساں مابعد الطبیعی نظریے ہیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اب اگر کسی سائنٹفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور قیاسی شہادت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقطۂ نظر کو قبول کر سکتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ آخر انہی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطۂ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمد رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا، آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اسکو اپنا رہنما تسلیم کر سکتا ہے، تو آخر کونسی چیز مانع ہے کہ

ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمد رسول اللہ کی زندگی، انکی تعلیمات اور ان کے کارنامے کو دیکھ کر ان کو اپنا ہادی و رہبر تسلیم کرلے ؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط Party-discipline کا بھی ہے۔ اگر اسلام اُن لوگوں کو جو اسکی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی اُن لوگوں کو جو اس میں شامل ہوں کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی ؟ پھر جب بہت سے انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہوّا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہونگے انکو یہ ہوّا اپنی صورت دکھا کر بھگا دیگا ؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اسکی توحید کا اعتقاد، یا آخرت کا اعتقاد، یا پیغمبر کی ناقابل منازعت پیشوائی Indisputable leadership اور قرآن کے آخری منبع قانون ہونے کا اعتقاد شرط لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسکے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اسکی طرف کھنچ کر آنے میں سدِ راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسلکوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان ان مسلکوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پاتے ہیں وہ اُن کے عقائد اور ضوابط، دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں اگر اسلام انکے سامنے تمام مسائل زندگی کا بہترین حل پیش کرے، اور انکی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی شرط صرف اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے غیر معمولی رکاوٹ ثابت ہو۔ رکاوٹ اگر ہے تو فی الواقع صرف اسی حد تک ہے کہ لوگوں کے لیے بالعموم اپنے پرانے مسلک کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو تحریک بھی دنیا میں پھیلتی ہے اسے بہرحال اس رکاوٹ سے سابقہ پیش آتا ہی ہے اور جو لوگ کسی تحریک پر ایمان لاتے ہیں وہ

بہرحال اس رکاوٹ کو عبور کر کے ہی قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کو سامنے کھڑا دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش صرف وہی شخص کریگا جو یا تو اپنے ایمان ہی میں صادق نہیں ہے یا پست ہمت اور ناکارداں ہے۔ البتہ اسلام کے حق میں اس رکاوٹ کو جس چیز نے شدید تر رکاوٹ بنا دیا ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔

اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد اور عبادات کا کوئی ربط اجتماعی نظام اور کاروبارِ حیات دنیا سے قائم نہیں رہا ہے۔ اسلام کے عقائد محض ایک دھرم Religion کے مزعومات (Dogmas) بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع اور نظام تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اسکی عبادات محض پوجا اور تپسیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں حالانکہ وہ اُن ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحۂ عمل کو چلانے کے لیے ان عقائد اور عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔

دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جسکی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہارِ قدر شناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اُس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کرینگے۔

تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعیّن، اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدارِ دین داری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا

کریگی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا سبب بن رہی ہے۔ اِس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور اُنکی باتیں سن کر آدمی اِس سوچ میں پڑجاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا اِنہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں؟

اسلام کے راستہ میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر یہ اسلام کا قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے اُس نظامِ تعلیم کو بدلیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زندہ تحریک تحکّمی عقائد کے بل پر تو نہیں اُٹھ سکتی۔ ہمیں اسکے عقائد کو معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہوگا، پھر عقائد کے ساتھ عبادات کا اور عبادات کے ساتھ قوانینِ زندگی کا منطقی ربط واضح کرنا پڑیگا، پھر ان قوانین کو زندگی کے تمام عملی مسائل پر منطبق کرکے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ جتنی انسانی ضروریات ہیں اُن سب کا حل اِن قوانین میں موجود ہے، تب کہیں لوگ اس نظام کو ایک معقول نظام کی حیثیت سے سمجھ سکینگے، اور جب وہ اسے سمجھینگے تو قبول بھی کرنے پر آمادہ ہونگے۔ یہ تعمیری کام چونکہ سخت محنت طلب ہے، اسلیے اِس محنت سے جی چرا کر لوگ بنے بنائے آسان راستوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے راستہ بنانے کی زحمت بہرحال ہمیں اٹھانی ہی پڑیگی۔ جس نے بھی کوئی مقصدِ عظیم پیشِ نظر رکھا ہے اسے یہ زحمت اٹھانی پڑی ہے، اور اگر واقعی ہم اپنے مقصد میں صادق ہیں تو ہمیں اِس کام کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

دوسری مشکل اب دوسری مشکل کو لیجیے۔ جن تعصبات کو اسلام کی راہ میں حائل بتایا جاتا ہے ان کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

ایک قسم کا تعصب تو وہ ہے جو طبعاً ہر شخص کے اندر ہر اُس چیز کے خلاف ہوتا ہے جو اُس کے لیے نئی ہو، جس پر اُس نے اپنے باپ دادا کو نہ پایا ہو، اور جس سے وہ مانوس نہ ہو۔ یہ تعصب صرف آج ہی اسلام کی راہ میں حائل نہیں ہے، پہلے بھی حائل تھا۔ اور جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، صرف اسلام ہی کی راہ

میں حائل نہیں ہے، ہر تحریک کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسی رکاوٹ نہیں ہے جسکو دور نہ کیا جا سکتا ہو۔ پہلے بھی اس رکاوٹ کے باوجود اسلام پھیلا ہے اور اب بھی پھیل سکتا ہے۔

دوسری قسم کا تعصب وہ ہے جو دراصل اسلام کے خلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کے واسطے سے اسلام کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں میں جو غیر اسلامی طریقے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اختیار کیے، اور اب بھی اپنے انفرادی کردار اور اجتماعی روّیے میں جس غیر اسلامی سیرت کا وہ اظہار کر رہے ہیں، یہ سارے تعصبات فی الحقیقت اسی کے بھڑکائے ہوئے ہیں۔ اس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اسلامی حکومت، خالص اسلامی اخلاق اور حقیقی اسلامی تمدن سے لذت آشنا ہونے کا کبھی موقع ملا ہی نہیں۔ گذشتہ زمانہ میں مسلمان بادشاہوں نے، مسلمان امرا نے، مسلمان حکام اور اہل کاروں اور سپاہیوں نے، مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے اور مسلمان عوام نے اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اسکے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش انکے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدتہائے دراز تک برپا ہوتی رہی اُس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے۔

اِس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اِس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی طریقِ کار سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اِس قسم کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اُس تحریک کے عاشق ہو جائیں جسکی نمائندگی اِس شان سے کی جا رہی ہو۔ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اُس برتری کے منبع کی جستجو کریں؟ اس کے برتاؤ میں، اسکے اخلاق میں، اسکے معاملات میں کہاں کوئی خفیف سی چمک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کا پیرو ہے؟ کیا ایک مسلمان زمیندار یا "شریف" اصطلاحی "کمینوں" کے مقابلہ میں اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم "شریف" یا رئیس سے کچھ کم نخوت برتتا ہے؟

کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا عہدہ دار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم ہم سر سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذلیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جنکی پیروی انکے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور انہی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے پیچھے لڑنے مرنا، جسکی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے ان نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی فوقیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور جب وہ انہیں بھی انہی مقاصد کے لیے لڑتے جھگڑتے، اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جنکے لیے وہ خود لڑتا، جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کونسی چیز اسکو اُس مسلک کی طرف مائل کر سکتی ہے جسکی نمائندگی یہ لوگ کر رہے ہیں۔ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات، اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اسکے دل کے دروازوں پر قفل چڑھانے کے لیے کافی نہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر، قومی دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر چلتے رہے ہیں، اور آج جس پالیسی پر مُصر ہیں، بلکہ جسے اپنی حیات اجتماعی کا ضامن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصول اسلام اور مقاصد اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر، کسی ریزولیوشن میں آپ ایک فقرہ ایسا نہیں پا سکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر کلّی اصول لیکر اُٹھے ہیں اور انکی لڑائی محض اصول حق کی خاطر ہے۔ اسکے برعکس آپ یہ دیکھینگے کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی

قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر اتر آئے ہیں، ایک ہی مرتبہ کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (Tactics)، زبان، اصطلاحات اور اصولِ نزاع اختیار کر رہے ہیں، اور سارا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے ہے جنکے لیے انکے حریفوں کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے آپ دنیوی اغراض کے لیے مساوی مرتبہ پر لڑ رہے ہوں، جن سے آپ رقابت اور حریفی کا پرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں، جنکے ساتھ آپ کی سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہونگے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیموکریسی یا کسی اور مسلک کی دعوت کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

یہ تعصبات اسلام کے راستہ میں دوسری عظیم الشان رکاوٹ ہیں، مگر ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم ان تعصبات کی پیدائش کے سبب کو باقی رکھیں اور پھر انکی موجودگی کو بہانہ بنا کر اپنے مقصد کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے منہ موڑیں، بلکہ انکا اصلی علاج یہ ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل کو بدلیں اور اس طرح تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے سیدھا راستہ تیار کریں۔ جو لوگ محض سرسری نگاہ میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کے خلاف ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اس حالت میں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں پھیل سکتا، وہ دراصل واقعات کو غلط رنگ میں دیکھتے اور غلط نتائج نکالتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ثابت کیا ہے، یہ تعصبات اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہیں (جس سے ان قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے) بلکہ اسلام کے ان غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصتہً للہ کام کرنے کے بجائے اپنی دنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔ لہٰذا ان تعصبات کے تدارک کی صحیح صورت یہ ہے کہ

اب اپنی سیرت، اپنے اعمال اور اپنی اجتماعی جدوجہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اُسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنائیے جسکی وجہ سے تعصبات پیدا ہوئے ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دنیوی مفاد کے لیے جو کشمکش آپکے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور انکے قوم پرستانہ طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں، کیا اس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی دور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر یہ نہ کہیے کہ اس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جنکی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرمائیے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہینگے اور اگر اسلام آپ ہی کا ورثۂ آبائی بنا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی طرح محض آپکا قومی مذہب بن کر رہیگا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکے گا۔

یہ انسانی فطرت کا اقتضا رہے کہ خود غرضی کے جواب میں خود غرضی اور قوم پرستی کے جواب میں قوم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بخلاف اسکے بے غرضانہ حق پرستی کے مقابلہ میں تمام تعصبات اور تمام مخالفانہ جذبات آخرکار ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ایک سچے بے لوث حق پرست کے آگے انسان عقیدت و محبت کے سوا کوئی اور چیز پیش کرنے پر قادر ہی نہیں رہتا۔ اگر مسلمان اپنی وہی حیثیت قائم رکھتے جو دراصل انکی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان میں اُن کے خلاف وہ تعصبات پائے جاتے جنکی آج شکایت کی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے خود اپنی وہ حیثیت کھو دی۔ دنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے لڑنے جھگڑنے لگے، اور اصولِ حق کے بجائے اپنی اغراضِ ذاتی و قومی کو انہوں نے اپنی جدوجہد کا محور بنا لیا۔ اس کے جواب میں اگر دوسروں کے اندر تعصب نہ پیدا ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔ جن اصولوں کا آپ نام لیتے ہیں، اُنکی خود پیروی نہیں کرتے بلکہ رات دن اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں انکے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔ جس مقصدِ عالی

کا آپ اظہار کرتے ہیں، آپکی عملی جدوجہد اُس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ آپکے افراد انفرادی طور پر اور آپکی پوری جماعت بحیثیت مجموعی اُسکو پسِ پشت ڈال کر دوسرے مقاصد کے پیچھے چلی جارہی ہے۔ اس صورت میں اگر اپنے خیالی نصب العین اور اپنے محض زبانی اصولوں کے لیے آپکا اپیل دوسروں پر اثر کر نہ ہو، اگر وہ اس اپیل پر آپ کو جھوٹا سمجھیں اور آپکی تبلیغ کو محض ایک خود غرضانہ چال سمجھ کر حقارت سے رد کر دیں، تو آخر اس میں حیرت کی بات ہی کونسی ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم مسٹر جناح کے ۱۴ یا ۱۴۲ نکات پر تو ایمان نہیں لا سکتا۔ نہ مسلم لیگ یا مجلس احرار یا جمعیت العلماء کے ریزولیوشنوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان لائے۔ ایمان اگر کوئی لا سکتا ہے تو لا الٰہ الا اللہ پر لا سکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت اسی کلمہ کے لیے جینے اور اسی پر مرنے والی اسکے سامنے موجود ہو۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کونسی جماعت آپکے اندر ایسی موجود ہے جس نے خالص اطاعتِ حق کو اپنا مسلک اور خالص دینِ حق کے قیام کو اپنی کوششوں کا مرکز و محور بنا لیا ہو؟ لوگ اسلام کی دعوت اور اسکے اصولِ حق کو کتابوں میں دیکھتے ہیں اور انکے معترف ہو جاتے ہیں۔ مگر اس اسلام پر عمل کرنے والی اور اسکے نصب العین کے لیے کام کرنے والی سوسائیٹی انکو کہیں نہیں ملتی پھر وہ جائیں تو آخر کہاں جائیں؟ کیا اُس سوسائیٹی میں شامل ہوں جو رات دن دنیا ہی کے پیچھے مری جاتی ہے اور انہی راستوں پر چلی جارہی ہے جن پر غیر مسلم چلتے ہیں؟ آپکی ایک جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ارضِ ہند پر انگریز کے بجائے ہندوستانی کا اقتدار قائم ہو۔ بعینہٖ یہی چیز ایک شخص کو غیر مسلم جماعتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ پھر وہ آپکے پاس کیوں آئے؟ آپکی دوسری جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ہندو کے مقابلے میں نسلی مسلمانوں کے دنیوی مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ یہ چیز اُسکو خود اپنی قوم پرستی کی مدِ مقابل نظر آتی ہے۔ پھر وہ اپنی قوم پرستی کو چھوڑ کر آپکی قوم پرستی پر کیوں ایمان لائے؟ انسان کو غیر اللہ کے تسلط سے آزاد کرانے والی جماعت آپ میں ہے کہاں کہ کوئی اس کے اصول و مقاصد

پر ایمان لائے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھے!

تیسری مشکل سب سے بڑی گتھی جو ہمارے سوچنے والے دماغوں کے لیے ناقابلِ حل بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کروڑوں کی تعداد میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو نہ پوری مسلمان ہے نہ پوری غیر مسلم۔ اس قوم کے اس حال میں یہاں موجود ہونے سے متعدد پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جنکا کوئی حل لوگوں کو نہیں ملتا اور اسی وجہ سے رہنما اور کارکن سب پراگندہ عمل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں اُن چند بڑی بڑی الجھنوں کی طرف اشارہ کرونگا جو اس صورتِ حال نے پیدا کر دی ہیں:-

بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پائی جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقت ور قوم بنانا اور برسرِ عروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیاء ہے۔ یہ غلط فہمی انکو "مسلم قوم پرستی" کی حد تک کھینچ لے گئی ہے۔ جس طرح موسنجے اور ساورکر کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے، جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح اِن "مسلم قوم پرستوں" کے لیے اصل سوال اُس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اور جسکے ساتھ انکی قسمتیں وابستہ ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت اِسکو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم (قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم کیسی ہی ہو)، اُنکی معاشی خوشحالی (خواہ وہ کسی قسم کے ذرائع سے حاصل ہو) اور اُنکی سیاسی و عسکری تنظیم (مجرّد قومی تنظیم) پر اپنا زور صرف کیا جائے، اور اُن کو ایک زبردست قوم بنا دیا جائے۔ پھر جب یہ انکا مقصد قرار پایا تو انہوں نے معاملات کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کونسی تدابیر اس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ اور جو تدبیریں بھی ان کو دنیا میں قومی عروج کے لیے مفید و کارگر نظر آئیں انکو بے تکلف انہوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا خواہ وہ اسلام سے انکو کتنی ہی دور لے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سر سید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے

اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے۔

کچھ دوسرے لوگ اسلام اور مسلمان کو اس حیثیت سے تو خلط ملط نہیں کرتے، لیکن ایک دوسری حیثیت سے وہ اسلام کے مستقبل کو موجودہ نسلی مسلمانوں کے دامن سے باندھ دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تو اسلام ہی کا احیا ہیں، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کا احیا موقوف ہے اُن سب مسلمانوں کے مکمل مسلمان بن جانے پر جو اس وقت قومی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ سارے کے سارے مسلمان ذہنی اخلاقی اور عملی حیثیت سے تبدیل نہ ہو جائیں، قدم آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اور یہ چیز چونکہ سخت دشوار بلکہ محال نظر آتی ہے، اس لیے یہ لوگ اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کے فضولیوں کاموں میں مختلف ضمنی مقاصد کے پیچھے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جنکے سامنے اسلامی نصب العین قریب قریب بالکل واضح ہو چکا ہے اور وہ اسکی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں مگر یہ سوال انکو بار بار پریشان کرتا ہے کہ اگر ہمارے کارفرما دماغ اور کارکن ہاتھ سب کے سب اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے میں لگ جائیں تو آخر موجودہ کافرانہ نظام تمدن و سیاست اور اس کے آئندہ تغیرات میں ہماری قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔ اس سوال کی اہمیت انکی نگاہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے عزم سفر کو ملتوی کر کے کہتے ہیں کہ پہلے اس سوال کو حل کیا جائے اور اصل مقصد کی طرف قدم اُس وقت بڑھایا جائے جب اپنی قوم کا کوئی مسئلہ ہمارے لیے حل طلب باقی نہ رہے۔

لیکن یہ تمام الجھنیں غیر اسلامی طرزِ فکر اور غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اگر خالص مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی الجھن بھی ہمارے لیے الجھن نہیں رہتی۔ ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیار کا نہیں بلکہ مسلکِ اسلام کے احیار کا ہے۔ قوم کے احیار کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کافور کی طرح اڑ جاتے ہیں جو قومیت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو

پریشان کیا کرتے ہیں۔ جب ہم مسلکِ اسلام کے پیرو ہیں اور اسکو فروغ دینا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں کسی ایسے مفاد سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہو سکتی جو کسی غیر اسلامی نظام سے وابستہ ہو یا اصول اسلام سے متصادم ہو۔ ہم اپنے دماغ کو اُس کے لیے سوچنے کی کچھ بھی زحمت نہ دینگے۔ قومی احیاء کی اُن تمام تدبیروں سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہوگا جو غیر اسلامی اصول پر مبنی ہوں۔ ایک قوم اور دوسری قوم کی باہمی کشمکش، اور ایک قوم پر دوسری قوم کے تفوق کی کوششوں سے بھی ہم پوری تبرّی کرینگے ہم کو جو کچھ بھی دلچسپی ہوگی اسلامی نظام فکر و عمل سے، اسکی تبلیغ و اشاعت سے، اور اسکو حکمراں بنانے کی سعی و جہد سے ہوگی۔ مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف اسی حد تک ہوگا جس حد تک ان کا تعلق اسلام سے ہے جو اپنی خواہش نفس اور ہر غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی میں آجائے وہ ہمارا بھائی اور ہمارا رفیق ہے، خواہ وہ نسلی مسلمانوں میں سے آئے یا غیر مسلموں میں سے۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی اسی مسلک کی طرف دعوت دینگے اور پیدائشی غیر مسلموں کو بھی۔ ہمارے نزدیک اسلام کا دامن نسلی مسلمانوں کے دامن سے بندھا ہوا نہ ہوگا کہ یہ اٹھیں تو وہ بھی اٹھے اور یہ نہ اٹھیں تو وہ بھی نہ اٹھے۔ اسلام اِن کے باپ دادا کی جائداد نہیں ہے۔ یہ اُسکے لیے جینے اور اُسی کے لیے مرنے پر تیار رہوں تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ورنہ جس جہنم میں اِن کا جی چاہے جاکر گر جائیں۔ ہم اللہ کا کلمہ دوسرے انسانوں کے پاس لے جائینگے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں بعینہٖ یہی طرزِ عمل انبیاء و رسل کا تھا اور اسی کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ قرآن میں جن کو اہلِ کتاب کہا گیا ہے وہ آخر "نسلی مسلمان" ہی تو تھے۔ خدا اور ملائکہ اور نبی اور کتاب اور آخرت، سب کو مانتے تھے، اور عبادات و احکام کی رسمی پیروی بھی کرتے تھے۔ البتہ اسلام کی اصل روح، یعنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دینا اور دین میں شرک نہ کرنا، یہ چیز اُن میں سے نکل گئی تھی۔ اب دیکھیے، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس "نسلی مسلمان قوم" کے

احیار پر اپنی کوششوں کو مرکوز فرمایا تھا؟ نہیں۔ کیا آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک یہ سارے کے سارے "دنسلی مسلمان" اصلی مسلمان نہ بن جائینگے قدم آگے نہ بڑھایا جائیگا؟ یہ بھی نہیں۔ کیا آپ نے اِن "نسلی مسلمانوں" کے دینوی مسائل کو حل کرنے تک اقامتِ دین کی کوششوں کو ملتوی رکھا تھا؟ یہ بھی نہیں۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ نے تمام معاملات اور تمام مسائل سے قطع نظر کر کے "دنسلی مسلمانوں" اور غیر مسلموں، سب کو خالص اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی، جس نے اسکو قبول کیا اور غیر اللہ کی بندگی و اطاعت ترک کر دی اسے اپنے جتھے میں شامل کر لیا اور پھر ان لوگوں کو لے کر الٰہی نظام اطاعت یعنی دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے براہِ راست جدوجہد شروع کر دی یہاں تک کہ اسکو قائم کر کے چھوڑا۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جسکی پیروی کو میں حق سمجھتا ہوں، اسی کی پیروی خود کرنا چاہتا ہوں، اور اسی کا مشورہ ان سب لوگوں کو دیتا ہوں جن کا نصب العین اسلامی ہے۔

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

اس مقالہ میں مجھے اُس عمل Process کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آجکل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے مختلف حلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی (Loose-thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جسکا نام "اسلامی حکومت" ہو، مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے، اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریق پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظام حکومت کا طبعی ارتقاء

جو لوگ اجتماعیات میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بنکر تیار ہو اور پھر اُدھر سے لاکر اسکو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اسکی پیدائش تو ایک سوسائیٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، قدرتی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اسکے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Prerequisites)، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جنکے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے، جس

طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائیٹی میں بہم ہو گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اسکی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور انکی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور انکو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشو و نما پاکر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، انکے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشو و نما کے لیئے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گذر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہیں اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر میں دراصل یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اسکے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرز عمل اختیار کرنا بہرحال ناگزیر ہے۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں، اسی طرح کا جماعتی اخلاق بنے، اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں، اسی ڈھنگ کی لیڈرشپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جسکا اقتضاء اُس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد سے انکے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ انکی طیار کی ہوئی سوسائیٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے

تب ایک طبیعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظامِ حکومت ابھر آتا ہے جسکے لیے ان طاقتور اسباب نے جدوجہد کی ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جنکے لیے اسکی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کرینگے تو آپکو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈرشپ، انفرادی سیرت، اجتماعی اخلاق، اور حکمتِ عملی، ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظامِ حکومت پیدا کرنے کے لیے موزوں و مناسب ہو، اور امید یہ کی جائے کہ انکے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور خام کاری کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جسکو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اسکی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرد ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں ہم اسکو Ideological state کہونگا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں، یا طبقوں کی حکومت سے واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصول کی حکومت، اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرے وہ بلا لحاظ قومیت اسٹیٹ کو چلانے میں حصہ دار ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ عیسائیت نے اس تخیل کا ایک بہت ہی دھندلا سا نقش بنایا، مگر اسکو وہ مکمل نظام فکر نہ مل سکا جسکی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔ انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہوگئی۔ اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا، حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اسکی بنیاد پر تعمیر کرنیکی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اسکی رگ و پے میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام

دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کر کے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کر کے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گرد و پیش کی تمام دنیا اسکے خلاف چل رہی ہے اسلیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اسکو اور اسکے جملہ تضمنات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں مگر جنکے اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علوم عمران Social sciences سے بنے ہیں، انکے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ بیرون ہند کے وہ ممالک جنکی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمام کار آئی تو انکو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت National state کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلام کے علم و شعور اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی شکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بیچارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر پھر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز فکر Nationalistic ideology ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ انکے نزدیک پیش نظر مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ "مسلمان" کے نام سے جو ایک "قوم" بن گئی ہے اسکے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اسکو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں، اسکے سوا کوئی طریق کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزاء سے یہ قوم مرکب ہے، انکو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے، انکے اندر مرکزی اقتدار ہو، انکے نیشنل گارڈس منظم ہوں، انکی ایک قومی ملیشیا تیار ہو، وہ جہاں اکثریت

میں ہوں وہاں اقتدار اکثریت (Majority-rule) کے مسلّم جمہوری اصول پر انکے قومی اسٹیٹ بنجائیں اور جہاں انکی تعداد کم ہو وہاں اُنکے "حقوق" کا تحفظ ہوجائے، انکی انفرادیت اُسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں ہر قومی اقلیت (National minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی اور انتخابی ادارات میں انکا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چُنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وغیرذالک من القومیات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت ملت، ملیت، امیر، اطاعت امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لیکر بولتے ہیں، مگر اساسی فکر کے اعتبار سے یہ سب انکے لیے مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے اور غیر اسلامی فکر کو چھپانے کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے۔

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپکو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئیگی کہ اسکی بنا رکھنے کے لیے یہ طرز فکر، یہ انداز تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا، کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسکا ہر جزو ایک تبشہ ہے جس سے اصولی حکومت کے تخیل کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اصولی حکومت کے تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں۔ ہم اُنکے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر تمدن کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں اُن کی اپنی فلاح ہے اور جو اسکو قبول کرے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اس تخیل کو لیکر وہ شخص کس طرح اٹھ سکتا ہے جسکے دماغ، زبان، افعال و حرکات، ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنیکا دروازہ پہلے ہی بند کر دیا۔ پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کرکے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جنکے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد ہی نیشنلزم اور نیشن اسٹیٹس ہیں، انکو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور

اپنے نیشن اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح آپکی عقل یہ بات قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں کو روکنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

خلافت الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسکی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اسکا بنیادی نظریہ[1] یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اسکے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہوسکتی ہے: یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستورِ حکومت آیا ہو، یا وہ اُس شخص کی پیروی اختیار کرے جسکے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اِس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہونگے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اسکی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائیگا کہ ہم سب بحیثیت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اُس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جسکے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جس کی گرفت سے مر کر بھی ہم نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اسلیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، انکو اپنا غلام بنائیں، انکے سر اپنے آگے جھکوائیں، ان سے ٹیکس وصول کرکے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لیکر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ بار ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا رسالہ "اسلام کا نظریۂ سیاسی"۔

پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی نفس پرستی تعصب، جانب داری یا بد دیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائینگے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں Secular states سے بالکل مختلف ہے۔ اسکی ترکیب، اس کا مزاج، اُسکی فطرت کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اُسکو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُسکی فوج، اُسکی پولیس، اُسکی عدالت، اُسکے مالیات، اُسکے قوانین، اُسکے محاصل، اُسکی انتظامی پالیسی، اُسکی خارجی سیاست، اُسکی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ اِنکی عدالتوں کے جج اور چیف جسٹس اُسکی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اِنکی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھیرتے۔ اِنکے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ اِنکے وزرائے خارجیہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہونگے، شائد اپنے جھوٹ، دغا اور بد دیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو اِن حکومتوں کا کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جنکی اخلاقی و ذہنی تربیت اِن کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں۔ اُسکو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اسکو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں۔ جنکی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال

میں اُس ضابطہ اور اُس طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے، جنکی تمام سعی وجہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جنکی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے اُن کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت اُن کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ انکی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو اُن سے قتل و غارتگری ظلم وستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جنکی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ انکی راستی، انصاف پسندی، اصولِ اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اِس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے اور یہی لوگ اسکو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (utilitarian mentality) رکھنے والے لوگ جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جنکے پیشِ نظر نہ خدا ہو نہ آخرت، بلکہ جنکی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہونگے، ان کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی سبیل کیا ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائیٹی میں جس قسم کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و

محرکات فراہم ہوتے ہیں، انکے تعامل سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لیکر پورا درخت بننے تک تو ٹیموں کی حیثیت سے نشوونما پائے، مگر بارآوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اسکے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جسکی بنیادیں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسکے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اُسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اُٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت موجود ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمۂ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual leadership) کا سکہ[1] جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گردوپیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اُسکے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں، آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جسکو ہر پرکھنے والا ہر طرح جانچ کر بے کھوٹ کامل العیار سونا ہی پائے، اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اُس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جسکے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں، اور انکی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راستباز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ

[1] ملاحظہ ہو میرا مضمون "نیا نظام تعلیم" مندرجہ ترجمان القرآن (بابت ماہ شوال و ذی القعدہ ۱۳۵۹ھ)

۸۶۷۴ ۵۵

انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اُس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائیٹی کے وہ تمام عناصر جنکی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئینگے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائینگے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائیگی، اور اس بدلی ہوئی سوسائیٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائیگا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبیعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائیگا جسکے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہوگی، اور جونہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اسکو چلانے کے لیے ابتدائی اہلکاروں سے لیکر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اُس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہونگے جسکا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔

یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اُس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جسکو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اُسی نوعیت کی تحریک، اُسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن، اور اسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مانٹسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلاب روس صرف مارکس کے افکار اور لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ اور اُن ہزارہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جنکی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اُس مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جسکو ہیگل، فشتے، گیٹے تھے، نیتشے اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈرشپ نے تیار کیا۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جبکہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری

ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدوجہد سے بدل ڈالے۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک، جسکا پس منظر یہ ناقص نظام تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے اور جسکی بنیاد افادی اخلاقیات (Utilitarian morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا کر سکتی ہے؟ میں اس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیر اعظم موسیو رینو یقین رکھتے تھے[1]۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائیگی ویسے ہی نتائج برآمد ہونگے۔

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے۔ "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کریگی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن، یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ وہ موسیجی یا ساورکر ہو، یا ہٹلر یا مسولینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر۔ پس اگر "مسلمان" ایک نسلی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیش نظر مقصد صرف اسکا بول بالا کرنا ہے تو اسکے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے۔ اس کے

[1] موجودہ جنگ میں فرانس کی شکست سے چند روز پہلے موسیو رینو نے، جو اس وقت وزیر اعظم تھے، ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب فرانس کو صرف ایک معجزہ ہی بچا سکتا ہے اور میں معجزات پر یقین رکھتا ہوں"۔

نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ الٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیسر کٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اسکی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کرکے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے اُنکو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے اُن میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کرنا، جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے تو ضرور مفید ہوسکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمتہ اللہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ کون انکی اخلاقی برتری تسلیم کریگا؟ کس کی نگاہیں انکے سامنے عزت سے جھکینگی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں انکے "انفاسِ قدسیہ" سے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکیگا؟ کس جگہ انکی روحانی امامت کا سکہ جمیگا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کی خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کرینگے؟ اعلائے کلمتہ اللہ جس چیز کا نام ہے اس کے لیے تو صرف اُن کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پروا کیے بغیر جمنے والے ہوں، خواہ وہ اس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی

ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اسکے کہ وہ ابنوہ جسکا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، ۲۵ لاکھ یا ۵ لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تانبے کے اُن سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا گیا ہو۔ وہ سکّے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ اِن نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکّہ اُن جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اسکے نزدیک زیادہ قیمتی ہے ——— پھر جس لیڈرشپ کی اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے ضرورت ہے، وہ ایسی لیڈرشپ ہے کہ اُن اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جنکا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اٹھا ہے، خواہ اِس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اُس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی فلاح نظر آئے، اختیار کر لینے والی لیڈرشپ اور وہ لیڈرشپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو، اُس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظام تعلیم و تربیت جسکی بنیاد اِس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"، اُس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابل ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو، تم بہرحال اس راستہ پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معین کر دیا ہے۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپکو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر اُسکا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکینگے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مالگذاری، فینانس، تعلیمات، اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے، انکو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپنے نہیں کیا ہے۔ یہ تعلیم جو آپکے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جا رہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکرٹری اور وزراء تک فراہم کر سکتی ہے، مگر برا نہ مانیے، اسلامی عدالت کے لیے چپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات جدید تعلیم ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا وہ پرانا نظامِ

تعلیم جو حرکتِ زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیرِ مال، ایک وزیرِ جنگ، ایک ناظمِ تعلیمات اور ایک سفیر بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ اسوائے اِسکے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں اُنکے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اسکو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اسکی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اسکو ایک معجزہ سمجھونگا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظامِ حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ عمر ابنِ عبدالعزیز جیسا زبردست فرمانروا جسکی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ سوسائیٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود، نظامِ حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمراں نظامِ حکومت میں نہیں صرف اسکی اوپری شکل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس حد تک مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جنکو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو انکے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر

پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملیگا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" ہوگی جس پر اسلام کا غائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" انکی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دیگی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمتہ اللہ علیہ ہی رہینگے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑیگی، اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر، بلکہ اُس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہِ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اُس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اُسکے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جسکے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِ راہ ثابت ہوگی؟

اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سرِ نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریق کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اسکے

لیڈر وہ لوگ تھے جنکو رُسل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اسکے سوا کوئی اور طرزِ عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گذرے ہیں اُنکے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل سکیم نہیں بن سکتی۔ بائیبل کے عہدِ جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اسکو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن اس کے بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے[1]۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدتمندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جنکی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لیکر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظم مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپکو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے

[1] چونکہ مسیح علیہ السلام کا طریقِ تعلیم و تربیت بھی اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ کو سمجھنے کے لیے مفید ہے اسلیے انجیل متی و لوقا کے چند اقتباسات اس مضمون کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں درج کر دیے گئے ہیں۔

اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا۔ اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپکے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی، اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اسکے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اُسی ایک الٰہ کی بندگی قبول کرو۔

اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپکو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اُس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپکو خود مختار (independent) اور غیر ذمہ دار (irresponsible) سمجھنا، بالفاظ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی

رو سے کوئی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائیگا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لیگی۔ لہذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اسکی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس امٹ اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اسکے حکم کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بنکر رہ۔ دوسری طرف اس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اسلیے تو اسکے سوا کسی کا بندہ نہ بن۔ کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے میجسٹی اسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف ایک ہی کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈشپ نہیں ہے۔ لارڈشپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law-giver) نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی راجہ یا مہاراجہ، کوئی ولی و کارساز، کوئی دعائیں سننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اسی ایک کا غلام، مطیع اور

پابند حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سر نو ایک نئے نقشہ پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لیکر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہونگے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقہ سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لیکر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لیکر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر اسکی نظر ایک لحہ کے لیے بھی نہ ٹھیری۔ اسکی وجہ محض بے تدبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہیں، وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپکی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں انکے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں لہٰذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے، اس کا تقاضا ہی یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوتِ توحید سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپکے موذنوں کو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

کی صدا بلند کرتے ہوئے اسلیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود و اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائیگی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپکے دشمن ہو گئے ہیں، اور ہر طرف آپکے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اُسوقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اسلیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا، اسلیے الکفر ملة واحدة، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جنکا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جنکے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق

یہ ہے تو اسکی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست، آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی، کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کیسر کٹڑ اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جسکی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اسکے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گذر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے انکو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اسکی رضا کے لیے۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے بھوکے مرے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی جسکی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیسر کٹڑ پیدا ہوا۔ انکی خدا پرستی میں خلوص اتنا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبیعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اسکی راہ میں کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گذرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اُسکے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اسکی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے

اِس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز اُن پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر انکی نگاہ جمی رہے۔ جسکو وہ حاکم مان رہے ہیں اسکی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدہ میں مضبوط ہو جائیں۔ جسکے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادہ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح انکے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں اسکی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک انکے دل میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں، تو خواہ مخواہ انکے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی انکی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اسلیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو انکے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اُس چیز کو معلوم کریں، آخر ایسی کیا چیز ہے جسکے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اس دعوت کو لیکر ایسے لوگ اٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں تو انکی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ انکے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جنکو ذاتی وجاہت کے تکبر، یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اسکی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جسکے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ انکی ہر بات، ہر فعل، اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جسکی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کرونگا۔

انکی بیوی حضرت خدیجہ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ انکے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اسکو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا، اسکو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپکو اپنا بادشاہ بنا لینگے، عرب کی حسین ترین عورت آپکے نکاح میں دینگے، دولت کے ڈھیر آپکے قدموں میں لگا دینگے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سنیں جبکہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقہ کے لوگ ہیں انکو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان، بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپکی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچالوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپکا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکہ سے جب آپکو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپکے پاس رکھوائی تھیں، حضرت علی کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اسکو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لیکر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اس وقت کی جبکہ وہ اسکے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جسکو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہونگے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال بعد بدر کے میدان میں آنحضرت کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہونگے تو انکے دل اندر سے کہہ رہے ہونگے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُسوقت انکے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہونگے مگر انکے دل اندر سے بھنچ رہے ہونگے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک

اسلام کی پوری تربیت پاکر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اسکو کام کرنیکا موقع ملے، مسلمان کی حیثیت سے اسکو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبۂ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرادی۔ یہ دور اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل (Abstract idea) سے ترقی کرکے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اسکی عملی صورت میں اور اسکے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اُسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جسکے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابوسفیان قائل ہوئے، قاتل حمزہ وحشی قائل ہوئے، ہند جگر خوار تک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اسکی نگاہ میں کبھی کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ ۸ سال کی تمام لڑائیوں میں، جن سے عرب جیسی جنگ جو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپکے پیش نظر ہے تو آپکو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless revolution) کہے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب

میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بنگئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بنگئے۔ جو چور اور اچکے تھے اُن کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی انکو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جو ڈاکو اور لیٹرے تھے وہ اتنے متدین بنگئے کہ انکے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالہ کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اسکی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اسکے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے۔ وہ جنکی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، انکے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جنکو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی انکے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب انکا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اسکو بیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار انکی زبانوں سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے

تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا۔ انکے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ انکے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دورانِ جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہکر اہلِ شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں، لہذا جو کیس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اُن میں وہ سفیر پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اُسی وقت پڑ گیا ہوگا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جنکے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی انکا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نہ پیش ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لیکر نہیں لڑتے تھے بلکہ اُس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ سے میدان جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لا کر سپہ سالار کے سامنے رکھدیتے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپکے سامنے موجود ہے۔ کہیں آپکو ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ اس معمے کو لوگ حل نہیں کر سکتے اس لیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی

کا نقشہ نہیں بنا تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون ہو گیا ہے۔ اور کوئی اسے محض ایک خیالی آدمی (Visionary) قرار دیکر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کر دیتا۔ اُس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جنکی نگاہ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظام فکر پر ایک مکمل نظام حیات بنگیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اسکے نتائج انکے سامنے عیاناً آ گئے تب انکی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جسکو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اسکے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جسکی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اسکے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جسکو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا راستہ ہے۔ اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے، اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اسکو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہدیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے، نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبیعی قسم کا واقعہ ہے۔ اس میں علت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعور اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوت فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے ان جوان ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اُس کی پوری طرح نظر جما دیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں، مادنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات

کو قربان کردیں، اپنی امیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائیٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی انکے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کرینگے اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

استدراک - اوپر کے مضمون میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کی جو توضیح کی گئی ہے، اگرچہ وہ بجائے خود کافی ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے چند اقوال ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کر دیے جائیں جن سے اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہمارے موجودہ زمانے کے حالات اُن حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں جن میں سیدنا مسیحؑ نے اہلِ فلسطین کو حکومت الٰہیہ کی دعوت دی تھی اس لیے اُنکے طریق عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں :-

"فقیہوں میں سے ایک نے . . . . اُس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے، اے اسرائیل سُن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند[1] ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔ . . . . . فقیہ نے اس سے کہا اے اُستاد، کیا خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں" (مرقس ۱۲ : ۲۸ - ۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (لوقا ۴ : ۸)

"پس تم اس طرح دعا مانگا کرو کہ اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے

---

[1] "خداوند" اور "الٰہ" دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ ۷۵

زمین پر بھی ہو" (متی ۶ : ۹ - ۱۰)

اس آیت میں حضرت مسیح نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے انکی مراد محض روحانی بادشاہت تھی، یہ آیت اسکی تردید کرتی ہے۔ انکا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکم شرعی اسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اسکا قانون طبیعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ میں اسلیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اسکی ماں سے اور بہو کو اسکی ساس سے جدا کر دوں۔ اور آدمی کے دشمن اسکے گھر ہی کے لوگ ہونگے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب[1] نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئیگا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائیگا" (متی ۱۰ : ۳۴ - ۳۹)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[2] سے انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے" (متی ۱۶ : ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالہ کریگا اور بیٹے کو باپ۔ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالینگے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کرینگے مگر جو آخر تک برداشت کریگا وہی نجات پائیگا (متی ۱۰ : ۲۱ - ۲۲)

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں .... آدمیوں سے خبردار

---

[1] اپنی صلیب اٹھانے سے مراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے۔ جسطرح اردو میں محاورہ ہے سر ہتھیلی پر لے کر نکلنا۔

[2] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراض ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔

رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالہ کرینگے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے مارینگے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤگے" (متی ۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے[1] تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب ایک برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اسکے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت بنانی شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا۔۔۔۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا" (لوقا ۱۴: ۲۶-۳۳)

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اٹھے تھے بلکہ پورے نظام تمدن و سیاست کو بدل دینا انکے پیش نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار، اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا" (متی ۵: ۳۹-۴۱)

[1] دشمنی کرنے سے مراد انکی محبت اور انکے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر دینا ہے۔

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے اُن سے نہ ڈرو بلکہ اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے" (متی ۱۰ : ۲۸)

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو" (متی ۶ : ۱۹-۲۰)

کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا ..... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے ..... اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائینگے، یا کیا پینگے، اور نہ بدن کی کہ کیا پہینگے ..... ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ انکو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ بس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائیگی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائیگا؟ ..... تم پہلے اُسکی بادشاہت اور راستی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائینگی" (متی ۶ : ۲۴-۳۳)

"مانگو تو تمہیں دیا جائیگا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائیگا" (متی ۷ : ۷)

عام غلط فہمی ہے کہ مسیح نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی ہے۔ حالانکہ اس

انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمل شدائد، اور توکل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظام تمدن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اسکے قبضہ و اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال نہ دے، سختیاں اٹھانے کو تیار نہ ہو جائے، اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات کو گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ یہ کام جنہیں کرنا ہو انہیں ایک چھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے، کرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑ دینے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیے۔ خزائن رزق فی الوقت جنکے ہاتھ میں ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے لڑ کر رزق پانے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا جو اسباب سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسے پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی ان سے لڑ سکتا ہے۔

"اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں آرام دونگا۔ میرا جُوا اپنے اوپر اٹھا لو.... کیونکہ میرا جوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا" (متی ۱۱: ۲۸-۳۰)

شائد حکومت الٰہیہ کا یہی فسٹوا اس سے زیادہ مختصر اور پر اثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جُوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جُوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

"غیر قوموں کے بادشاہ ان پر حکومت چلاتے ہیں۔ اور جو اُن پر اختیار رکھتے ہیں وہ خداوند نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند

اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کے مانند بنے" (لوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

مسیح علیہ السلام یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا۔

"فقیہ اور فریسی[1] موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جنکا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو، نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"

"اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے

[1] فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔

مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو" (متی ۲۳: ۲ - ۲۸)

یہ اُس وقت کے حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود محض بندگی نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

"اُس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں[1] کے ساتھ اسکے پاس بھیجا اور انہوں نے (یعنی شاگردوں) نے کہا کہ اے استاد! ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔۔۔۔ ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے انکی شرارت جان کر کہا اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ ایک دینار اسکے پاس لے آئے۔ اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے کہا پس جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو" (متی ۲۲: ۱۵ - ۲۱)

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے چاہتے تھے کہ حضرت مسیح کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کے جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اسکو کچلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے

[1] مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں فلسطین کے ایک حصہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنت روم کی تابع فرمان تھی۔ اسکے بانی ہیرود کے نام پر اسکو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔

سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں۔ جواب میں حضرت مسیح نے جو ذو معنی بات کہی اسکو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اُس حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانے میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیح علیہ السلام نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا اُنکی دعوت کے خلاف تھا، اور نہ یہ فرمایا کہ اسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اس وقت تک اُن کی تحریک اس مرحلہ پر نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا، اسلیے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کر دو، اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔

اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیح کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیح کو گرفتار کرائے جبکہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ اسکریوتی نے مسیح کو پکڑوا دیا۔

"پھر ان کی ساری جماعت اٹھ کر اسے پیلاطس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور انہوں نے اس پر الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا۔ ..... پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کچھ قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لیکر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر ابھارتا ہے ..... وہ چلّا چلّا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلّانا کارگر ہوا" (لوقا ۲۳ : ۱ - ۲۳)

اس طرح دنیا میں مسیح علیہ السلام کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو

حضرت موسیٰؑ کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رو سے حضرت مسیح کی نبوت کا کل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدت میں انہوں نے اتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکی زندگی کے ابتدائی دو تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورۂ بالا عبارات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکی سورتوں اور زمانۂ قیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائیگا۔

جماعتِ اسلامی کی تشکیل

جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اُس سے تین حقیقتیں پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں:

ایک یہ کہ اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بنیادی طور پر بدل دینا ہے)

دوسرے یہ کہ یہ کلی و اساسی تغیر صرف اُسی طریق پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا

تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ نہ اس مقصد کے لیے ہے اور نہ اس طریقہ پر ہے۔

اس توضیح کے بعد بلا کسی تمہید کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں "جماعتِ اسلامی" ہو اور اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریق پر کام کرے۔

ایسی ایک جماعت کی تشکیل کس طرح ہو اور اُس کا ابتدائی پروگرام کیا ہو؟ ان دونوں سوالات پر بھی میں گذشتہ صفحات میں کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ خصوصاً میرا مضمون "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" تو انہی دو سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے۔ لیکن عام طور پر دماغ ان چیزوں سے اس قدر اجنبی

ہو چکے ہیں کہ سب کچھ سننے کے بعد کہتے ہیں "پروگرام لاؤ" گویا جو کچھ کہا گیا ہے اُس میں تو کوئی پروگرام تھا ہی نہیں۔ اسلیے یہاں جماعتِ اسلامی کے طریق تشکیل کو پوری طرح کھول کر دفعہ وار بیان کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اگر موجودہ پارٹیوں میں سے کوئی پارٹی اپنے دستور العمل اور پروگرام کو اس نقشہ کے مطابق تبدیل کرنے تو نہایت خوشی کی بات ہوگی، ورنہ ایک نئی جماعت بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں:

(۱) جماعت اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آسکتا۔ اس دائرے میں آنے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمۂ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو، وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا، اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اُس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور یہ شہادت اُسکے طرزِ خیال و طرزِ زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ کہنے کی جرأت کرے صرف وہی جماعت اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے، خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سرِ نو ایمان لائے۔

پیدائشی مسلمانوں کے کسی بڑے مجمع میں جوشیلی تقریر کے بعد لوگوں سے شہادت کا مطالبہ کرنا صحیح طریقہ نہیں ہے، کیونکہ دین آبائی سے جو روایتی دلچسپی اُنکے اندر موجود ہے اسکی بنا پر وہ کسی احساسِ ذمہ داری کے بغیر بلا تامل کلمہ پڑھ دینگے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ فرداً فرداً انکے سامنے کلمہ کے مفہوم کو اسکی ذمہ داریوں اور مقتضیات کے ساتھ پیش کیا جائے، اور جب وہ سوچ سمجھ کر شہادت ادا کریں تب انہیں جماعت میں داخل کیا جائے۔

کلمۂ شہادت کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لیے کوئی داخلہ کی فیس یا رکنیت کی فیس نہیں ہے۔

(۲) ادائے شہادت کے بعد فوری تغیر جو ایک شخص کو اپنی زندگی میں کرنا ہوگا وہ یہ ہے :

(الف) فرائض کو اُنکی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے ،

(ب) کبائر سے اجتناب کرے اور اگر نادانستہ کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے ،

(ج) اگر وہ کوئی ایسا ذریعۂ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے ، مثلاً سود ، شراب ، زنا ، رقص و سرود ، شہادت زور ، رشوت ، خیانت ، قمار ، قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ تو اسکو ترک کر دے بلا اس لحاظ کے کہ اسکے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو ، اور اگر اسکی معاش میں ان وسائل کا کوئی حصہ ہو تو وہ اس حصہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے ،

(د) اگر اسکے قبضہ میں ایسا مال (یا جائداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو ، یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے فوراً دست بردار ہو جائے اور اہلِ حقوق کو انکے حق پہنچا دے ،

(ھ) اگر وہ کسی مجلسِ قانون ساز کا رُکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ قانون سازی صرف خدا کا منصب ہے اور انسان کا قانون ساز بننا خدائی کے دعوے کو متضمن ہے ۔

(و) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہو تو اسکو واپس کرے اور اُن وفاداریوں اور نیاز مندیوں سے باز آئے جنکی بدولت اس نے خطاب پایا تھا ، یا جنکو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے نباہنا پڑتا ہے ۔

(ز) کسی غیر الٰہی نظام عدالت میں اپنا مقدمہ نہ لے جائے خواہ اس پابندی سے اسکو کتنا ہی ضرر پہنچتا ہو (البتہ اگر کوئی دوسرا شخص اسکو کسی مقدمہ میں گھسیٹ لے تو جائز طریقہ سے اپنی مدافعت کر سکتا ہے نہ اس حیثیت سے کہ یہ نظام عدالت برحق ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ جب مدعی اس پر حملہ آور ہوا ہے تو اسے دفع کرنا ہے)

یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اسکے متعلق یہ سمجھا جائیگا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت میں نہ لیا جائیگا یا لیا جا چکا ہے تو خارج کیا جائیگا ۔

(۳) ادائے شہادت کے بعد بتدریج جو تغیرات ہر شخص کو اپنی زندگی میں کرنے ہونگے وہ یہ ہیں:

(الف) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت کا فرق معلوم ہو اور حدود سے واقفیت حاصل ہو جائے

(ب) تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر، طرزِ خیال اور طرزِ عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنا، اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار، اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا، اور اپنی خود سری، نفس پرستی کے بت کو توڑ کر تابع امرِ رب بن جانا، (ج) اُن تمام رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف ہوں، (د) تمام اُن تعصبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو، اور اُن مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جنکی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جنکی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو،

(ھ) فاسقین و فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا، (و) اُن تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جنکا مقصد حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات کے سوا کچھ اور ہو، (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و مواعدت کے معاملات کیے جا سکتے ہیں، مگر یہ افراد کا کام ہیں جماعت کا کام ہے۔ کوئی مسلمان انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جزو نہیں بن سکتا)

(ز) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی، اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا، (ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیامِ دینِ حق کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی ضروریات زندگی کے ماسوا اُن تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔

ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجہ پر ہوں، مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر جماعت اسلامی میں آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

(۴) جو لوگ غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے میں آلہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں یا غیر الٰہی قانون کے اجرا میں مددگار بنتے ہیں انکی تین حیثیتیں ہیں:

اگر وہ اپنے اس کام پر خوش اور مطمئن ہیں اور اپنے اس کسب کو حلال و طیب سمجھتے ہیں اور اسی راہ میں ترقی

درجات کے متمنی ہیں تو اُنکے لیے اس دائرے میں کوئی جگہ نہیں۔

اگر وہ اس نظام کو غلط اور اپنے کسب کو حرام سمجھتے ہیں، مگر اعتراف گناہ کے باوجود اسکو محض ضعفِ ایمانی کی وجہ سے ترک نہیں کر سکتے تو وہ جماعت اسلامی کے طبقۂ سوم میں (جسکی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں۔

اگر وہ محض اس مجبوری سے اس نظام میں منسلک رہیں کہ کوئی دوسرا ذریعۂ زندگی نہیں پاتے، اور نیک نیتی کے ساتھ اس بات کے لیے تیار ہوں کہ دوسرا ذریعہ پاتے ہی اسے ترک کر دینگے تو وہ جماعت اسلامی کے درجہ دوم میں (جسکی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ غیر الٰہی نظام اطاعت کے ایک جزء اور دوسرے جزء میں کوئی فرق نہیں اُسکے جو اجزاء بظاہر بالکل معصوم نظر آتے ہیں وہ بھی اُسی قدر ناپاک ہیں جسقدر دوسرے غیر معصوم اجزاء۔ نیز جو غیر الٰہی نظام اطاعت مسلمانوں کی خداوندی میں چل رہا ہے وہ بھی اپنے تمام اجزاء سمیت اسی حکم میں ہے۔ مسلمان کی خداوندی اُسکو ہرگز کوئی سندِ طہارت عطا نہیں کرتی۔

(۵) جہاں ایک شخص متذکرۂ صدر طریقہ پر ایمان لائے، اسکے لیے لازم ہے کہ ایک طرف اپنے حلقۂ تعارف میں دوسرے مردوں اور عورتوں کو دعوتِ ایمان دے، اور دوسری طرف اپنی بستی میں ان لوگوں کو تلاش کرے جو اسکی طرح ایمان لائے ہوں پھر جہاں ایسے دو آدمی بھی ملجائیں وہاں انکو عارضی طور پر جماعتی ہئیت بنا لینی چاہیے، اس نیت کے ساتھ کہ جب بڑی جماعت بننے کی نوبت آئے یا انکو معلوم ہو کہ مرکزی جماعت بن گئی ہے تو وہ بلا تامل اس میں شامل ہو جائیں۔ (اس قسم کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کا اپنی مستقل امارتوں کے جھنڈے بلند کرنا اور اپنے علٰحدہ وجود کو باقی رکھنے پر اصرار کرنا انکے صدقِ ایمانی کا نہیں بلکہ انکی نفسانیت کا ثبوت ہوگا)

(۶) جو لوگ نظام جماعت میں شامل ہوں انکو انکے حالات کے لحاظ سے ابتداءً تین طبقوں میں منقسم کیا جائیگا:

ایسے اشخاص جو تن من دھن سے جماعت میں شریک ہوں، جو اسلامی نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں، جو اپنے آپکو بلا کسی استحفاظ و استثناء کے اِس طرح جماعت کے حوالہ کریں کہ جب انکو پکارا جائے لبیک کہیں، جو خدمت انکے سپرد کی جائے انجام دیں، اور جان، مال، اولاد، عزیز، اقارب، دوست غرض کسی چیز کو بھی مقصدِ اسلامی سے

زیادہ عزیز نہ رکھیں، وہ صفِ اول کے لوگ ہونگے، جماعت کا اصل کارکن اور کارفرما عنصر وہی ہونگے، اور رہنمائی و سربراہ کاری انہی کے ہاتھ میں ہوگی۔

وہ لوگ جو اپنے آپکو بالکلیہ وقف کرنیکی طاقت نہ رکھتے ہوں اور نہ خطرات اور قربانیوں کا پورا بار اٹھا سکتے ہوں، مگر اپنے وقت اپنے مال اور اپنی قوتوں کا ایک حصہ اپنے نفس کی خدمت سے بچا کر راہِ خدا میں دینے کے لیے تیار ہوں، وہ طبقۂ دوم میں شمار ہونگے، بشرطیکہ اپنی شخصی زندگی کی حد تک احکام دین کی پوری اطاعت کریں، اُن وسائل کسب رزق اور اُن مشاغل سے مجتنب رہیں جو براہِ راست دینِ حق کے خلاف ہیں، اور صدق دل سے جماعت اسلامی کے خیر خواہ و وفادار رہوں۔ جماعت کی طرف سے انکے پیرو وہی خدمات کی جائینگی جنکو وہ خود بخوشی قبول کریں۔ ذمہ داری کا کوئی منصب انکے سپرد نہ کیا جائیگا۔ اور جماعتی مشوروں میں وہ شریک ہو سکینگے۔

جو لوگ کلمۂ اسلام پر اصولی حیثیت سے ایمان لائیں اور شخصی زندگی کی حد تک احکام شرعی کی پابندی بھی قبول کریں، مگر غیر الٰہی نظام سے انکے جو مفاد وابستہ ہیں اُنکا نقصان گوارا نہ کر سکیں وہ طبقۂ سوم میں داخل ہونگے اور انکا شمار صرف ہمدردوں میں ہوگا۔ بشرطیکہ وہ دوسری وفاداریوں پر خدا کی وفاداری کو مقدم رکھیں، غیر الٰہی نظام میں ترقی درجات کے لیے کوشاں نہ ہوں، اور جماعت اسلامی کو ہر جائز امکانی طریقہ سے مدد دیں۔ جماعتی مشوروں میں وہ صرف اُس حد تک شریک ہو سکیں گے جس حد تک جماعت کو انکے خلوص پر اعتماد ہو۔

طبقات کی یہ تقسیم تمام اشخاص کے حق میں دائمی ابدی ہوگی بلکہ شخصی حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ بدلتی رہیگی۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی طبقۂ سوم کے ایک شخص کی حالت بدل جائے اور وہ طبقۂ اول میں آجائے اور علیٰ ھذا القیاس اسکے برعکس۔

(۷) اس جماعت کا ابتدائی پروگرام اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک طرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں، اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہوں (خواہ وہ قومی مسلمان ہوں یا غیر مسلم) انکو بالعموم حاکمیت غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیت رب العالمین کو تسلیم کرنیکی دعوت دیں۔ اس دعوت کی راہ میں جب تک کوئی قوت حائل نہ ہو، اُنکو بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی قوت حائل ہو، خواہ وہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنی ہوگی اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔

بعد کے مراحل کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسے حالات پیش آئینگے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائیگا۔ البتہ لوگوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مضبوط جمے ہوئے اور زمین پر چھائے ہوئے دین کو اکھاڑ کر دوسرے دین کو قائم کرنا بہرحال آسان کام نہیں ہے۔ اس میں جان، مال اور ہر چیز کی بازی ہے، لہٰذا وہی لوگ آگے بڑھیں جو تمام فائدوں اور آسائشوں کی قربانی اور تمام نقصانات کی برداشت کے لیے تیار ہوں۔

فہرست مضامین

ماہ صفر ۱۳۶۰ھ (مطابق اپریل ۱۹۴۱ء) جلد ۱۰ - عدد ۲

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۹۰
مقالات:		
اسلام اور جاہلیت	،،	۱۰۲
سرورِ عالم	،،	۱۲۹
اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاح عالم	مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی	۱۳۴
زندگی بعد موت	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۴۷
مطبوعات		۱۵۶

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس ٹرکلر روڈ میں طبع ہو کر
دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ - مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دنیا میں اِس وقت بڑے زور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ اَشَرٌ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِھِمْ رَبُّھُمْ رَشَدًا، اہلِ زمین کو محض انکے کرتوتوں کی سزا ہی دینے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اس توڑ پھوڑ کے بعد کوئی صالح چیز بھی بننے والی ہے۔ مگر ظاہر آثار سے اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اسکی عمر پوری ہو چکی ہے، اُن کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پر آلگا ہے، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ انکو اور انکی اس جاہلی تہذیب کو دنیا کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے۔ انکو زمین پر کام کرنے کا جتنا موقع ملنا تھا، مل چکا۔ وہ اپنے تمام اوصاف، اور اپنی تمام چھپی ہوئی قابلیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ اُنکے اندر شاید اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جو باہر نہ آچکی ہو۔ لہٰذا غالب گمان یہی ہے کہ عنقریب وہ میدان سے ہٹائے جانے والے ہیں، اور یہ زبردست شکست و ریخت اسی لیے ہو رہی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مراسم تجہیز و تدفین ادا کر دیں۔ اسکے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں پھر ایک ظلمت کا دور شروع ہو جس طرح آخری اسلامی تحریک کے زوال اور موجودہ جاہلی تہذیب کی پیدائش کے درمیان گذر چکا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے دوران میں کسی نئی تعمیر کی صورت نکل آئے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت، قومی اجتماعیت (نیشنل سوشلزم) اور اشتراکیت (کمیونزم) کی جو طاقتیں اس وقت آپس میں متصادم ہیں، یہ دراصل الگ الگ تہذیبیں نہیں ہیں کہ انکے درمیان انتخاب، اور ان میں سے بہتر کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہو۔ حقیقت میں یہ ایک ہی تہذیب کی تین شاخیں ہیں۔ ایک ہی تصور انسان، ایک ہی تصور کائنات، ایک ہی نظریۂ حیات اور ایک ہی اساس اخلاق ہے جس پر ان تینوں کی تعمیر ہوئی ہے۔ انسان کو حیوان سمجھنا، دنیا کو بے خدا فرض کرنا، علوم طبیعی سے انسانی زندگی کا قانون اخذ کرنا، اور اخلاق کی بنا تجربہ و مصلحت پر رکھنا، یہ ان سب کی مشترک بنیاد ہے ان کے درمیان فرق صرف اس حیثیت سے ہے کہ اس جاہلی تہذیب نے سب سے پہلے فرد کی آزادی اور قوموں کی انفرادیت کا بیج بویا تھا جس سے قومی ریاستوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ جمہوریت پیدا ہوئی اور مدتہائے دراز تک انسانیت کو تباہ و برباد کرتی رہی، پھر جب اس کے ظلم و ستم سے انسانی مصائب حد کو پہنچ گئے تو اسی تہذیب نے اشتراکی انقلاب کو بطور علاج پیش کیا، مگر بہت جلدی ظاہر ہو گیا کہ یہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ تباہ کن ہے، آخر کار وہی تہذیب پھر ایک دوسری تجویز سامنے لائی جس کا نام فاشزم یا نیشنل سوشلزم ہے اور چند سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس ام الخبائث کا یہ آخری بچہ فتنہ انگیزی و شر بازی میں پہلے دونوں برخورداروں سے بھی بازی لے گیا ہے۔

اب دنیا کے لیے اُس تہذیب کو اور زیادہ آزمانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے جو آدمی کو جانور سمجھ کر، اور اس جانور کو بے لگام فرض کر کے اپنا کام شروع کرتی ہے اور اسکے اندر جوع البقر سے لیکر بدترین قسم کی درندگی تک ہر وہ بیماری پیدا کر دیتی ہے جو آدمیت کے حق میں نہایت مہلک ہے۔ درحقیقت یہ پوری تہذیب اپنی تمام شاخوں سمیت عمر طبعی کو پہنچ چکی ہے، امتحان کی مدت ختم کر چکی ہے، اس کے پاس اب کوئی اور اچھوتا ایسا باقی نہیں رہا ہے جس کو یہ انسانی مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر سکے، اور بالفرض اگر یہ اپنی زندگی کی مہلت بڑھانے کے لیے کسی اور "ازم" کی تخلیق کا بہانہ کرے بھی تو خدا کی مشیت

یہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اِسے اپنی زمین کو فساد سے بھرنے کا کوئی اور موقع دیگا - بہت ممکن ہے کہ موجودہ تصادم کے بعد اسکی شاخوں میں سے کوئی ایک شاخ باقی رہ جائے، مگر یقیناً اُس کا بقا رعارضی ہوگا، جلدی ہی وہ شاخ خود چیخ کر اپنے اندر سے آگ جھاڑیگی اور آپ اپنی آگ ہی سے جل کر خاک ہو جائیگی -

---

اب رہا یہ سوال کہ آیا اس تہذیب کی تباہی کے بعد دنیا میں پھر کوئی ظلمت کا دور آنا ہے یا کوئی نئی تعمیر شروع ہونی ہے، تو اس کا فیصلہ دو چیزوں پر منحصر ہے :

ایک یہ کہ جاہلیت خالصہ کی ناکامی کے بعد کوئی اور ایسا نظریہ انسان کو ملتا ہے یا نہیں جو پچھلے فاسد نظریوں سے بہتر ہو، جس سے انسانی عقل صلاح کی توقعات وابستہ کر سکے اور جس پر ایک جاندار اور طاقت ور تہذیب قائم ہو سکتی ہو -

دوسرے یہ کہ نوع انسانی میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جسکے اندر جہاد اور اجتہاد کی وہ صلاحیتیں اور قوتیں ہوں جو ایک نئے نظریہ پر ایک نئی تہذیب کا قصر تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہیں، اور جسکے اخلاق و اوصاف اُن لوگوں سے مختلف ہوں جنکی خباثت و شرارت کا ابھی قریب ہی میں انسان کو تجربہ ہو چکا ہے -

اگر ایسا کوئی نظریہ بروقت سامنے آجائے اور اسکو لے کر ایک صالح جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقیناً نوع انسانی ایک دوسرے دورِ ظلمت سے بچ سکتی ہے، ورنہ کوئی قوت اسکو اس تاریک گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی - یہ صدمۂ عظیم جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے، یہ بھیڑیوں سے بدتر سلوک جو اس وقت آدمی آدمی کے ساتھ کر رہا ہے، یہ بے دردی و سنگدلی جو کبھی دور وحشت میں بھی آدمی سے ظاہر نہیں ہوئی تھی، یہ بے رحمی و فساوت جسکی نظیر درندہ جانور بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں، یہ علم و حکمت کے نتائج جو آج جہاں سوز طیاروں اور انسان پاش ٹینکوں کی شکل میں دیکھے جا رہے ہیں، یہ تنظیمی قابلیتوں کے ثمرات جنہوں نے آج غارت گر فوجوں کی صورت اختیار کی ہے، یہ صنعتی ترقی کے پھل جو آج آلات جنگ کی

بھیانک شکل میں نمودار ہو رہے ہیں، یہ وسائل نشر و اشاعت کا کمال جس سے آج دنیا میں جھوٹ پھیلانے اور قوموں میں منافرت کے بیج بونے کا کام لیا جا رہا ہے، یہ سب کچھ انسان کا دل توڑ دینے اور اسکو اپنے آپ سے اور اپنی ساری قابلیتوں اور صلاحیتوں سے مایوس کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے، اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی دل شکستہ و مایوس ہو کر صدیوں کے لیے نیند اور بے ہوشی کی حالت میں مبتلا ہو جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں، انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور ایک صالح جماعت کا برسر کار آنا ہے۔

مگر وہ کونسا نظریہ ہو سکتا ہے جس کے لیے آج کامیابی کا کوئی موقع ہو؟

مشرکانہ جاہلیت جس پر دنیا کی بہت سی قدیم تہذیبیں قائم ہوئی تھیں، اب اسکے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ شرک کی جڑ کٹ چکی ہے۔ جاہل عوام پر چاہے اس کا تسلط ابھی باقی ہو، مگر علم و عقل رکھنے والے لوگ اب اس وہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کائنات کے نظام کو بہت سے خدا چلا رہے ہیں، اور انسان کی فلاح و سعادت کا سررشتہ دیوتاؤں یا روحوں سے وابستہ ہے۔ علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ مشرکانہ نظریہ سے انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل جس نے اس وقت دنیا کو پریشان کر رکھا ہے، نوع انسانی میں وحدت کا فقدان ہے۔ مگر شرک اس مشکل کو حل نہیں کرتا، بلکہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے مزید تفریق و تقسیم کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ لہذا کسی مشرکانہ نظریہ کے لیے آج دنیا میں برسر اقتدار آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

راہبانہ جاہلیت دنیا میں کبھی کوئی طاقت نہ تھی نہ بن سکتی ہے۔ کرما اور تناسخ اور اہنسا اور ہمہ اوست کے نظریات، جو روح کو سرد اور ہمتوں کو پست اور قوائے فکریہ کو افیون تخیل کی پینک میں مست

کر دینے والے ہیں، اپنے اندر اتنی جان ہی نہیں رکھتے کہ انکے بل پر کوئی ایسی تہذیب پیدا ہو سکے جو زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہو اور دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصب جلیل پر فائز ہو سکتی ہو۔ کوئی سامری اس تنِ مردہ میں روح پھونکنے کی جتنی چاہے کوشش کر دیکھے، یہ نظریات کبھی گیان اور تیاگ اور تپسیا کے مقام سے آگے بڑھ کر ایک صالح تمدن کی تخلیق اور ایک عادل مملکت کی تاسیس اور ایک درخشان تہذیب کی تعمیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا مردہ اور رو بزوال قومیں تو ان نظریات کے چکر میں پڑی رہ سکتی ہیں مگر کسی زندہ اور ابھرنے والی قوم کے تخیل کو یہ کبھی اپنی طرف نہیں کھینچ سکینگے رہی جاہلیت خالصہ تو اس کا اور اسکی پیداوار کا اب دنیا کو اتنا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ عنقریب وہ اس سے مایوس ہونے والی ہے۔ انسان کا اپنے آپکو جانور فرض کرنا، جانوروں کی زندگی سے تنازع للبقاء اور انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح کا قانون اپنے لیے اخذ کرنا، مادّی فوائد اور لذتوں کو مقصودِ حیات ٹھیرانا، تجربات اور مصالح کو اخلاق کا ماخذ قرار دینا، اور کسی فوق الانسانی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنا جو کچھ نتائج پیدا کر سکتا تھا وہ سب اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ سامنے آ چکے ہیں۔ ان نظریات کی بدولت انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ قومی اور نسلی تعصبات ہیں، رنگ و نسل کی برتری کے دعوے ہیں، قومی ریاستوں کی معاشی و سیاسی رقابتیں ہیں، قیصریت اور استعمار اور معاشی لوٹ کے فتنے ہیں، افراد سے لیکر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں تک کا اپنے معاملات میں ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو جانا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا واقعی جانور بنکر کام کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا بلکہ بے روح مشینوں کا سا سلوک کرنا ہے۔ یہ نظریات اگر جمہوریت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو ظلم اور کسبِ حرام اور مخش اور بے حیائی کی آزادی ملتی ہے۔ اور اگر اشتراکیت یا اجتماعیت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو بھیڑ بکریوں کے گلّے کی طرح ایک ڈکٹیٹر یا ایک چھوٹی سی پارٹی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں جس طرح چاہے ہانکے اور اُن کا جو کچھ چاہے بنائے۔ یہ پھل جو ان نظریات سے پیدا ہوئے

ہوئے ہیں، کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اس شجر خبیث کی عین فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے یہ پھل پیدا ہوں۔ لہذا جس طرح اب تک انسان اس سے کسی قسم کی فلاح نہیں پا سکا ہے اسی طرح آئندہ بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انسانیت کے اس حیوانی تصور اور کائنات کے اس مادہ پرستانہ نظریے اور اخلاق کی اس تجربی اور مصلحت پرستانہ بنیاد پر کوئی ایسا اجتماعی مسلک پیدا ہو سکے گا جو انسان کے لیے موجب فلاح ہو۔

ان سب نظریات کی ناکامی کے بعد اب دنیا اگر کسی نظریہ سے فلاح کی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہو سکتا ہے:

جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور، جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے، جس کا تصورِ انسانیت مغربی سائنس کے "تصورِ حیوانی" اور مسیحیت کے "پیدائشی گنہگار" اور ہندویت کے "مجبور تناسخ" سے بلند تر ہو۔

جو انسان کو مختار مطلق اور شتر بے مہار نہ بنائے بلکہ اسے سلطان کائنات کے اقتدار اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اسکے آگے ذمہ دار و جواب دہ ٹھہرائے،

جو اخلاق کے ایک ایسے قابل عمل ضابطہ کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق ردوبدل کرنیکا حق اسکو نہ ہو،

جو مادی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی و روحانی بنیاد فراہم کرے جس پر انسانیت متحد ہو سکتی ہو،

جو اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہو سکے،

جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے،

اور ان سب خصوصیات کے ساتھ، جو علمی و عقلی اور تمدنی ارتقا میں انسان کی صرف مدد ہی نہ کرے بلکہ صحیح رہنمائی بھی کرے اور مادی و اخلاقی، ہر دو حیثیتوں سے اسکو ترقی کی طرف لے جائے۔

ایسا ایک نظریہ دنیا میں اسلام کے سوا اور کونسا ہے؟ لہذا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے خود ساختہ تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کے لیے اب کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔ اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نئے نظریہ کی تصنیف اور اسکی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت میں صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جس سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے، جس کے لیے نوع انسانی کا دین بن جانے کا امکان ہے، اور جسکی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائینگے۔ ایک تہذیب کا سقوط اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتا کہ کل تھی اور آج ناپید ہو گئی۔ اور دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح واقع نہیں ہوتا کہ آج چٹیل میدان ہے اور کل کسی منتر کے زور سے ایک عالیشان قصر بن کھڑا ہو۔ گرنے والی تہذیب کے افکار، اصول، طریقے مدتہائے دراز تک دلوں اور ماغوں پر، علوم و آداب پر اور تمدن و معاشرت پر اپنا اثر جمائے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استیصال خود بخود نہیں ہو جاتا، کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح گرنے والی تہذیب کے علمبردار بھی زوال پذیر ہونے کے باوجود سالہا سال تک زمین پر قبضہ جمائے رہتے

ہیں۔ وہ خود جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے، ہٹانے سے ہٹتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ سہولت سے بیٹھے رہیں اور وہ خود بنجائے۔ اس کام کے لیے ایک زبردست تنقیدی، تخریبی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے، جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سر نو مدوّن کرے حتی کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں، ایک طرف ان پرانے سانچوں کو ڈھائے جن پر انسانیت ڈھلا کرتی تھی اور دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن سے نئے اخلاق اور نئی سیرتوں کے آدمی ڈھلنے لگیں، ایک طرف پرانے نظام تمدن و سیاست کو بزور مٹائے اور دوسری طرف ایک پورا نظام تمدن و سیاست اپنے اصولوں پر عملاً قائم کر دے۔

پس دنیا کو آئندہ دور ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں ایک صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اسکے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ انکو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی صورت سے دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اسکے خود مطیع بنیں، جس ضابطہ پر ایمان لاتے ہیں اسکے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اسکا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اسکا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اسے خود چھوڑیں۔ اسکے بغیر تو انکی صداقت آپ ہی مشتبہ ہوگی بجائے اسکے کوئی اسکے آگے سر تسلیم خم کرے۔ پھر انکو اس فاسد نظام تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اس سے اور اسکے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہوگا، اُن تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظام غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقات عزیز بھی صرف کرنے پڑینگے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑیگا، قید اور جلاوطنی اور ضبطی اموال

اور تباہی اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہونگے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑینگی۔ ان راہوں سے گذرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑیں نہیں پھیلا سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اسکے اصولوں کی طاقت جسقدر ضروری ہے اسیقدر اُن انسانوں کی سیرت، اُنکے عمل، اور انکی قربانی و سرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں مگر زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینہ سے، اور اپنی جانکشی سے اس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اُگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اگرچہ خلوص ایمان اور قربانی و جانفشانی ہر دین کے قیام کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل۔ مگر دینِ حق اس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دینِ باطل کے قیام کے لیے درکار ہے۔ حق ایک ایسا باریک بین صراف ہے جو ذرا سی کھوٹ کو بھی قبول کرنیکے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خالص سونا چاہتا ہے جو آزمائشوں کی بھٹی میں سے گذر کر جب تک ساری کھوٹ جل نہ جائے اور پورے عیار کا کندن نکل نہ آئے وہ اپنے نام سے اسکو بازار میں لانے کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق ہے، باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سکے اور ملمع کیے ہوئے زیور بیچتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (آل عمران - ۱۸)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں وہ نہ مانیگا جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۔ (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہدینے پر کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیے جائینگے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائیگا حالانکہ ان سے پہلے جو گذرے ہیں (یعنی جنہوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے) وہ ضرور تپائے گئے ہیں۔ ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً (التوبہ - ۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم ستے چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (بقرہ - ۲۶)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائیگا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گذری ہی نہیں جو تم سے پہلے (ایمان لانے والوں) پر گذر چکی ہے۔ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتی کہ رسول اور اسکے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ، وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ۔ (العنکبوت - ۱)

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، مگر جب اللہ کی راہ میں انہیں ستا لیا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسا اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ حالانکہ اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو یہی لوگ آکر کہینگے کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہل دنیا کے دلوں کی حالت سے خوب واقف نہیں ہے؟ مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایمان دار کون ہیں اور منافق کون۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ، اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ - ۱۹)

ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان، مال اور کمائیوں کے نقصانات سے آزمائینگے، اور کامیابی کی بشارت دیدو اُن مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور آخر اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر انکے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ راست پانے والے ہیں۔

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ (محمد - ۱)

یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی خود نہیں کر سکتا اسلیے تم سے مدد مانگتا ہے۔ نہیں، وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں انکو تباہ کر کے رکھدے اور اپنے دین کو خود قائم کر دے، مگر اس نے یہ جہاد اور محنت اور قربانی کا بار تم پر اسلیے ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے

جب تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو، اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات و مہالک پیش نہ آئیں، سچے اہلِ ایمان جھوٹے مدعیوں سے ممیز نہیں ہو سکتے، اور جب تک ناکارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھنٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتھا نہیں بن سکتا جو خلافت الٰہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریۂ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریۂ حق تو موجود ہے، البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پر ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایماندارانہ جذبے کے ساتھ اور اپنی ہر عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کر دینے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ اب کہاں مل سکتے ہیں، وہ تو بس ایک مبارک دور میں پیدا ہو گئے تھے اور پھر خالق نے اس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ محض ایک وہم ہے اور ایسا وہم انہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور ہر صلاحیت کے آدمی ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں منافقانہ خصوصیات رکھنے والے اور ضعیف الارادہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں۔ آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ہٹلر اور جرمنی پر ایمان لائے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی خاطر ہوائی جہاز سے عین دشمن کے ملک میں جست لگاتے ہیں جہاں انکو معلوم ہے کہ بے شمار شکاری انکی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ روس کا انقلاب جب ابھی چوبیس پچیس ۲۵ سال پہلے ہی کی بات ہے۔ اسکی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہزارہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانیاں کرتے رہے، سائبیریا کے جہنم میں بھیجے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلاوطنی کی حالت میں برسوں ملک ملک کی خاک چھانتے پھرے، اپنی ذاتی خوشحالی کی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا خون کیا، خانماں بربادی کو خود اپنے ہاتھوں مول لیا، اور یہ سمجھے اس وقت کیا جبکہ زار کی سلطنت کے مٹنے کا تصور بھی بمشکل ہی کیا جا سکتا تھا۔ دور نہ جائیے، خود ہندوستان ہی کو

دیکھ لیجیے - یہاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ کشت وخون کے ذریعے سے وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکینگے انہوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی زندگیوں کو برباد کرنے اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی ؟ کونسی ممکن التصور مصیبت ایسی تھی جسے انہوں نے برداشت نہ کیا ہو ؟ قید خانوں میں شدید ترین اذیتیں اٹھائیں ، حبس دوام میں عمریں گذار دیں ، پھانسی کے تختہ پر جانیں تک دیدیں - اس سے بحث نہیں کہ انکے نظریات غلط تھے ، مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اسکے لیے جان و مال اور شخصی امنگوں کی قربانی گوارا کرنے اور مصیبتیں سہنے کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں ہے - گاندھی جی کی سول نافرمانی ابھی حال ہی کی بات ہے - کیا اسی ہندوستان کے باشندوں میں ایسے لوگ موجود نہ تھے جنہوں نے لاٹھیاں کھائیں ، جیل گئے اور مالی نقصانات برداشت کیے ؟ کیا بارڈولی کے کسانوں نے اپنی زمینوں ، اپنے جانوروں اور اپنے گھر کے برتنوں تک کی قرقی اور نیلام کو صبر کے ساتھ برداشت نہیں کیا ؟ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آج ایثار و قربانی کی وہ صفات انسانوں میں مفقود ہیں جو پہلے لوگوں میں پائی جاتی تھیں ؟ اگر ہٹلر اور مارکس اور گاندھی پر ایمان لا کر انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے ، تو کیا خدا پر ایمان لا کر کچھ نہیں کر سکتا ؟ اگر خاک وطن میں اتنی کشش ہے کہ اسکے لیے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا خدا کی رضا اور اسکے تقرب میں اتنی بھی کشش نہیں ہے ؟ پس جو لوگ خود پست ہمت اور ضعیف الارادہ ہیں انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کار عظیم کے لیے جن اولوالعزم انسانوں کی ضرورت ہے وہ کہیں مل ہی نہیں سکتے ، البتہ اپنی ذات کی حد تک وہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ

محرم کی اشاعت میں جماعت اسلامی کی تشکیل کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اسکو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے ، کہ جو حضرات اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہیں اور اسکے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں وہ دفتر ترجمان القرآن کو اپنے عزم سے مطلع فرمائیں - اب وقت آگیا ہے کہ جہاں جہاں اس فکر کے آدمی موجود ہیں انکے درمیان رابطہ پیدا کیا جائے اور انکے اجتماع کی کوئی صورت نکالی جائے - لہذا اگر ہمیں انکے پتے معلوم ہوں تو ایک اجتماعی ہیئت بنانے میں بڑی سہولت ہو جائیگی - بہت سے حضرات ایسے ہیں جو مقصد سے متفق ہیں اور کام کرنا چاہتے ہیں ، مگر صرف یہ دیکھ کر خاموش بیٹھے ہیں کہ بظاہر کوئی کام نہیں ہو رہا ہے - اب انہیں مہر سکوت توڑنی چاہیے اور اپنے ارادے کا اظہار کر دینا چاہیے - بہت سے حضرات ایسے بھی ہیں جو اپنی اپنی جگہ اس سلسلہ میں کچھ کام کر رہے ہیں - مگر انہیں سمجھنا چاہیے کہ ایک فکر اور ایک مقصد رکھنے والے لوگوں کا الگ الگ رہنا اصولاً غلط اور عملاً غیر مفید ہے - ایسے سب حضرات اگر دفتر ترجمان القرآن کو ایک واسطہ کی حیثیت سے استعمال کریں تو انکے درمیان رابطہ پیدا ہو سکتا ہے - کیا ہم امید کریں کہ ایسے تمام حضرات غیر ضروری تامل کے بغیر ہمیں اپنے پتوں اور ضروری حالات سے آگاہ فرما دینگے ؟

مقالات

اِسلام اور جاھلیّت

[یہ مقالہ ۲۳ر فروری ۱۹۴۱ء کو مجلس اسلامیات، اسلامیہ کالج پشاور کی دعوت پر پڑھا گیا تھا]

انسان کو دُنیا میں جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی وہ کوئی معاملہ اُس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس چیز کی ماہیّت و کیفیت اور اپنے اور اُسکے باہمی تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرلے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رائے بجائے خود صحیح ہو یا غلط، مگر بہرحال اسے اِن اُمور کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنی ضرور پڑتی ہے۔ اور جب تک وہ کوئی رائے قائم نہیں کر لیتا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ میں اسکے ساتھ کیا طرزِ عمل اور کیا رویّہ (Attitude) اختیار کروں۔ یہ آپکا شب و روز کا تجربہ ہے۔ آپ جب کسی شخص سے ملتے ہیں تو آپکو یہ معلوم کرنیکی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ شخص کون ہے، کس حیثیت، کس مرتبے، کن صفات کا آدمی ہے اور مجھ سے اس کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔ اسکے بغیر آپ یہ طے کر ہی نہیں سکتے کہ آپکو اُسکے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے۔ اگر علم نہیں ہوتا تو بہرحال آپکو قرائن کی بنا پر ایک قیاسی رائے ہی ان امور کے متعلق قائم کرنی پڑتی ہے اور جو رویّہ بھی آپ اُسکے ساتھ اختیار کرتے ہیں اسی رائے کی بنا پر کرتے ہیں۔ جو چیزیں آپ کھاتے ہیں اُنکے ساتھ آپکا یہ معاملہ اسی وجہ سے ہے کہ آپ کے علم یا آپکے قیاس میں وہ چیزیں غذائی ضرورت پوری کرتی ہیں۔ جن چیزوں کو آپ پھینک دیتے ہیں، جنکو آپ استعمال کرتے ہیں، جن کی آپ حفاظت کرتے ہیں،

جنکی آپ تعظیم یا تحقیر کرتے ہیں، جن سے آپ ڈرتے یا محبت کرتے ہیں، اُن سب کے متعلق آپ کے یہ مختلف طرزِ عمل اُسی رائے پر مبنی ہوتے ہیں جو آپ نے اُن چیزوں کی ذات و صفات اور اپنے ساتھ اُنکے تعلق کے بارے میں قائم کی ہے۔

پھر جو رائے آپ اشیاء کے متعلق قائم کیا کرتے ہیں اُسکے صحیح ہونے پر آپکے رویہ کا صحیح ہونا اور غلط ہونے پر آپکے رویہ کا غلط ہونا منحصر ہوتا ہے۔ اور خود اس رائے کی غلطی و صحت کا مدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ آیا آپنے علم کی بنا پر رائے قائم کی ہے، یا قیاس پر، یا وہم پر، یا محض مشاہدۂ حسّی پر۔ مثلاً ایک بچہ آگ کو دیکھتا ہے اور مجرد مشاہدۂ حسّی کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ بڑا خوبصورت، چمکدار کھلونا ہے۔ چنانچہ اس رائے کے نتیجہ میں اُس سے یہ طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُسے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اسی آگ کو دیکھ کر وہم سے یا قیاس سے یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اسکے اندر الوہیت ہے، یا یہ الوہیت کا مظہر ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسکے ساتھ میرا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ میں اسکے آگے سرِ نیاز جھکا دوں۔ ایک تیسرا شخص اسی آگ کو دیکھ اسکی ماہیت اور اسکی صفات کی تحقیق کرتا ہے اور علم و تحقیق کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ پکانے اور جلانے اور تپانے والی ایک چیز ہے، اور میرے ساتھ اس کا تعلق وہ ہے جو ایک مخدوم کے ساتھ خادم کا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ آگ کو نہ کھلونا بناتا ہے نہ معبود، بلکہ اس سے حسبِ موقع پکانے اور جلانے اور تپانے کی خدمت لیتا ہے۔ ان مختلف رویوں میں سے بچے اور آتش پرست کے رویے جاہلیت کے رویے ہیں۔ کیونکہ بچے کی یہ رائے کہ آگ محض کھلونا ہے تجربے سے غلط ثابت ہو جاتی ہے اور آتش پرست کی یہ رائے کہ آگ خود الٰہ ہے یا مظہرِ الوہیت ہے کسی ثبوتِ علمی پر مبنی نہیں بلکہ محض قیاس و وہم پر مبنی ہے۔ بخلاف اسکے آگ سے خدمت لینے والے کا رویہ علمی رویہ ہے کیونکہ آگ کے متعلق اُسکی رائے علم پر مبنی ہے۔

زندگی کے بنیادی مسائل

اس مقدمہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب ذرا اپنی نظر کو جزئیات سے کلیات پر پھیلائیے۔ انسان اس دُنیا میں اپنے آپکو موجود پاتا ہے۔ اسکے پاس ایک جسم ہے جس میں بہت سی قوتیں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے زمین و آسمان کی ایک عظیم الشان بساط پھیلی ہوئی ہے جس میں بیحد و حساب اشیاء ہیں اور وہ اُن اشیاء سے کام لینے کی قدرت اپنے اندر پاتا ہے۔ اسکے گرد و پیش بہت سے انسان، جانور، نباتات، جمادات وغیرہ ہیں اور ان سب سے اسکی زندگی وابستہ ہے۔ اب کیا آپکے نزدیک یہ متصور ہے کہ وہ ان چیزوں کے ساتھ کوئی رویّہ اختیار کرسکتا ہے جب تک کہ پہلے خود اپنے بارے میں، ان تمام موجودات کے بارے میں، اور انکے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرلے؟ کیا وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی راستہ اختیار کرسکتا ہے جب تک یہ طے نہ کرلے کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، ذمہ دار ہوں یا غیر ذمہ دار، خود مختار ہوں یا ماتحت، ماتحت ہوں تو کس کا اور جواب دہ ہوں تو کس کے سامنے، میری اس دنیوی زندگی کا کوئی مآل ہے یا نہیں، اور ہے تو کیا ہے؟ اسی طرح کیا وہ اپنی قوتوں کے لیے کوئی مصرف تجویز کرسکتا ہے جب تک اس سوال کا فیصلہ نہ کرلے کہ یہ جسم اور جسمانی قوتیں اسکی اپنی ملک ہیں یا کسی کا عطیہ ہیں، اِن کا حساب کوئی لینے والا ہے یا نہیں، اور اِن کے استعمال کا ضابطہ اسے خود متعین کرنا ہے یا کسی اور کو؟ اسی طرح کیا وہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء کے متعلق کوئی طرزِ عمل اختیار کرسکتا ہے جب تک اس امر کا تعین نہ کرلے کہ اِن اشیاء کا مالک وہ خود ہے یا کوئی اور، اِن پر اُسکے اختیارات محدود ہیں یا غیر محدود، اور محدود ہیں تو حدود مقرر کرنے والا کون ہے؟ اسی طرح کیا وہ آپس میں اپنے ابنائے نوع کے ساتھ برتاؤ کی کوئی شکل متعین کرسکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کوئی رائے قائم نہ کرلے کہ انسانیت کس چیز سے عبارت ہے، انسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز کی بنیاد کیا ہے، اور دوستی و دشمنی، اتفاق و اختلاف، تعاون اور عدم تعاون کی اساس کن

امور پر ہے؟ اسی طرح کیا وہ بحیثیت مجموعی اس دُنیا کے ساتھ کوئی رویّہ اختیار کرسکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچے کہ یہ نظامِ کائنات کس قسم کا ہے، اور اس میں میری کیا حیثیت ہے؟

جو مقدمہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں، اُسکی بنا پر بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام امور کے متعلق ایک نہ ایک رائے قائم کیے بغیر کوئی رویّہ اختیار کرنا غیر ممکن ہے۔ فی الواقع ہر انسان جو دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، اِن سوالات کے متعلق شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتا ہے اور رکھنے پر مجبور ہے، کیونکہ وہ اس رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص نے اِن سوالات پر فلسفیانہ غور و فکر کیا ہو اور واضح طور پر تنقیحات قائم کرکے ایک ایک سوال کا فیصلہ کیا ہو۔ نہیں بہت سے آدمیوں کے ذہن میں اِن سوالات کی سرے سے کوئی متعیّن صُورت ہوتی ہی نہیں۔ نہ وہ کبھی اِن پر مالا اِدراک سوچتے ہیں۔ مگر باوجود اسکے ہر آدمی اجمالی طور پر ان سوالات کے متعلق منفی یا مثبت پہلو میں ایک رائے پر لازماً پہنچ جاتا ہے، اور زندگی میں اُس کا جو رویّہ بھی ہوتا ہے لازمی طور پر اُسی رائے کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ بات جس طرح اشخاص کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح جماعتوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ چونکہ یہ سوالات انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں اس لیے کوئی نظامِ تمدن و تہذیب اور حیاتِ اجتماعی کے لیے کوئی لائحہ بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ ان سوالات کا کوئی جواب متعین نہ کرلیا جائے۔ اور ان کا جو جواب بھی متعین کیا جائیگا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، اسی کی نوعیت کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی اور فی الجملہ پُورا تمدن ویسا ہی رنگ اختیار کریگا جیسا اُس جواب کا مقتضا ہوگا۔ درحقیقت اس معاملہ میں کوئی تخلّف ممکن ہی نہیں ہے۔ خواہ ایک شخص کا رویہ ہو یا ایک سوسائیٹی کا، بہرحال وہ ٹھیک وہی نوعیت اختیار کریگا جو ان سوالات کے جواب کی نوعیت ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر آپ چاہیں تو ایک شخص یا ایک جماعت کے رویّہ کا تجزیہ کرکے بآسانی یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ اس رویّہ کی تہ میں زندگی کے اِن بنیادی سوالات کا کونسا جواب کام کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ بات قطعی محال ہے

کہ کسی شخصی یا اجتماعی رویّہ کی نوعیت کچھ ہو اور اِن سوالات کے جواب کی نوعیت کچھ اور ہو۔ اختلاف زبانی دعوے اور واقعی رویّہ کے درمیان تو ضرور ہو سکتا ہے، لیکن ان سوالات کا جو جواب درحقیقت نفس کے اندر متمکن ہے اُسکی نوعیت اور عملی رویّہ کی نوعیت میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اچھا اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہیے۔ زندگی کے یہ بنیادی مسائل جنکے متعلق ابھی آپنے سُنا کہ ان کا کوئی حل اپنے ذہن میں متعین کیے بغیر آدمی دنیا میں ایک قدم نہیں چل سکتا، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سب کے سب امورِ غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن کا کوئی جواب اُفق پر لکھا ہُوا نہیں ہے کہ ہر انسان دُنیا میں آتے ہی اسکو پڑھ لے۔ اور ان کا کوئی جواب ایسا بدیہی بھی نہیں ہے کہ ہر انسان کو خود بخود معلوم ہو جائے۔ اسی وجہ سے اِن کا کوئی ایک حل نہیں ہے جس پر سارے انسان متفق ہوں۔ بلکہ اِنکے بارے میں ہمیشہ انسانوں کے درمیان اختلاف رہا ہے اور ہمیشہ مختلف انسان مختلف طریقوں سے انکو حل کرتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انکو حل کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں، کیا صورتیں دُنیا میں اختیار کی گئی ہیں، اور ان مختلف صورتوں سے جو حل نکلتے ہیں وہ کس قسم کے ہیں؟

انکے حل کی ایک صُورت یہ ہے کہ آدمی اپنے حواس پر اعتماد کرے اور حواس سے جیسا کچھ محسوس ہوتا ہے اُسی کی بنا پر ان اُمور کے متعلق ایک رائے قائم کر لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشاہدۂ حسی کے ساتھ وہم و قیاس کو ملا کر ایک نتیجہ اخذ کیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ پیغمبروں نے حقیقت کا براہِ راست علم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے اِن مسائل کا جو حل بیان کیا ہے اسکو قبول کر لیا جائے۔

دُنیا میں اب تک اِن مسائل کے حل کی یہی تین صورتیں اختیار کی گئی ہیں، اور غالباً یہی تین صورتیں ممکن بھی ہیں۔ اِن میں سے ہر صورت ایک جداگانہ طریقہ سے اِن مسائل کو حل کرتی ہے، ہر ایک حل سے ایک خاص قسم کا رویّہ وجود میں آتا ہے اور ایک خاص نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن بنتا ہے جو

اپنی بنیادی خصوصیات میں دوسرے تمام حلوں کے پیدا کردہ رویّوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ان مختلف طریقوں سے ان مسائل کے کیا حل نکلے ہیں اور ہر ایک حل کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے۔

خالص جاہلیت

حواس پر اعتماد کر کے جب انسان اِن مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا ہے تو اس طرزِ فکر کی عین فطرت کے تقاضے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جسکے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد نہیں۔ یونہی بن گیا ہے۔ یونہی چل رہا ہے۔ اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائیگا۔ اس کا کوئی مالک نظر نہیں آتا، لہذا وہ یا تو ہے ہی نہیں، یا اگر ہے تو انسان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو شائد اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اس کو کسی نے پیدا کیا یا یہ خود پیدا ہو گیا۔ بہرحال یہ سوال خارج از بحث ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے۔ کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے اسکی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قویٰ اور کچھ آلات رکھتا ہے جو اِن خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور اسکے گرد و پیش زمین کے دامن پر بے حد و حساب سامان پھیلا ہوا ہے جس پر یہ اپنے قویٰ اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہذا اسکی قوتوں کا کوئی مصرف اسکے سوا نہیں کہ یہ اپنی خواہشات و ضروریات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرے۔ اور دنیا کی کوئی حیثیت اسکے سوا نہیں کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو اس لیے پھیلا ہوا ہے کہ انسان اس پر ہاتھ مارے۔ اوپر کوئی صاحبِ امر نہیں جسکے سامنے انسان جواب دہ ہو۔ اور نہ کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود ہے جہاں سے انسان کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہذا انسان ایک خود مختار اور غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اپنے لیے ضابطہ و قانون بنانا اور اپنی قوتوں کا مصرف تجویز کرنا، اور موجودات کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کا تعین کرنا اس کا اپنا کام ہے۔

اسکے لیے اگر کوئی ہدایت ہے تو جانوروں کی زندگی میں، پتھروں کی سرگذشت میں، یا خود اپنی تاریخ کی تجربات میں ہے۔ اور یہ اگر کسی کے سامنے جواب دہ ہے تو آپ اپنے سامنے یا اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانی نفس ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ زندگی جو کچھ ہے یہی دنیوی زندگی ہے اور اعمال کے سارے نتائج اسی زندگی کی حد تک ہیں۔ لہذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائیگا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ ایک پورا نظریۂ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا جواب حسی مشاہدہ پر دیا گیا ہے۔ اور اس جواب کا ہر جزء دوسرے جزء کے ساتھ کم از کم ایک منطقی ربط اور ایک مزاجی موافقت ضرور رکھتا ہے جسکی وجہ سے انسان دُنیا میں ایک ہموار و یکساں رویہ اختیار کر سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ جواب اور اس سے پیدا ہونے والا رویہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ اب اُس رویہ پر ایک نگاہ ڈالیے جو اس جواب کی بنا پر آدمی دُنیا میں اختیار کرتا ہے۔

انفرادی زندگی میں اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اوّل سے لے کر آخر تک خود مختارانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرے۔ وہ اپنے آپکو اپنے جسم اور اپنی جسمانی قوتوں کا مالک سمجھیگا، اس لیے اپنے حسب منشا جس طرح چاہے گا اُنہیں استعمال کریگا۔ دُنیا کی جو چیزیں اسکے قبضہ قدرت میں آئیں گی اور جن انسانوں پر اسکو اقتدار حاصل ہوگا ان سب کے ساتھ وہ اس طرح برتاؤ کریگا جیسے کہ وہ ان کا مالک ہے۔ اسکے اختیارات کو محدود کرنے والی چیز صرف قوانین قدرت کی حدیں اور اجتماعی زندگی کی ناگزیر بندشیں ہوں گی۔ خود اُسکے اپنے نفس میں کوئی ایسا اخلاقی احساس ــــ ذمہ داری کا احساس اور کسی بازپرس کا خوف ــــ نہ ہوگا جو اسے شتر بے مہار بننے سے روکتا ہو۔ جہاں خارجی رکاوٹیں نہ ہوں، یا جہاں وہ ان رکاوٹوں کے علی الرغم کام کرنے پر قادر ہو وہاں تو اسکے عقیدہ کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ وہ ظالم، بددیانت، شریر اور مفسد ہو۔ وہ فطرتاً خود غرض،

مادّہ پرست، اور ابن الوقت ہوگا۔ اسکی زندگی کا کوئی مقصد اپنی نفسانی خواہشات اور حیوانی ضروریات کی خدمت کے سوا نہ ہوگا، اور اسکی نگاہ میں قدر و قیمت صرف اُن چیزوں کی ہوگی جو اُسکے اِس مقصدِ زندگی کے لیے کوئی قیمت رکھتی ہوں۔ افراد میں یہ سیرت و کردار پیدا ہونا اس عقیدے کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ بے شک یہ ممکن ہے کہ مصلحت اور دور اندیشی کی بنا پر ایسا شخص ہمدرد ہو، ایثار پیشہ ہو، اپنی قوم کی فلاح و ترقی کے لیے جان توڑ کوشش کرتا ہو، اور فی الجملہ اپنی زندگی میں ایک طرح کے ذمہ دارانہ اخلاق کا اظہار کرے۔ لیکن جب آپ اسکے اس رویہ کا تجزیہ کرینگے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ اسکی خود غرضی و نفسانیت ہی کی توسیع ہے۔ وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کی بھلائی میں اپنی بھلائی دیکھتا ہے اس لیے اسکی بھلائی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص زیادہ سے زیادہ بس ایک نیشنلسٹ ہی ہو سکتا ہے۔

پھر جو سوسائیٹی اس ذہنیت کے افراد سے بنے گی اُسکی امتیازی خصوصیات یہ ہونگی: سیاست کی بنیاد انسانی حاکمیت پر قائم ہوگی، خواہ وہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کی حاکمیت ہو، یا جمہور کی حاکمیت۔ زیادہ سے زیادہ بلند اجتماعی تصور جو قائم کیا جا سکے گا وہ بس دولت مشترکہ (Common wealth) کا تصور ہوگا۔ اس مملکت میں قانون سارا انسان ہونگے۔ تمام قوانین خواہش اور تجربی مصلحت کی بنا پر بنائے اور بدلے جائینگے۔ اور منفعت پرستی و مصلحت پرستی ہی کے لحاظ سے پالیسیاں بھی بنائی اور بدلی جائیں گی۔ مملکت کے حدود میں وہ لوگ زور کر کے اُبھر آئینگے جو سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ چالاک مکار، جھوٹے، دغاباز، سنگدل اور خبیث النفس ہونگے۔ سوسائیٹی کی رہنمائی اور مملکت کی زمامِ کار انہی کے ہاتھ میں ہوگی، اور انکی کتابِ آئین میں زور کا نام حق، اور بے زوری کا نام باطل ہوگا۔ تمدن و معاشرت کا سارا نظام نفس پرستی پر قائم ہوگا۔ لذاتِ نفس کی طلب ہر اخلاقی قید سے آزاد ہوتی چلی جائیگی، اور تمام اخلاقی معیار اس طرح قائم کیے جائینگے کہ انکی وجہ سے لذتوں کے حصول میں کم سے کم

رکاوٹ ہو۔ اسی ذہنیت سے آرٹ اور لٹریچر متاثر ہونگے اور انکے اندر عُریانی و شہوانیت کے عناصر بڑھتے چلے جائینگے۔ معاشی زندگی میں کبھی جاگیرداری سسٹم برسرِ عروج آئیگا، کبھی سرمایہ داری نظام اسکی جگہ لیگا اور کبھی مزدور شورش کرکے اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم کرلیں گے۔ عدل سے بہرحال معیشت کا رشتہ کبھی قائم نہ ہوسکیگا، کیونکہ دنیا اور اسکی دولت کے بارے میں اس سوسائیٹی کے ہر فرد کا بنیادی رویہ اِس تصور پر مبنی ہوگا کہ یہ ایک خوان یغما ہے جس پر حسب منشاء اور حسب موقع ہاتھ مارنے کے لیے وہ آزاد ہے۔ پھر اس سوسائیٹی میں افراد کو تیار کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کا جو نظام قائم ہوگا اُسکا مزاج بھی اِسی تصورِ حیات اور اِسی رویہ کے مناسب حال ہوگا۔ اُس میں ہر نئی آنے والی نسل کو دنیا اور انسان، اور دنیا میں انسان کی حیثیت کے متعلق وہی تصور دیا جائیگا جسکی تشریح میں نے اوپر کی ہے۔ تمام معلومات، خواہ وہ کسی شعبۂ علم سے متعلق ہوں، اُن کو ایسی ہی ترتیب کے ساتھ دی جائینگی کہ آپ سے آپ اُنکے ذہن میں زندگی کا یہ تصور پیدا ہوجائے۔ اور پھر ساری تربیت اِس ڈھنگ کی ہوگی کہ وہ زندگی میں یہی رویہ اختیار کرنے اور اسی طرز کی سوسائیٹی میں کھپ جانے کے لیے تیار ہوں۔ اس تعلیم و تربیت کی خصوصیات کے متعلق مجھے آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آپ لوگوں کو اسکا ذاتی تجربہ ہے۔ جن درسگاہوں میں آپ تربیت پا رہے ہیں وہ سب اسی نظریہ پر قائم ہوئی ہیں اگرچہ اُنکے نام اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ ہیں۔

یہ رویہ جسکی تشریح میں نے ابھی آپکے سامنے کی، خالص جاہلیت کا رویہ ہے۔ اسکی نوعیت وہی ہے جو اُس بچے کے رویے کی نوعیت ہے جو محض حسی مشاہدے پر اعتماد کرکے آگ کو ایک خوبصورت کھلونا سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اس مشاہدے کی غلطی فوراً تجربے سے ظاہر ہوجاتی ہے، کیونکہ جس آگ کو کھلونا سمجھ کر وہ دست اندازی کا رویہ اختیار کرتا ہے وہ گرم آگ ہوتی ہے، ہاتھ لگاتے ہی فوراً بتادیتی ہے کہ میں کھلونا نہیں ہوں۔ بخلاف اس کے یہاں مشاہدے کی غلطی بڑی دیر میں کھلتی ہے، بلکہ بہتوں پر کھلتی ہی نہیں، کیونکہ جس آگ پر یہ ہاتھ ڈالتے ہیں اُسکی آنچ دھیمی ہے، فوراً چرکا نہیں دیتی

بلکہ صدیوں تک تپاتی رہتی ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص تجربات سے سبق لینے کے لیے تیار ہو تو شب و روز کی زندگی میں اس نظریہ کی بدولت افراد کی بے ایمانیوں، حکام کے مظالم، منصفوں کی بے انصافیوں، مالداروں کی خود غرضیوں، اور عام لوگوں کی بداخلاقیوں کا جو تلخ تجربہ اسکو ہوتا ہے، اور بڑے پیمانے پر اسی نظریہ سے قوم پرستی، امپیریلزم، جنگ، فساد، ملک گیری اور اقوام کشی کے جو شرارے نکلتے ہیں، اُنکے چرکوں سے وہ یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ رویہ جاہلیت کا رویہ ہے علمی رویہ نہیں ہے۔ کیونکہ انسان نے اپنے متعلق اور نظام کائنات کے متعلق جو رائے قائم کرکے یہ رویہ اختیار کیا ہے وہ امر واقعی کے مطابق نہیں ہے ورنہ اس سے یہ بُرے نتائج ظاہر نہ ہوتے۔

اب ہمیں دوسرے طریقہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم سے کام لیکر ان مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے۔ اس طریقے سے تین مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں اور ہر ایک رائے سے ایک خاص قسم کا رویہ پیدا ہوا ہے:

شرک

۱۔ ایک رائے یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام بے خداوند تو نہیں ہے، مگر اسکا ایک خداوند (الٰہ یا رب) نہیں، بلکہ بہت سے خداوند (آلہہ اور ارباب) ہیں۔ کائنات کی مختلف قوتوں کا سررشتہ مختلف خداؤں کے ہاتھ میں ہے اور انسان کی سعادت و شقاوت، کامیابی و ناکامی، نفع و نقصان بہت سی ہستیوں کی مہربانی و نامہربانی پر منحصر ہے۔ یہ رائے جن لوگوں نے اختیار کی ہے اُنہوں نے پھر اپنے وہم و قیاس سے کام لیکر یہ تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدائی کی طاقتیں کہاں کہاں اور کس کس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور جن جن چیزوں پر بھی اُنکی نگاہ جاکر ٹھیری ہے اُنہی کو خدا مان لیا ہے۔

اس رائے کی بنا پر جو طرزِ عمل انسان اختیار کرتا ہے اسکی امتیازی خصوصیات یہ ہیں:

اوّلاً، اس سے آدمی کی پوری زندگی اوہام کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ وہ کسی علمی ثبوت کے

بغیر مجرد اپنے وہم و خیال سے بہت سی چیزوں کے متعلق یہ رائے قائم کرتا ہے کہ وہ فوق الفطری طریقوں سے اسکی قسمت پر اچھا یا بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ اس لیے وہ اچھے اثرات کی موہوم امید اور بُرے اثرات کے موہوم خوف میں مبتلا ہو کر اپنی بہت سی قوتیں لاحاصل طریقہ سے ضائع کر دیتا ہے۔ کہیں کسی قبر سے اُمید لگاتا ہے کہ یہ میرا کام کر دے گی۔ کہیں کسی بُت پر بھروسہ کرتا ہے کہ وہ میری قسمت بنا دے گا۔ کہیں کسی اور خیالی کارساز کو خوش کرنے کے لیے دوڑتا پھرتا ہے۔ کہیں کسی بُرے شگون سے دل شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور کہیں کسی اچھے شگون سے توقعات کے خیالی قلعے بنا لیتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اسکے خیالات اور اسکی کوششوں کو فطری تدابیر کے راستہ سے ہٹا کر ایک بالکل غیر فطری راستہ پر ڈال دیتی ہیں۔

ثانیاً، اس رائے کی وجہ سے پوجا پاٹ، نذر نیاز، اور دوسری رسموں کا ایک لمبا چوڑا دستور العمل بنتا ہے جس میں الجھ کر آدمی کی سعی و عمل کا ایک بڑا حصہ بے نتیجہ مشغولیتوں میں صرف ہو جاتا ہے۔

ثالثاً، جو لوگ اس مشرکانہ وہم پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں اُنکو بے وقوف بنا کر اپنے جال میں پھانس لینے کا چالاک آدمیوں کو خوب موقع مل جاتا ہے۔ کوئی بادشاہ بنکر بیٹھتا ہے اور سورج، چاند، یا دوسرے دیوتاؤں سے اپنا نسب ملا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہم بھی خداؤں میں سے ہیں اور تم ہمارے بندے ہو۔ کوئی پروہت یا مجاور بن بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا نفع و نقصان جن سے وابستہ ہے ان سے ہمارا تعلق ہے اور تم ہمارے ہی واسطے سے ان تک پہنچ سکتے ہو۔ کوئی پنڈت اور پیر بن جاتا ہے اور تعویذ گنڈوں اور منتروں اور عملیات کا ڈھونگ رچا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہماری یہ چیزیں فوق الفطری طریقے سے تمہاری حاجتیں پوری کرینگی۔ پھر ان سب چالاک لوگوں کی نسلیں مستقل خاندانوں اور طبقوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جنکے حقوق، امتیازات، اور اثرات امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور گہری بنیادوں پر جمتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس عقیدہ کی بدولت عام انسانوں کی گردنوں پر شاہی خاندانوں، مذہبی عہدہ داروں اور روحانی پیشواؤں کی خدائی کا جُوا مسلط ہوتا ہے اور یہ بناوٹی خدا اُنکو اس طرح اپنا خادم بناتے ہیں کہ گویا وہ اِنکے لیے دودھ دینے

اور سواری اور بار برداری کے جانور ہیں۔

رابعاً، یہ نظریہ نہ تو علوم و فنون، فلسفہ و ادب، اور تمدن و سیاست کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور نہ اُن خیالی خداؤں سے انسانوں کو کسی قسم کی ہدایت ہی ملتی ہے کہ وہ اُسکی پابندی کریں۔ ان خداؤں سے تو انسان کا تعلق صرف اس حد تک محدود رہتا ہے کہ یہ اُنکی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کے لیے بس عبودیت کے چند مراسم ادا کردے۔ باقی رہے زندگی کے معاملات تو انکے متعلق قوانین اور ضوابط بنانا اور عمل کے طریقے معین کرنا انسان کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اس طرح مشرک سوسائٹی عملاً اُنہی سب راہوں پر چلتی ہے جنکا ذکر خالص جاہلیت کے سلسلہ میں ابھی میں آپ سے کر چکا ہوں۔ وہی اخلاق، وہی اعمال، وہی طرزِ تمدن، وہی سیاست، وہی نظامِ معیشت، اور وہی علم و ادب۔ ان تمام حیثیتوں سے شرک کے رویّے اور خالص جاہلیت کے رویّہ میں کوئی اصولی فرق نہیں ہوتا۔

رھبانیت

۲۔ دوسری رائے جو مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم کو ملا کر قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دُنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دار العذاب ہے۔ انسان کی روح ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے اس قفس میں بند کی گئی ہے۔ لذّات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں اصل میں یہ اس قید خانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان جتنا اس دنیا اور اسکی چیزوں سے تعلق رکھے گا اتنا ہی ان زنجیروں میں پھنستا چلا جائیگا اور مزید عذاب کا مستحق ہوگا۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ زندگی کے سارے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے۔ خواہشات کو مٹایا جائے۔ لذات سے کنارہ کشی کی جائے۔ جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبوں کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے۔ اُن تمام محبتوں کو دل سے نکال دیا جائے جو گوشت و خون کے تعلق سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنے اس دشمن یعنی نفس و جسم کو مجاہدوں اور ریاضتوں سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اُس کا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح

ہلکی اور پاک صاف ہو جائیگی اور نجات کے بلند مقام پر اُڑنے کی طاقت حاصل کرلے گی۔

اس رائے سے جو رویہ پیدا ہوتا ہے اسکی خصوصیات یہ ہیں:-

اوّلاً، اس سے انسان کے تمام رجحانات اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف اور تمدن سے وحشت کی طرف پھر جاتے ہیں۔ وہ دُنیا اور اُس کی زندگی سے مُنہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ذمہ داریوں سے بھاگتا ہے۔ اسکی ساری زندگی عدم تعاون اور ترک موالات کی زندگی بن جاتی ہے۔ اور اسکے اخلاق زیادہ تر سلبی (Negative) نوعیت کے ہو جاتے ہیں۔

ثانیاً، اس رائے کی بدولت نیک لوگ دُنیا کے کاروبار سے ہٹ کر اپنی نجات کی فکر میں گوشہ ہائے عزلت کی طرف چلے جاتے ہیں اور دُنیا کے سارے معاملات شریر لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں۔

ثالثاً، تمدن میں اس رائے کا اثر جس حد تک پہنچتا ہے اس سے لوگوں کے اندر سلبی اخلاقیات، غیر تمدنی (Anti-social) اور انفرادیت پسندانہ (Individualistic) رجحانات اور مایوسانہ خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ انکی عملی قوتیں سرد ہو جاتی ہیں۔ وہ ظالموں کے لیے نرم نوالہ بن جاتے ہیں اور ہر جابر حکومت انکو آسانی سے قابو میں لاسکتی ہے۔ درحقیقت یہ نظریہ عوام کو ظالموں کے لیے ذلول (Tame) بنانے میں جادو کی تاثیر رکھتا ہے۔

رابعاً، انسانی فطرت سے اس راہبانہ نظریہ کی مستقل جنگ رہتی ہے اور اکثر یہ اُس سے شکست کھا جاتا ہے۔ پھر جب یہ شکست کھاتا ہے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے اسے حیلوں کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے۔ کہیں عشق مجازی کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے اور کہیں ترکِ دُنیا کے پردے میں وہ دنیا پرستی کی جاتی ہے جسکے آگے دنیا پرست بھی شرما جائیں۔

ہمہ اوست

۳- تیسری رائے جو مشاہدے اور قیاس کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ انسان اور کائنات

اور کائنات کی تمام چیزیں بجائے خود غیر حقیقی ہیں۔ ان کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ دراصل ایک وجود نے ان ساری چیزوں کو خود اپنے ظہور کا واسطہ بنایا ہے اور وہی ان سب کے اندر کام کر رہا ہے تفصیلات میں اس نظریہ کی بے شمار صورتیں ہیں۔ مگر ان ساری تفصیلات کے اندر قدر مشترک یہی ایک خیال ہے کہ تمام موجودات ایک ہی وجود کا ظہور خارجی ہیں اور دراصل موجود وہی ہے باقی کچھ نہیں۔

اس نظریہ کی بنا پر جو رویہ انسان اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہونے ہی میں شک ہو جاتا ہے کجا کہ وہ کوئی کام کرے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی کٹھ پتلی سمجھتا ہے جسے کوئی اور نچا رہا ہے یا جیسے اندر کوئی اور ناچ رہا ہے۔ وہ اپنے تخیلات کے نشے میں گم ہو جاتا ہے۔ اسکے لیے نہ کوئی مقصدِ زندگی ہوتا ہے اور نہ کوئی راہ عمل۔ وہ خیال کرتا ہے کہ میں خود تو کچھ ہوں ہی نہیں، نہ میرے کرنے کا کوئی کام ہے، نہ میرے کیے سے کچھ ہو سکتا ہے۔ اصل میں تو وہ وجودِ کلی جو مجھ میں اور تمام کائنات میں سرایت کیے ہوئے ہے اور جو ازل سے ابد تک چلا جا رہا ہے، سارے کام اسی کے ہیں اور وہی سب کچھ کرتا ہے۔ وہ اگر مکمل ہے تو میں بھی مکمل ہوں، پھر کوشش کس چیز کے لیے؟ اور وہ اگر اپنی تکمیل کے لیے کوشاں ہے تو جس عالم گیر حرکت کے ساتھ وہ کمال کی طرف جا رہا ہے اُسی پیسٹ میں ایک جزء کی حیثیت سے میں بھی آپ سے آپ چلا جاؤنگا۔ میں ایک جزء ہوں، مجھے کیا خبر کہ کُل کدھر جا رہا ہے اور کدھر جانا چاہتا ہے؟

اس طرزِ خیال کے عملی نتائج قریب قریب وہی ہیں جو ابھی میں نے راہبانہ نظریہ کے سلسلہ میں بیان کیے ہیں۔ بلکہ بعض حالات میں اس رائے کو اختیار کرنے والے کا طرزِ عمل اُن لوگوں کے رویہ سے ملتا جلتا ہوتا ہے جو خالص جاہلیت کا نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اپنی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے اور پھر جدھر خواہشات لے جاتی ہیں اس طرف یہ سمجھتے ہوئے بے تکلف چلا جاتا ہے کہ جانے والا وجود کلی ہے نہ کہ میں۔

پہلے نظریہ کی طرح یہ تینوں نظریے بھی جاہلیت کے نظریے ہیں۔ اور اس بنا پر جو رویے ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی جاہلیت ہی کے رویے ہیں۔ اس لیے کہ اول تو ان میں سے کوئی نظریہ بھی کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیالی اور قیاسی بنیادوں پر مختلف رائیں قائم کر لی گئی ہیں۔ دوسرے انکا واقعہ کے خلاف ہونا تجربہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی رائے بھی امر واقعی کے مطابق ہوتی تو اس کے مطابق عمل کرنے سے بُرے نتائج تجربے میں نہ آتے۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ ایک چیز کو جہاں کہیں انسان نے کھایا اُسکے پیٹ میں درد ضرور ہوا، تو اس تجربے سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فی الواقع معدہ کی جو ساخت ہے اور جو اُسکی طبیعت ہے، یہ چیز اس کے مطابق نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جب یہ حقیقت ہے کہ شرک، رہبانیت اور وجودیت کے نظریے اختیار کرنے سے انسان کو بحیثیت مجموعی نقصان ہی پہنچا تو یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے، کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی واقعہ اور حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔

اسلام

اب ہمیں تیسری صورت کو لینا چاہیے جو زندگی کے ان بنیادی مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے کی آخری صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ پیغمبروں نے ان مسائل کا جو حل پیش کیا ہے اُسے قبول کیا جائے۔

اس طریقہ کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی اجنبی مقام پر آپ ہوں اور آپکو خود اُس مقام کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہو تو آپ کسی دُوسرے شخص سے دریافت کریں اور اُسکی راہ نمائی میں وہاں کی سیر کریں۔ ایسی صورتِ حال جب پیش آتی ہے تو آپ پہلے اُس شخص کو تلاش کرتے ہیں جو خود واقف کار ہونیکا دعویٰ کرے، پھر آپ قرائن سے اس امر کا اطمینان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ شخص قابلِ اعتماد ہے یا نہیں، پھر آپ اس کی راہ نمائی میں چل کر دیکھتے ہیں، اور جب تجربہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسکی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جو عمل آپ نے کیا اس سے کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلا تو آپکو پوری طرح اطمینان ہو جاتا ہے کہ واقعی وہ شخص واقف کار تھا اور اس جگہ کے متعلق جو معلومات اُس نے دی تھیں وہ صحیح تھیں۔

یہ ایک علمی طریقہ ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا طریق علمی ممکن نہ ہو تو پھر رائے قائم کرنے کے لیے یہی ایک صحیح طریقہ ہو سکتا ہے۔

اب دیکھیے، دُنیا آپ کے لیے ایک اجنبی جگہ ہے۔ آپکو نہیں معلوم کہ اسکی حقیقت کیا ہے، اس کا انتظام کس قسم کا ہے، کس آئین پر یہ کارخانہ چل رہا ہے، اسکے اندر آپکی کیا حیثیت ہے، اور یہاں آپکے لیے کیا رویہ مناسب ہے۔ آپنے پہلے یہ رائے قائم کی کہ جیسا بظاہر نظر آتا ہے اصل حقیقت بھی وہی ہے۔ آپ نے اس رائے پر عمل کیا مگر نتیجہ غلط نکلا۔ پھر آپنے قیاس اور گمان کی بنا پر مختلف رائیں قائم کیں اور ہر ایک پر عمل کر کے دیکھا مگر ہر صورت میں نتیجہ غلط ہی رہا۔ اس کے بعد آخری صورت یہی ہے کہ آپ پیغمبروں کی طرف رجوع کریں۔ یہ لوگ واقف کار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اِنکے حالات کی جتنی چھان بین کی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سچے، نہایت امین، نہایت نیک، نہایت بے غرض، اور نہایت صحیح الدماغ لوگ ہیں۔ لہٰذا بادی النظر میں اُن پر اعتماد کرنے کے لیے کافی وجہ موجود ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ دنیا کے متعلق اور دنیا میں آپکی حیثیت کے متعلق جو معلومات وہ دیتے ہیں وہ کہاں تک لگتی ہوئی ہیں، اُن کے خلاف کوئی علمی ثبوت تو نہیں ہے، اور اُنکے مطابق جو رویہ دنیا میں اختیار کیا گیا وہ تجربہ سے کیسا ثابت ہوا۔ اگر تحقیق سے ان تینوں باتوں کا جواب بھی اطمینان بخش نکلے تو ان کی راہ نمائی پر ایمان لے آنا چاہیے اور زندگی میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو اس نظریہ کے مطابق ہو۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا پچھلے جاہلیت کے طریقوں کے مقابلہ میں یہ طریقہ علمی طریقہ ہے۔ اور اگر اس علم کے آگے آدمی سر تسلیم خم کر دے، اگر خود سری اور خود رائی چھوڑ کر اس علم کا اتباع کرے، اور اپنے رویہ کو انہی حدود کا پابند بنا دے جو اس علم نے قائم کی ہیں تو اسی طریقہ کا نام اسلامی طریقہ ہے۔

انبیاء کا نظریۂ کائنات و انسان

پیغمبر کہتے ہیں:

یہ سارا عالم ہست و بود جو انسان کے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزء انسان بھی ہے کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں ہے بلکہ ایک منظم، باضابطہ سلطنت ہے۔ اللہ نے اسکو بنایا ہے وہی اس کا مالک ہے۔ اور وہی اس کا اکیلا حاکم ہے۔ یہ ایک کلی نظام (Totalitarian System) ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں ہیں۔ اُس مقتدر اعلیٰ کے سوا یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ تمام قوتیں جو نظام عالم میں کام کر رہی ہیں، اُسی کے زیر حکم ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے، یا اس کے اذن کے بغیر اپنے اختیار سے کوئی حرکت کرے۔ اس ہمہ گیر سسٹم کے اندر کسی کی خود مختاری (Independence) اور غیر ذمہ داری (Irresponsibility) کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرۃً ہو سکتی ہے۔

انسان یہاں پیدائشی رعیت (Born subject) ہے، رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اسکے امکان میں نہیں ہے، لہٰذا یہ خود اپنے لیے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

یہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے کہ اپنی ملک میں تصرف کرنے کا ضابطہ خود بنائے۔ اس کا جسم اور اس کی ساری قوتیں اللہ کی ملک اور اُس کی عطیہ ہیں، لہٰذا یہ اُن کو خود اپنے منشاء کے مطابق استعمال کرنے کا حق دار نہیں ہے، بلکہ جس نے یہ چیزیں اسکو عطا کی ہیں اُسی کی مرضی کے مطابق اسے اُنکو استعمال کرنا چاہیے۔

اسی طرح جو اشیاء اس کے گرد و پیش دنیا میں پائی جاتی ہیں، زمین، جانور، پانی، نباتات، معدنیات وغیرہ، یہ سب اللہ کی ملک ہیں، انسان انکا مالک نہیں ہے، لہٰذا انسان کو ان پر بھی اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اسے انکے ساتھ اُس قانون کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے جو اصل مالک نے مقرر کیا ہے۔

اسی طرح وہ تمام انسان بھی جو زمین پر بستے ہیں، اور جنکی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے

اللہ کی رعیت ہیں۔ لہٰذا انکو اپنے باہمی تعلقات کے بارے میں خود اصول اور ضابطے مقرر کرنیکا حق نہیں ہے۔ اُنکے جملہ تعلقات خدا کے بنائے ہوئے قانون پر مبنی ہونے چاہئیں۔

رہی یہ بات کہ وہ خدا کا قانون کیا ہے؟ تو پیغمبر یہ کہتے ہیں کہ جس ذریعۂ علم کی بنا پر ہم تمہیں دُنیا کی اور خود تمہاری یہ حقیقت بتا رہے ہیں، اُسی ذریعۂ علم سے ہم کو خدا کا قانون بھی معلوم ہوا ہے۔ خدا نے خود ہم کو یہ علم دیا ہے اور ہمکو اس بات پر مامور کیا ہے کہ یہ علم تم تک پہنچا دیں۔ لہٰذا تم ہم پر اعتماد کرو۔ ہمیں اپنے بادشاہ کا نمائندہ تسلیم کرو۔ اور ہم سے اس کا مستند قانون لو۔

پھر پیغمبر ہم سے کہتے ہیں کہ یہ جو تم بظاہر دیکھتے ہو کہ سلطنت عالم کا سارا کاروبار ایک نظم کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے نہ اُسکے کارپرداز کام کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور یہ جو تم ایک طرح کی خود مختاری اپنے اندر محسوس کرتے ہو کہ جس طرح چاہو کام کرو، مالکانہ روش بھی اختیار کر سکتے ہو، اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں سر جھکا سکتے ہو، ہر صورت میں تم کو رزق ملتا ہے، وسائل کار بہم پہنچتے ہیں، اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی، یہ سب دراصل تمہاری آزمائش کے لیے ہے۔ چونکہ تم کو عقل، قوت مشاہدہ، قوت استنباط، اور قوت انتخاب دی گئی ہے، اس لیے مالک نے اپنے آپکو اور اپنے نظام سلطنت کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم اپنی ان قوتوں سے کس طرح کام لیتے ہو۔ اس نے تم کو انتخاب کی آزادی (Freedom of choice) دی ہے اور سمجھ بوجھ عطا کی ہے۔ اگر تم اپنی رعیت ہونے کی حیثیت کو سمجھو، اور برضا و رغبت اس حیثیت کو اختیار کرو، بغیر اسکے کہ تم پر اس حیثیت میں رہنے کے لیے کوئی جبر ہو، تو اپنے مالک کی آزمائش میں کامیاب ہو گے۔ اور اگر رعیت ہونے کی حیثیت کو نہ سمجھو، یا سمجھنے کے باوجود باغیانہ روش اختیار کرو تو امتحان میں ناکام ہو جاؤ گے۔ اسی امتحان کی غرض سے تم کو دنیا میں کچھ اختیارات دیے گئے ہیں۔ دنیا کی بہت سی چیزیں تمہارے قبضہ قدرت میں دی

گئی ہیں، اور تم کو عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے۔

اسکے بعد پیغمبر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ دنیوی زندگی چونکہ امتحان کی مہلت ہے لہٰذا یہاں نہ حساب ہے، نہ جزا نہ سزا[1]۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عمل نیک کا انعام نہیں ہے۔ وہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ درست ہے۔ بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے۔ مال، دولت، اولاد، خدام، حکومت، اسباب زندگی، یہ سب چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں تاکہ تم ان پر کام کرکے دکھاؤ اور اپنی اچھی یا بری قابلیتوں کا اظہار کرو۔ اسی طرح جو تکلیفیں، نقصانات، مصائب وغیرہ آتے ہیں وہ بھی کسی عمل بد کی سزا نہیں ہیں

[1] اس سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ عالم جس میں ہم اس وقت ہیں دراصل عالم طبیعی ہے نہ کہ عالم اخلاقی۔ جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں ہیں بلکہ طبیعی قوانین ہیں۔ اسلیے موجودہ نظام کائنات میں اعمال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر مترتب ہو سکتے ہیں تو صرف اُسی حد تک جس حد تک کہ قوانین طبیعی ان کو مترتب ہونے کا موقع دیں، ورنہ جہاں قوانین طبیعی ان کے ظہور کے لیے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر ہونا محال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس فعل کے اخلاقی نتیجہ کا مترتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانین طبیعی اُس کا سراغ لگنے اور اسکے اوپر جرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ ہونے میں مددگار ہوں۔ اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے سے مترتب ہوگا ہی نہیں۔ اور اگر وہ سازگاری کریں بھی، تب بھی اس فعل کے پورے اخلاقی نتائج مرتب نہ ہو سکینگے، کیونکہ مقتول کے عوض قاتل کا محض قتل کر دیا جانا اُس فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا اس نے ارتکاب کیا تھا۔ اسی لیے یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی۔ دارالجزا ہونے کے لیے ایک ایسا نظام عالم درکار ہے جس میں موجودہ نظام عالم کے برعکس حکمراں قوانین قوانینِ اخلاقی ہوں اور قوانین طبیعی محض انکے خادم کی حیثیت رکھتے ہوں۔

بلکہ ان میں سے بعض قانون فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں[۱]، اور بعض آزمائش کے ذیل میں آتے ہیں[۲]، اور بعض اس وجہ سے پیش آتے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قائم کرکے جب تم ایک رویہ اختیار کرتے ہو تو لامحالہ تم کو چوٹ لگتی ہے[۳]۔ بہرحال یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے بلکہ دارالامتحان ہے۔ یہاں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، قابلِ اخذ، یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ مہلت کی زندگی ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں تمہارے پورے کارنامے کو جانچ کر فیصلہ کیا جائیگا کہ تم امتحان میں کامیاب ہوئے ہو یا ناکام۔ اور وہاں جس چیز پر کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً تم نے اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالےٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اسکی طرف سے آئی ہوئی تعلیم و ہدایت کے من جانب اللہ ہونے کو پہچانا یا نہیں، اور ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد آزادی انتخاب رکھنے کے باوجود تم نے اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے حکم شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا یا نہیں۔

---

[۱] مثلاً زنا کرنے والے کا بیماری میں مبتلا ہونا، کہ یہ اس گناہ کی اخلاقی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا طبیعی نتیجہ ہے۔ اگر وہ علاج کرنے میں کامیاب ہو جائے تو بیماری سے بچ جائیگا مگر اخلاقی سزا سے نہ بچے گا۔ اگر توبہ کرے تو اخلاقی سزا سے بچ جائیگا مگر بیماری دور نہ ہوگی۔

[۲] مثلاً کسی شخص کا افلاس میں مبتلا ہونا اسکے حق میں اس امر کی آزمائش ہے کہ وہ اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے یا جائز وسائل سے ہی کام لینے پر ثابت قدم رہتا ہے، اور مصائب کے ہجوم میں حق پرستی پر قائم رہتا ہے یا مضطر ہو کر باطل کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔

[۳] مثلاً جب انسان اس دنیا کو بے خدا اور اپنے آپکو خود مختار سمجھ کر کام کرتا ہے تو چونکہ فی الواقع نہ دنیا بے خدا ہے اور نہ انسان خود مختار، اسلیے امر واقعی کے خلاف عمل کرنیکی وجہ سے وہ لامحالہ چوٹ کھاتا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے آگ کو کھلونا سمجھ کر آپ ہاتھ میں پکڑ لیں تو ہاتھ جل جائیگا کیونکہ آپنے امر واقعی کے خلاف رویہ اختیار کیا۔

نظریۂ اسلامی کی تنقید

دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو پیغمبروں نے پیش کیا ہے ایک مکمل نظریہ ہے۔ اسکے تمام اجزاء میں ایک منطقی ربط ہے۔ کوئی جزء دوسرے جزء سے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعات عالم کی پوری توجیہ اور تمام آثار کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز بھی مشاہدہ یا تجربہ میں ایسی نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریہ سے نہ کی جاسکتی ہو۔ لہٰذا یہ علمی نظریہ (Scientiffc theory) کی تعریف میں آتا ہے۔ پھر کوئی مشاہدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے یہ نظریہ ٹوٹ جاتا ہو۔ لہذا یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ٹوٹے ہوئے نظریات میں اسکو شمار نہیں کیا جاسکتا۔

پھر نظام عالم کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اُس سے یہ نظریہ نہایت اغلب (Most probable) نظر آتا ہے۔ کائنات میں جو زبردست تنظیم پائی جاتی ہے اُسکو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرینِ دانش ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے، بہ نسبت اسکے کہ کوئی ناظم نہیں ہے۔ اسی طرح اس تنظیم کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مرکزی نظام ہے اور ایک ہی مختار کُل اس کا ناظم ہے، بہ نسبت اسکے کہ یہ لامرکزی نظام ہے اور بہت سے ناظموں کے ماتحت چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علانیہ محسوس ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور بامقصد نظام ہے، بہ نسبت اسکے کہ یہ بے مقصد ہے اور محض ایک بچے کا کھیل ہے۔

پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظام کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جز ہے تو یہ بات ہم کو سراسر معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معقول (Most reasonable) نظریہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں تو یہ بالکل ایک قابلِ عمل (Practicable) نظریہ

ہے۔ زندگی کی ایک پوری اسکیم اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریہ پر مبنی ہے۔ فلسفہ اور اخلاق کے لیے، علوم و فنون کے لیے، ادب اور ہنر کے لیے، تمدن و معاشرت کے لیے، معیشت اور کاروبار کے لیے، سیاست اور انتظامِ مملکت کے لیے، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے لیے، غرض زندگی کے ہر پہلو اور ہر ضرورت کے لیے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شعبۂ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے کے لیے اس نظریہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اب ہمیں صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ اس نظریہ سے دنیا کی زندگی میں کس قسم کا رویہ بنتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

انفرادی زندگی میں یہ نظریہ دوسرے جاہلی نظریات کے برعکس ایک نہایت ذمہ دارانہ اور نہایت منضبط (Well-disciplined) رویہ پیدا کرتا ہے۔ اس نظریہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے جسم اور اسکی طاقتوں کو اور دنیا اور اسکی کسی چیز کو بھی اپنی ملک سمجھ کر خود مختارانہ استعمال نہ کرے بلکہ خدا کی ملک سمجھ کر صرف اُسکے قانون کی پابندی میں استعمال کرے۔ ہر چیز کو جو اسے حاصل ہے خدا کی امانت سمجھے اور یہ سمجھتے ہوئے اس میں تصرف کرے کہ مجھے اس امانت کا پورا حساب دینا ہے، اور حساب بھی اسکو دینا ہے جسکی نظر سے میرا کوئی فعل بلکہ کوئی دل میں چھپا ہوا ارادہ تک پوشیدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہر حال میں ایک ضابطہ کا پابند ہوگا۔ وہ خواہشات کی بندگی میں کبھی شتر بے مہار نہیں بن سکتا۔ وہ ظالم اور خائن نہیں ہو سکتا۔ اُسکی سیرت پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ضابطہ کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے نفس میں ایک زبردست اخلاقی انضباط پیدا ہو جاتا ہے جو اُسے اُن مواقع پر بھی راستی اور حق پر قائم رکھتا ہے جہاں اُسے کسی دنیوی طاقت کی بازپرس کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ خدا کا خوف اور امانت کا احساس وہ چیز ہے جس سے بڑھ کر سوسائٹی کو قابلِ اعتماد افراد فراہم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ تصور میں نہیں آسکتا۔

مزید برآں یہ نظریہ آدمی کو نہ صرف سعی و جہد کا آدمی بناتا ہے بلکہ اسکی سعی و جہد کو خود غرضی، نفس پرستی، یا قوم پرستی کے بجائے حق پرستی اور بلند تر اخلاقی مقاصد کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے متعلق یہ رائے رکھتا ہو کہ میں دنیا میں بے کار نہیں آیا ہوں بلکہ خدا نے مجھے کام کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے، اور میری زندگی اپنے لیے یا اپنے دوسرے متعلقین کے لیے نہیں ہے بلکہ اُس کام کے لیے ہے جس میں خدا کی رضا ہو، اور میں یونہی چھوڑا نہ جاؤنگا بلکہ مجھ سے پورا حساب لیا جائیگا کہ میں نے اپنے وقت کا اور اپنی قوتوں کا کتنا اور کس طرح استعمال کیا، ایسے شخص سے زیادہ کوشش کرنے والا اور نتیجہ خیز اور صحیح کوشش کرنے والا آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ نظریہ ایسے بہتر افراد پیدا کرتا ہے کہ ان سے بہتر انفرادی رویہ کا تصور کرنا مشکل ہے۔

اب اجتماعی پہلو میں دیکھیے۔

سب سے پہلے تو یہ نظریہ انسانی اجتماع کی بنیاد بدل دیتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تمام انسان خدا کی رعیت ہیں۔ رعیت ہونے کی حیثیت سے سب کے حقوق یکساں، سب کی حیثیت یکساں، اور سب کے لیے مواقع یکساں۔ کسی شخص، کسی خاندان، کسی طبقہ، کسی قوم، کسی نسل کے لیے دوسرے انسانوں پر کسی قسم کی برتری و فوقیت ہے نہ امتیازی حقوق۔ اس طرح انسان پر انسان کی حاکمیت اور فضیلت کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور وہ تمام خرابیاں یک لخت دور ہو جاتی ہیں جو بادشاہی، جاگیرداری، نوابی (Aristocracy) اور برہمنیت و پاپائیت سے پیدا ہوتی ہیں۔

پھر یہ چیز قبائلی، قومی، نسلی، جغرافی اور لونی تعصبات کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے جنکی بدولت دنیا میں سب سے زیادہ خوں ریزیاں ہوئی ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے تمام روئے زمین خدا کا ملک ہے، تمام انسان آدم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں، اور فضیلت کی بنیاد نسل و نسب، مال و دولت یا رنگ کی سپیدی و سرخی پر نہیں بلکہ اخلاق کی پاکیزگی اور خدا کے خوف پر ہے۔ جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے

والا اور صلاح و تقوی پر عمل کرنے والا ہے وہی سب سے افضل ہے۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان اجتماعی ربط و تعلق یا فرق و امتیاز کی بنا بھی اس نظریہ میں کلیتہً تبدیل کر دی گئی ہے۔ انسان نے اپنی ایجاد سے جن چیزوں کو اجتماع و افتراق کی بنا ٹھیرایا ہے وہ انسانیت کو بے شمار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور ان حصوں کے درمیان ناقابلِ عبور دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں کیونکہ نسل، یا وطن، یا قومیت یا رنگ وہ چیزیں نہیں ہیں جنکو آدمی تبدیل کر سکتا ہو اور ایک گروہ میں سے دوسرے گروہ میں جا سکتا ہو۔ برعکس اسکے یہ نظریہ انسان اور انسان کے درمیان اجتماع و افتراق کی بنا خدا کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی پر رکھتا ہے۔ جو لوگ مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کر لیں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا واحد قانون تسلیم کر لیں وہ سب ایک جماعت ہیں، اور جو ایسا نہ کریں وہ دوسری جماعت۔ اس طرح تمام اختلافات مٹ کر صرف ایک اختلاف باقی رہ جاتا ہے اور وہ اختلاف بھی قابل عبور ہے۔ کیونکہ ہر وقت ایک شخص کے لیے ممکن ہے کہ اپنا عقیدہ اور طرز زندگی بدل دے اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلا جائے۔

ان تمام بنیادی اصلاحات کے بعد جو سوسائٹی اس نظریہ پر بنتی ہے اُسکی ذہنیت، اسپرٹ اور اجتماعی تعمیر (Social structure) بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں اسٹیٹ انسان کی حاکمیت پر نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت پر مبنی ہے۔ حکومت خدا کی ہوتی ہے، قانون خدا کا ہوتا ہے، اور انسان صرف خدا کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ چیز اول تو ان ساری خرابیوں کو دور کر دیتی ہے جو انسان پر انسان کی حکومت اور انسان کی قانون سازی سے پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ایک عظیم الشان فرق جو اس نظریہ پر اسٹیٹ بننے سے واقع ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کے پورے نظام میں عبادت اور تقویٰ کی اسپرٹ پھیل جاتی ہے۔ راعی اور رعیت دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کی حکومت میں ہیں اور ہمارا معاملہ براہِ راست اُس خدا سے ہے جو عالم الغیب و الشہادہ ہے۔ ٹیکس دینے والا یہ سمجھ کر

ٹیکس دیتا ہے کہ وہ خدا کو ٹیکس دے رہا ہے، اور ٹیکس لینے والے اور اس ٹیکس کو خرچ کرنے والے یہ سمجھتے ہوئے کام کرتے ہیں کہ یہ مال خدا کا مال ہے اور ہم امین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی سے لے کر ایک جج اور گورنر تک ہر کارندۂ حکومت اپنی ڈیوٹی اُسی ذہنیت کے ساتھ انجام دیتا ہے جس ذہنیت کے ساتھ وہ نماز پڑھتا ہے۔ دونوں کام اسکے لیے یکساں عبادت ہیں۔ اور دونوں میں وہی ایک تقویٰ اور خشیت کی روح درکار ہے۔ باشندے اپنے اندر سے جن لوگوں کو خدا کی نیابت کا کام انجام دینے کے لیے چنتے ہیں اُن میں سب سے پہلے جو صفت تلاش کی جاتی ہے وہ خوفِ خدا اور امانت و صداقت کی صفت ہے۔ اس طرح سطح پر وہ لوگ اُبھر کر آتے ہیں اور اختیارات اُنکے ہاتھوں میں دیے جاتے ہیں جو سوسائٹی میں سب سے بہتر اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔

تمدن و معاشرت میں بھی یہ نظریہ وہی تقویٰ اور طہارت اخلاق کی اسپرٹ پھیلا دیتا ہے۔ اس میں نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی ہوتی ہے، ہر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خدا کا واسطہ حائل ہوتا ہے، اور خدا کا قانون دونوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یہ قانون چونکہ اس نے بنایا ہے جو تمام نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض سے پاک ہے، اور علیم و حکیم بھی ہے، اس لیے اس میں فتنے کا ہر دروازہ اور ظلم کا ہر راستہ بند کیا گیا ہے اور انسانی فطرت کے ہر پہلو اور اسکی ہر ضرورت کی رعایت کی گئی ہے۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ میں اُس پوری اجتماعی عمارت کا نقشہ پیش کروں جو اس نظریہ پر بنتی ہے۔ مگر جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اُس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبروں نے جو نظریہ کائنات و انسان پیش کیا ہے وہ کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہیں کہ یہ محض کاغذ پر ایک خیالی نقشہ (Utopia) ہو، بلکہ تاریخ میں اس نظریہ پر ایک اجتماعی نظام اور ایک اسٹیٹ بنا کر دکھایا جا چکا ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ جیسے

افراد اس نظریہ پر تیار کیے گئے تھے نہ اُن سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے اور نہ اُس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا۔ اس کے افراد میں اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک صحرائی عورت کو زنا سے حمل ہو جاتا ہے، وہ جانتی ہے کہ میرے لیے اس جرم کی سزا سنگساری جیسی ہولناک سزا ہے، مگر وہ خود چل کر آتی ہے، اور درخواست کرتی ہے کہ اس پر سزا نافذ کی جائے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وضع حمل کے بعد آئیو اور بغیر کسی مچلکہ وضمانت کے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وضع حمل کے بعد وہ پھر صحرا سے آتی ہے اور سزا دیئے جانے کی درخواست کرتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ بچہ کو دودھ پلا اور جب دودھ پلانے کی مدت ختم ہو جائے تب آیئو۔ پھر وہ صحرا کی طرف واپس چلی جاتی ہے، اور کوئی پولیس کی نگرانی اس پر نہیں ہوتی۔ رضاعت کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ پھر آکر التجا کرتی ہے کہ اب اسے سزا دے کر اُس گناہ سے پاک کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہو چکا ہے۔ چنانچہ اُسے سنگسار کیا جاتا ہے، اور جب وہ مرجاتی ہے تو اُس کے لیے دعائے رحمت کی جاتی ہے، اور جب ایک شخص کی زبان سے اس کے حق میں اتفاقاً یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ کیسی بے حیا عورت تھی تو جواب میں فرمایا جاتا ہے کہ خدا کی قسم اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔ یہ تو اس سوسائٹی کے افراد کا حال تھا۔ اور اس اسٹیٹ کا حال یہ تھا کہ جس حکومت کی آمدنی کروڑوں روپے تک پہنچی ہوئی تھی، اور جس کے خزانے ایران و شام و مصر کی دولت سے معمور ہو رہے تھے اس کا صدر صرف ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ تنخواہ لیتا تھا اور اس کے شہریوں میں ڈھونڈے سے بھی بمشکل کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خیرات لینے کا مستحق ہو۔

اس تجربہ کے بعد بھی اگر کسی شخص کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ انبیاء نے نظام کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ حق ہے تو ایسے شخص کے اطمینان کے

سے کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے، کیونکہ خدا اور فرشتوں اور آخرت کی زندگی کا براہِ راست عینی مشاہدہ تو اسے بہرحال حاصل نہیں ہو سکتا۔ جہاں مشاہدہ ممکن نہ ہو وہاں تجربہ سے بڑھ کر صحت کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک طبیب بیمار کے اندر مشاہدہ کر کے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فی الواقع سسٹم میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے تو وہ مختلف دوائیں دے کر دیکھتا ہے۔ اور جو دوا اس اندھیری کوٹھڑی میں ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھتی ہے اُس کا مرض کو دور کر دینا ہی اس بات پر قطعی دلیل ہوتا ہے کہ سسٹم میں فی الواقع جو خرابی تھی یہ دوا اُسکے عین مطابق تھی۔ اسی طرح جب انسانی زندگی کی کل کسی دوسرے نظریہ سے درست نہیں ہوتی اور صرف انبیاء کے نظریہ ہی سے درست ہوتی ہے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ حقیقت کے مطابق ہے، فی الواقع یہ کائنات اللہ کی سلطنت ہی ہے اور واقعی اس زندگی کے بعد ایک زندگی ہے جس میں انسان کو اپنے کارنامۂ حیاتِ دنیوی کا حساب دینا ہے۔

ضرورت مترجمین

عربی۔ فارسی۔ انگریزی سے براہِ راست شستہ و رفتہ سلیس اردو میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ جو مناسب اجرت پر علمی ادبی تاریخی نیز متفرق علوم و فنون کی کتابوں اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کر سکیں۔ کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے۔ علمی قابلیت نیز تجربہ کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے

پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں:

شباب۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۲۶ بمبئی نمبر ۳

سرورِ عالم

[یہ تقریر ۱۰ اپریل ۱۹۴۱ء کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے یہاں نقل کی جاتی ہے]

ہم مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اس کا مطلب ہے "دنیا کا سردار"۔ ہندی میں اسکا ترجمہ "جگت گرو" ہوگا اور انگریزی میں (Leader of the world) بظاہر یہ بہت بڑا خطاب ہے، مگر جس بلند پایہ ہستی کو یہ خطاب دیا گیا ہے اُس کا کارنامہ واقعی ایسا ہے کہ اُس کو سرورِ عالم کہنا مبالغہ نہیں عین حقیقت ہے۔

دیکھیے! کسی شخص کو دنیا کا لیڈر کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اُس نے کسی خاص قوم، یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو۔ ایک محب وطن یا ایک قوم پرست لیڈر کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیں قدر کریں کہ اُس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی، لیکن اگر آپ اسکے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں تو وہ آپکا لیڈر بہرحال نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کی محبت، خیرخواہی اور کارگزاری سب کچھ چین یا ہسپانیہ تک محدود ہو، مجھ ہندوستانی کو اس سے کیا تعلق کہ میں اسے اپنا لیڈر مانوں؟ بلکہ اگر وہ اپنی قوم کو دوسروں سے افضل ٹھیراتا ہو اور دوسروں کو گرا کر اپنی قوم کو چڑھانا چاہتا ہو تو میں اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں۔ ساری قوموں کے انسان کسی ایک شخص کو اپنا لیڈر صرف اسی صورت میں مان سکتے ہیں جبکہ اسکی نگاہ میں سب قومیں اور سب آدمی یکساں ہوں، وہ سب کا یکساں خیرخواہ ہو، اور اپنی خیرخواہی میں کسی ملت ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔

دوسری اہم شرط جو دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایسے اصول پیش کیے ہوں جو تمام دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوں۔ جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو۔ لیڈر کے معنی ہی رہنما کے ہیں۔ لیڈر کی ضرورت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ وہ فلاح اور بہتری کا راستہ بتائے۔ لہٰذا دنیا کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کے انسانوں کو ایسا طریقہ بتائے جس میں سب کی فلاح ہو۔

تیسری لازمی شرط دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے یہ ہے کہ اسکی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہ ہو بلکہ ہر زمانے اور ہر حال میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور یکساں قابلِ پیروی ہو۔ جس لیڈر کی رہنمائی ایک زمانہ میں کارآمد اور دوسرے زمانہ میں بیکار ہو اسکو دنیا کا لیڈر نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کا لیڈر تو وہی ہے کہ دنیا جب تک قائم رہے اسکی رہنمائی بھی کارآمد رہے۔

چوتھی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس نے صرف اصول پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کی ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھایا ہو اور انکی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کر دی ہو۔ محض اصول پیش کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر (Thinker) ہو سکتا ہے، لیڈر نہیں ہو سکتا۔ لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اصولوں کو عمل میں لا کر دکھائے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ یہ چاروں شرطیں اس ہستی میں کہاں تک پائی جاتی ہیں جس کو ہم "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔

پہلی شرط کو پہلے لیجیے۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک ہی نظر میں محسوس کر لینگے کہ یہ کسی قوم پرست یا محب وطن کی زندگی نہیں ہے بلکہ ایک محب انسانیت اور ایک عالمگیر نظریہ رکھنے والے انسان کی زندگی ہے۔ اُن کی نگاہ میں تمام انسان یکساں تھے۔ کسی خاندان کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل، یا کسی ملک کے خاص مفاد سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ امیر اور غریب

اونچ اور نیچ، کالے اور گورے، عرب اور غیر عرب، مشرقی اور مغربی، سامی اور آرین، سب کو وہ اس حیثیت سے دیکھتے تھے کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ اُنکی زبان سے تمام عمر کوئی ایک لفظ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلا، اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انہوں نے ایسا کیا جس سے یہ شبہ کیا جاسکتا ہو کہ انہیں ایک طبقۂ انسانی کے مقابلہ میں دوسرے طبقۂ انسانی کے مفاد سے زیادہ تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی زندگی ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری اور اسرائیلی اُسی طرح اُنکے رفیق کار بنے جس طرح عرب، اور اُنکے بعد زمین کے ہر گوشے میں ہر نسل اور ہر قوم کے انسانوں نے اُنکو اُسی طرح اپنا رہنما تسلیم کیا جس طرح خود اُنکی اپنی قوم نے۔ یہ اسی خالص انسانیت ہی کا کرشمہ تو ہے کہ آج آپ ایک ہندوستانی کی زبان سے اُس شخص کی تعریف سُن رہے ہیں جو صدیوں پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا۔

اب دوسری اور تیسری شرط کو ایک ساتھ لیجیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص قوموں اور مخصوص ملکوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی پوری قوت دنیا میں انسانیت کے اُس بڑے مسئلے کو حل کرنے پر صرف کردی جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑا مسئلہ کیا ہے؟ وہ صرف یہ ہے کہ کائنات کا نظام فی الواقع جس اصول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اُسکے مطابق ہو، کیونکہ انسان اس کائنات کا ایک جزء ہے اور جزء کی حرکت کا کُل کے خلاف ہونا ہی خرابی کا موجب ہے۔ اگر آپ اس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اسکی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی نگاہ کو ذرا کوشش کرکے زمان اور مکان کی قیود سے آزاد کر لیجیے اور پورے کرۂ زمین پر اس طرح نظر ڈالیے کہ ابتدا سے آج تک اور آئندہ غیر محدود زمانہ تک بسنے والے تمام انسان بیک وقت آپکے سامنے ہوں۔ پھر دیکھیے کہ انسان کی زندگی میں خرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوئی ہیں یا ہونی ممکن ہیں اُن سب کی جڑ کیا ہے یا کیا ہو سکتی ہے۔ اس سوال پر آپ جتنا غور کرینگے، جتنی چھان بین اور تحقیق کرینگے، حاصل یہی نکلے گا کہ انسان کی خدا سے بغاوت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسلیے کہ خدا سے

باغی ہو کر انسان لازمی طور پر دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا ہے: یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھ کر من مانی کارروائیاں کرنے لگتا ہے اور یہ چیز اُسے ظالم بنا دیتی ہے، یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے اور اس سے دنیا میں فساد کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ خدا سے بے پروا ہو کر یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لیے اس کا نتیجہ برا نکلتا ہے۔ یہ ساری کائنات فی الواقع خدا کی سلطنت ہے۔ زمین، سورج، چاند، ہوا، پانی اور روشنی سب خدا کی ملک ہیں۔ اور انسان اس سلطنت میں پیدائشی بندے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پوری سلطنت جس نظام پر قائم ہے اور جس نظام پر چل رہی ہے، اگر انسان اسکا ایک جزء ہونے کے باوجود اس سے مختلف رویہ اختیار کرے تو لامحالہ اس کا ایسا رویہ تباہ کن نتائج ہی پیدا کریگا۔ اس کا یہ سمجھنا کہ مجھ سے اوپر کوئی مقتدر اعلیٰ نہیں ہے جسکے سامنے میں جواب دہ ہوں، واقعہ کے خلاف ہے اسلیے جب وہ خود مختار بن کر غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کام کرتا ہے اور اپنا قانون زندگی آپ تجویز کرتا ہے تو نتیجہ برا نکلتا ہے۔ اسی طرح اُس کا خدا کے سوا کسی اور کو صاحب اختیار و اقتدار ماننا اور اس سے خوف یا لالچ رکھنا اور اسکی آقائی کے آگے جھک جانا بھی حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ فی الحقیقت اس پوری کائنات میں خدا کے سوا کوئی بھی یہ حیثیت نہیں رکھتا، لہذا اس کا نتیجہ بھی برا ہی نکلتا ہے۔ صحیح نتیجہ برآمد ہونے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ زمین اور آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے، انسان اسکے سامنے سر جھکا دے، اپنی خودی و خودسری کو اُسکے آگے تسلیم کر دے، اپنی اطاعت اور بندگی کو اسکے لیے خالص کر دے، اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بنانے یا دوسروں سے لینے کے بجائے اُس سے لے۔

یہ بنیادی اصلاح کی تجویز ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے لیے پیش کی ہے۔

یہ مشرق اور مغرب کی قید سے آزاد ہے۔ روئے زمین میں جہاں جہاں انسان آباد ہیں یہی ایک اصلاحی تجویز انکی زندگی کی بگڑی ہوئی کل کو درست کر سکتی ہے۔ اور یہ ماضی و مستقبل کی قید سے بھی آزاد ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے یہ جتنی صحیح اور کارگر تھی اُتنی ہی آج بھی ہے اور اتنی ہی دس ہزار برس بعد بھی ہوگی۔

اب آخری شرط باقی رہ جاتی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس نقشہ پر ایک زندہ سوسائیٹی پیدا کرکے دکھا دی۔ انہوں نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدا کی حکومت کے آگے سر اطاعت جھکانے پر آمادہ کر لیا، اُن سے خود پرستی بھی چھڑوائی اور خدا کے سوا دوسروں کی بندگی بھی، پھر اُنکو جمع کرکے خالص خدا کی بندگی پر ایک نیا نظام اخلاق، نیا نظام تمدن، نیا نظام معیشت، اور نیا نظام حکومت بنایا، اور تمام دنیا کے سامنے اس بات کا عملی مظاہرہ کر دیا کہ جو اصول وہ پیش کر رہے ہیں اس پر کیسی زندگی بنتی ہے اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی اچھی، کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح ہے۔

یہ وہ کارنامہ ہے جسکی بنا پر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرور عالم یا دنیا کا لیڈر کہتے ہیں۔ اُن کا یہ کام کسی خاص قوم کے لیے نہ تھا، تمام انسانوں کے لیے تھا۔ یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے جس پر کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں ہے۔ جو چاہے اس میراث سے فائدہ اٹھائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسکے خلاف کسی کو تعصب رکھنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

ہماری ایجنسی!

لکھنؤ میں ہماری ایجنسی احترام اینڈ سنز جنرل مرچنٹس کے پاس ہے۔

اہل لکھنؤ کو ہماری جو مطبوعات درکار ہوں۔ وہ ایجنسی سے طلب کر سکتے ہیں۔

(مینیجر)

اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عالم

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی

ریاست (state) ایک مخصوص قسم کی ہیئت اجتماعیہ کا نام ہے۔ ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنیکی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی صورت حیوانیت کے طبعی ارتقار کی ایک منزل ہے۔ جس طرح متعفن اشیار میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، جس طرح آب و گل اور تخم کے اجتماع سے خود رو پودے پیدا ہو جاتے ہیں اور جس طرح تیز و تند ہواؤں کے عمل سے ریگستانوں میں ریگ کے ٹیلے بنجاتے ہیں، اسی طرح زمانہ کے آغوش میں محض جذبات حیوانی اور ماحول کے مقتضار سے مختلف اور متفرق افراد انسانی میں ایک ہیئتہ اجتماعیہ پیدا ہو جاتی ہے جسکو وہ اپنی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی ہیئت اجتماعیہ میں بعض خصوصیات کا اضافہ کرکے اسکو ریاست کا نام دیدیا جاتا ہے۔ لیکن پیدا ہوتی ہے یہ اسی حیوانیت سے جس سے ایسی قوموں کے کل حرکات و سکنات ناشی ہوتے ہیں۔ ایسی قومیں اگر بھیڑوں سے جمہوریت کی تعلیم حاصل کرتی ہیں تو بھیڑیوں سے آمریت کا سبق سیکھتی ہیں۔ انکے علم و عمل دونوں کا ذریعہ ماحول، زمانہ، جذبات اور خواہشوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

راحت و فلاح، قیام و بقار ایسی جماعتوں اور قوموں کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتی۔ انکی زندگی انکے لیے موت سے تلخ تر ہوتی ہے اور انکی موت پر نہ آسمان روتا ہے نہ زمین کے آنسو نکلتے ہیں۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں وہ اپنے ہی اعمال کے ثمرہ کے طور پر موت و فنا کے قعر عمیق میں دھکیل دی جاتی ہیں۔ وہ زمانہ کے بحرِ خار میں بلبلوں کی طرح پیدا ہوتی ہیں اور اپنی مختصر عمر

پریشانی، حیرانی اور مصائب میں گذار کر ساحل سے سر ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہیں۔ نہ اُن کا کوئی مقصدِ حیات ہوتا ہے نہ مرامِ زندگی۔ نہ انکو اپنے نقطۂ آغاز کا علم ہوتا ہے نہ نقطۂ انجام کا۔ نہ وہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ	اُنکے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں ہیں
بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ	اُنکے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں ہیں
بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ	اُنکے پاس کان ہیں مگر وہ اُن سے سُنتے نہیں ہیں
بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ	وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

یورپ کے "ترقی یافتہ حیوانات"[1]، اُنکے سیاسی و اجتماعی تصورات اور اُنکے نتائج مثال کے لیے بہت کافی ہیں۔ ورنہ دراصل تو امت مسلمہ کے سوا ہر قوم، اور ریاست کے اسلامی تصور کے سوا ہر تصور اسی حیوانیت کی پیداوار ہوتا ہے۔ حال اور ماضی دونوں میں یہ چیز صاف صاف نظر آتی ہے اور عقل و تجربہ دونوں اس کی کھلی ہوئی شہادت دیتے ہیں کہ اجتماع و سیاست کے متعلق جتنے نظریات آج تک دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں اور جن پر دنیا نے عمل کیا ہے ان میں سے ایک بھی بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور راحت و طمانیت کا سبب نہیں بن سکا اور نہ بن سکتا ہے۔ جمہوریت ہو یا آمریت، سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، سب اسی حیوانیت اور بہیمیت کے مظاہر ہیں۔ انکی شکلیں مختلف ہیں مگر حقیقت سب کی ایک ہے یعنی خدائے بے نیاز سے بے نیازی و بغاوت اختیار کر کے اُس انسان کی حکومت قائم کرنا جسکی حقیقت ان اربابِ تحقیق کے نزدیک یہ ہے کہ وہ بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔

[1] یہ لقب خود اہلِ یورپ کا محبوب و پسندیدہ ہے اسلیے کہ انکے نزدیک انسان کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔

انسان کی فرمانروائی (Sovereignty) بنیاد ہے کل غیر اسلامی سیاسی تصورات و نظریات کی۔ یہ بنیاد اس قدر کمزور، مہمل، خلافِ عقل اور احمقانہ ہے کہ اسکے اوپر جو عمارت بھی تعمیر کی جائیگی وہ نہ صرف خود بہت جلد منہدم ہو جائیگی بلکہ تعمیر کرنے والوں کو بھی اپنے ملبہ میں ابدالآباد کے لیے دفن کر دیگی۔ چنانچہ آج یورپ کے ترقی یافتہ حیوانات میں حیوانیت و بہیمیت کا جو مقابلہ ہو رہا ہے اور جس طرح بنی آدم کے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے وہ طبعی نتیجہ ہے اسی انسانی حکومت حیوانی نظریہ حیات، اور غیر اسلامی طرزِ تمثیل کا۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ — خشکی اور تری میں فساد پھوٹ پڑا ہے لوگوں کے اپنے کرتوتوں سے۔

تہذیب مغرب کے شجرہ خبیثہ میں پھل آنے شروع ہو گئے ہیں۔ ان مہذب حیوانات کو یہ کڑوے پھل کھانے پڑینگے اور پیٹ بھر کر کھانے پڑینگے۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ لَآكِلُونَ مِنْ شَجَرٍ مِّن زَقُّومٍ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ — پھر اے تکذیب کرنے والے گمراہ لوگو! تم کو زقوم کھانا پڑے گا اور پیٹ بھر کر کھانا ہوگا۔

اس زقوم تلخ کا بیج تو تم نے ہی بویا تھا، اب اس کے پھل کھانے سے کیوں گھبراتے ہو؟ یہ سب اسی تہذیب کا نتیجہ ہے جسکو پھیلانے کے لیے تم نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کر دیا تھا۔ یہ سب اسی انسانی فرمانروائی ہی کا تو اثر ہے جس کا قائم کرنا تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ پھر اسکی تعمیر ہی اسکی تخریب کی ضامن ہے اور تم کو بھی آج تباہی میں اس کا ساتھ دینا چاہیے جس طرح زندگی میں اس کا ساتھ دیتے رہے ہو۔ فکیف آسیٰ علی قوم کافرین۔

خدا جانے یہ کہاں کا انصاف اور کس عقل کا اقتضا ہے کہ انسانوں کے ایک بہت بڑے

گروہ کو انہی کے مثل ایک انسان یا ایک چھوٹی سی انسانی جماعت کا محکوم بنا دیا جائے اور انسان کو انسان کا فرمانروا قرار دیدیا جائے؟ پھر عقل تو یہ بتاتی ہے کہ انسانی فہم قوانین کو سمجھ تو سکتی ہے، مگر انکو بنا نہیں سکتی۔ فہمِ قانون اور شے ہے اور وضع قانون بالکل ایک دوسری شے۔ خلاقِ عقول نے انسانی عقل کو یہ طاقت ہی نہیں عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے لیے یا دوسروں کے لیے قوانین وضع کر سکے۔ ہم نے تکرارِ مشاہدہ سے معلوم کیا کہ پانی گیہوں کے لیے مفید ہے۔ اس لیے ہم نے یہ قانون بنا لیا کہ گیہوں میں پانی دینا چاہیے۔ لیکن درحقیقت ہم نے کوئی قانون وضع نہیں کیا ہے بلکہ جو قانون قدرت تھا اُسے صرف دریافت کیا ہے۔ ان قوانین کی وضع پر انسان کا قادر نہ ہونا بالکل بدیہی چیز اور مسلمہ مسئلہ ہے۔

قانون کی دوسری قسم وہ ضوابط ہیں جو کسی فرد یا جماعت کے حق کو وجود میں لاتے ہیں یا اسکی حفاظت کرتے ہیں یا اسکو سلب کرتے ہیں۔ سیاسی مباحث میں لفظ قانون زیادہ تر اسی مفہوم میں مستعمل ہے۔ اس قسم کے قوانین کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کا وضع کرنا انسانی عقل کی قدرت سے باہر ہے۔ اس عدم قدرت سے ہماری یہ مراد ہے کہ چونکہ انسانی عقل کی طاقت انکو صحیح وضع کرنے سے قاصر ہے اسلیے اس قسم کے قوانین اگر بنائے جائینگے تو وہ یقیناً غلط ہونگے۔ یعنی انکی وضع کی حقیقی غرض و غایت ان سے ہرگز نہ پوری ہو سکے گی بلکہ وہ انسانوں کے لیے بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہونگے۔ اس مقصد کے اثبات کے لیے مندرجہ ذیل دلائل کافی ہیں:

(۱) سطورِ بالا میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قانون اُس ضابطہ کا نام ہے جو کسی فرد یا جماعت کے حق کو وجود میں لائے یا اسکی حفاظت کرے یا اسکو سلب کرے۔ قانون کی یہ تعریف بہت جامع و مانع ہے۔ اس تعریف پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع قانون کے لیے واضع کو

مندرجہ ذیل امور کا علم ضروری و لابدی ہے:

(۱) حق کا مفہوم (۲) مختلف اشخاص کی صحیح فطرت اور قوت تأثر کا علم تاکہ قانون کی تاثیرات کا صحیح اندازہ کیا جاسکے (۳) ان سب جزئیات کا علم جو قانون کے دائرۂ عمل میں آنے والے ہیں تاکہ انکے قدر مشترک کو صحیح طور پر قانون میں داخل کیا جاسکے۔

حق کا مفہوم کیا ہے؟ اسکی صحیح تعیین سے انسانی عقل اپنے عجز کا ثبوت دیچکی ہے ازمنۂ قدیمہ میں طاقت اور حق مترادف سمجھے جاتے تھے۔ جسکی لاٹھی اسکی بھینس پرانی مثل ہے اور آج بھی اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب اسکی تعبیر کے لیے مہذب اور شستہ الفاظ اختیار کر لیے گئے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرنیکے لیے صرف دو ہی راستے ملتے ہیں۔ ایک طبعی طریقہ دوسرا رسمی طریقہ۔ اگر ہم طبعی قوانین کو پیش نظر رکھ کر خالص سائنٹفک نقطۂ نظر سے حق کے مفہوم کو تلاش کرتے ہیں تو بقاء اصلح Survival of the fittest کا اصول ہماری رہنمائی کرتا ہے اور حق اور طاقت دونوں مترادف ٹھیرتے ہیں اور اگر رسم و رواج یا بقول آسٹن جماعت کے اخلاقی تصور کی روشنی میں اسکا چہرہ دیکھیں تو بھی جسکی لاٹھی اسکی بھینس ہی کی مثل حق کا عنوان نظر آتی ہے۔ (دیکھو جان آسٹن کی کتاب Jurisprudence)۔ بلکہ اس صورت میں چونکہ جماعت کا اخلاقی تصور ایک تغیر پذیر شے ہے اس لیے حق کا مفہوم اور بھی زیادہ غیر متعین ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ سوال کہ وہ کونسی شے ہے جسکی بنا پر کسی انسان کے دوسرے انسان کے افعال پر اثر انداز ہونے کو عقلاً جائز کہا جاسکتا ہے، اب تک ناقابل حل ہے اس لیے کہ اس کا صرف ایک جواب پیش کیا گیا ہے اور مادی طرز استنتاج سے صرف وہی جواب ہو سکتا ہے، یعنی "طاقت و قدرت"، مگر انسان کی عقل اور فطرت دونوں اس جواب کو صحیح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور دونوں اسکو غلط و گمراہ کن قرار دیتی ہیں۔ لہذا بالآخر یہ ماننا پڑیگا کہ یہ سوال ابھی تک

لایخل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ڈاکوؤں کا گروہ جو سلب و نہب کی طاقت رکھتا ہے، محض طاقت کی بنا پر اسکے ان افعال کو کوئی عاقل جائز نہیں قرار دے سکتا۔

رہا ان سب اشخاص کی صحیح فطرت اور جہت تاثر کا علم اور ان کل جزئیات کا علم جو قانون کے تحت میں داخل ہونے والی ہیں تو یہ اور بھی ناممکن ہے۔ اولاً اس لیے کہ اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے، اور دوسرے کے اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ استقرار ہے جو علم و یقین نہیں پیدا کر سکتا۔ ثانیاً اس لیے کہ انسان احوال کا غلام ہوتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی فطرت کو اپنی ہی فطرت پر قیاس کر لیتا ہے اور علیٰ ہذا اسکے سامنے جو افراد و جزئیات موجود ہوتے ہیں انہیں پر آئندہ جزئیات کو قیاس کر لیتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ساخت کے تمام قوانین اسی قسم کی کمزوریوں سے لبریز ہیں۔ اور نہ صرف انکی جامعیت معرض زوال میں ہے بلکہ انکی افادیت بھی غیر متعین ہے۔

الغرض وضع قانون کے لیے جن چیزوں کا علم ضروری و لابدی ہے ان میں سے ایک کا علم بھی انسان نہیں حاصل کر سکتا جسکا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ وہ قانون وضع کرنے سے قاصر ہے۔

(۲) قانون کی جو تعریف بھی کیجیے ہر صورت میں یہ ماننا پڑیگا کہ قانون ایک ایسے اصول کا نام ہے جو انسان کے خیالات، اخلاق یا اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے صرف یہی تین اجزار ہیں، اس لیے جو قانون بھی وضع کیا جائیگا اسکا تعلق یا تو انسانی خیالات سے ہوگا یا اسکے اخلاق سے یا اسکے اعمال و افعال سے۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان خود متاثر ہوتا ہے اور اسدرجہ متاثر ہوتا ہے کہ بالکل انہی کے تابع رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ان اجزار زندگی کے لیے وہ خود کوئی قانون کسطرح وضع کر سکتا ہے؟ قانون وضع کرنیکے معنی تو یہی ہونگے کہ زندگی کے یہ اجزار مثلاً واضع قانون کے تابع ہوں، مگر جبکہ واضع قانون خود ان کا تابع ہے تو یہ اُس کے تابع

کیسے ہو سکتے ہیں؟ بنا بریں یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنے خیالات، اعمال، یا اخلاق، کے لیے کوئی قانون وضع کر سکے۔ دراصل جو چیز قانون کی شکل میں اسکے ذہن میں آتی ہے وہ ایک فطری اثر اور نتیجہ ہوتا ہے انہیں اجزا ثلثہ میں سے کسی گذشتہ یا موجودہ جزو کا یا کل اجزا کا۔

(۳) ایک انسان کو بدو طفولیت سے کسی ایسے مقام پر قید کر دیا جائے جہاں کسی دوسرے انسان کی صحبت اس کو میسر نہ ہو سکے اور تعلیم و تعلم کے کل ذرائع اس کے لیے مسدود کر دیئے جائیں ایسا آدمی جوان بلکہ بوڑھا ہو کر بھی قطعاً لایعقل اور جاہل محض رہیگا اور دوسروں کے لیے تو بڑی بات ہے اپنی انفرادی زندگی کے لیے بھی کوئی قانون وضع نہیں کر سکیگا۔ البتہ چند قوانین پر عمل پیرا ضرور ہوگا۔ ان قوانین میں سے بعض تو وہ ہونگے جن پر وہ جبلّی طور پر محض مجبورانہ عامل ہوگا مثلاً اشتہا کے وقت غذا کھانا، پیاس کے وقت پانی پی لینا، سردی و گرمی سے بچنے کا انتظام کرنا۔ اور بعض قوانین وہ ہونگے جو طبعی قوانین سے اس نے مستنبط کیے ہونگے۔ بہرحال وہ کوئی قانون وضع نہیں کر سکتا صرف استنباط کر سکتا ہے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی عقل کو فطرتاً یہ قوت نہیں دی گئی ہے کہ وہ کوئی قانون وضع کر سکے۔ البتہ استنباط قوانین کی قدرت اسکو عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کی تعلیم و تربیت جب کی جاتی ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ جب اسکو معلوم شدہ قوانین بتائے جاتے ہیں اور طبعی قوانین کی جانب اسکی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے تو وہ ان قوانین کو سیکھتا ہے اور اسکے ساتھ ہی ساتھ ان قوانین سے دوسرے قوانین مستنبط بھی کر لیتا ہے۔ اسی استنباط کو مدعیان عقل و دانش اپنی خوش فہمی سے وضع قانون سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسکی حقیقت محض استنباط ہے۔

واضح رہے کہ تعلیم و تربیت انسان کی فطری قوتوں کو نشو و نما تو دے سکتی ہے لیکن اس میں کوئی جدید قوت پیدا نہیں کر سکتی۔ اسلیے جب وضع قانون کی قوت انسان میں فطری طور پر

موجود ہی نہیں ہے تو تعلیم و تربیت کی بہتر سے بہتر صورت بھی اس میں اس قدرت کی تخلیق نہیں کر سکتی۔ اب یہ امر بالکل صاف ہو گیا کہ وضع قانون کا حق مخصوص ہے اس خلاقِ عظیم کے ساتھ جس نے انسان، اسکی فطرت، اسکے اعمال اور افعال سب کو پیدا کیا ہے۔ وہی ان سب چیزوں کا کماحقہٗ علم رکھ سکتا ہے اور وہی ان کے لیے قانون وضع کر سکتا ہے۔

پھر جب انسان میں وضع قانون کی قوت ہی نہیں ہے تو وہ اگر اسکی کوشش کریگا تو یقیناً غلطی کریگا اور یقیناً اسکی عقل اس غیر معمولی اور اپنی قوتِ برداشت سے زائد بوجھ کو اٹھانے کی وجہ سے ضعیف ہو کر سخافت و سفاہت کے درجہ تک گر جائیگی۔ اس کا واضح مشاہدہ ہم یورپ کے ترقی یافتہ حیوانات کی حکمت آرائیوں میں کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی استعداد سے بڑھ کر کام کرنیکا نتیجہ پریشانی تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد کہ انسان کو وضع قانون کی قوت حاصل نہیں ہے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ انسان فرمانروا بھی نہیں بن سکتا۔ یہی وہ خط فاصل ہے جو ابتدا اور بنیاد ہی سے اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست میں فرق و امتیاز پیدا کر دیتا ہے اور اتنا فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ان دونوں میں کسی مقام پر بھی اتصال و اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اسلامی ریاست کا بنیادی اصول غیر اللہ کی فرمانروائی کی نفی کامل اور محض اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی کا کامل اثبات ہے۔ اور غیر اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد انسانی فرمانروائی ہے۔ اسلام لا الٰہ کی تعلیم دے کر ہر غیر اللہ کی فرمانروائی کی نفی کر دیتا ہے اور الا اللہ کی تعلیم دے کر فرمانروائی کو ذات حق سبحانہٗ کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے۔ اس کا بنیادی اصول ہے ان الحکم الا للہ حکومت و فرمانروائی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو پہنچتا ہے۔

(۱) ذالکم اللہ ربکم لہ الملک — وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے بادشاہی صرف اسی کی ہے۔

(۲) لم یکن لہ شریک فی الملک — اسکی بادشاہی میں کوئی اسکا شریک نہیں ہے۔

(۳) الا لہ الخلق والامر — خبردار ہو جاؤ اسی کے لیے خلق اور امر دونوں مخصوص ہیں۔

(۴) ولا یشرک فی حکمہ احداً — وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

مندرجہ بالا آیات اور انکے علاوہ اور متعدد کثیر آیات اس چیز کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام غیر اللہ کی حکمرانی قطعاً ناجائز قرار دیتا ہے اور اسکو کسی حالت میں بھی روا نہیں رکھتا۔ صرف اسلامی ریاست ہی کا نہیں خود اسلام کا سنگ بنیاد بھی یہی اصول ہے۔ اسلام نام ہی ہے حکومت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی میں داخل ہو جانیکا۔ اس لیے اس اصول کو چھوڑ کر اور غیر اللہ کی فرمانروائی کو جائز قرار دینے کے بعد سرے سے اسلام کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ افسوس اور حیرت ہے ان زعماء ملت پر جو چیخ چیخ کر مسلمانوں کو جمہوریت اور مشترک وطنی حکومت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اسلام کا رشتہ انسانی فرمانروائی سے جوڑتے ہیں۔

اسلامی نظام حکومت کے برعکس سیاست و ریاست کے متعلق جسقدر غیر اسلامی نظریات اب تک پیش کیے گئے ہیں اور جسقدر قیامت تک پیش کیے جائینگے ان سب میں انسانی فرمانروائی کا نظریہ مشترک اور اہم ترین جزو ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے اصولی حیثیت سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ چیز سرے سے غلط ہے اور یہ کہ فرمانروائی کا حق مخصوص بذات حق سبحانہٗ ہے۔ انسانی فرمانروائی کے ابطال کے بعد ہر غیر اسلامی سیاسی نظریہ کا باطل ہونا قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے خواہ وہ جمہوریت ہو یا فسطائیت یا دنیا کا اور کوئی سیاسی نظریہ۔ اس لیے اب اسکی حاجت تو نہیں ہے کہ ہر ایک غیر اسلامی سیاسی نظریہ کو علحدہ علحدہ باطل کیا جائے۔ تاہم مزید توضیح اور اتمام حجت کے لیے ہم ان سب پر علحدہ علحدہ بھی تنقید کر کے انکی غلطی قطعی طور پر واضح کیے دیتے ہیں تاکہ اس دور کشمکش میں جب کہ نظریات کا تصادم نہایت شدت کے ساتھ صرف ذہنوں، زبانوں اور کاغذوں ہی پر نہیں بلکہ جنگ کے میدانوں میں بھی ہو رہا ہے لوگ صحیح مقصد کا تعین کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ

خدا سے بے نیاز ہو کر جو نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے ایک لعنت ہے جس سے جس قدر جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اسی قدر بہتر ہے اور عالم کی صلاح و فلاح کا ایک اور صرف ایک ذریعہ یہی ہے کہ وہ اسلام کے سیاسی نظریے کو قبول کرے یعنی غیر اللہ کی فرمانروائی کو مٹا کر محض اللہ تعالیٰ کی حکومت و فرمانروائی قبول کرے۔

تاریخی پہلو

ریاست جو سب سے اہم اجتماعی ادارہ ہے اسکی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں اور یورپ کے فلاسفہ کے اس مسئلہ پر مختلف اقوال و خیالات ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خاندان اولین معاشرہ ہے جو دنیا میں پیدا ہوا اور اس قسم کے مختلف معاشروں کے باہمی اجتماع سے طبعی طور پر ریاست وجود میں آگئی۔ کوئی کہتا ہے کہ خوف و دہشت کے جذبہ سے متاثر ہو کر مختلف اور متفرق انسانی افراد ریاست کو وجود میں لانے پر مجبور ہو گئے کسی کا قول ہے کہ ریاست افراد انسانی میں ایک اجتماعی معاہدہ (Social contract) کا نتیجہ ہے۔ غرض اس سلسلہ میں بکثرت اور مختلف باتیں کہی جاتی ہیں اور ان سب کا محور ایک خیال ہے یعنی حقیقت انسانی کے متعلق یہ مفروضہ کہ وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جس طرح بھیڑ بکری، گائے، بھینس وغیرہ کے افعال و حرکات انکے ضروریات و ماحول کے لحاظ سے ہوتے ہیں اسی طرح انسانی افعال بھی انہی چیزوں کے تابع ہوتے ہیں۔ مقصد سب کا یہی ہے، محض بیانات کا فرق ہے۔ اور یہ فرق بھی اس لیے ہے کہ کسی نے انسان کی بالکل ابتدائی (مفروضہ) حالت سے ریاست کی تاریخ کی ابتدا کی ہے اور کسی نے بعض درمیانی مدارج سے اسکو شروع کیا ہے۔

قرآن مجید اگرچہ فن تاریخ کی کتاب نہیں ہے اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کوئی مورخ تھے، لیکن چونکہ شرف و فلاح انسانی سے اس مسئلہ کا تعلق ہے اسلیے اسلام نے اس

مسئلہ کے تاریخی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ انسان دنیا میں خلافتِ الٰہی کی نعمت اپنے ساتھ لے کر آیا تھا بلکہ تخلیق آدم علیہ السلام کا مقصد ہی خلافت الٰہیہ کا قیام تھا۔ اس مرتبۂ عظمیٰ کے ساتھ انسان کو اس کی ابتداء آفرینش ہی میں نواز گیا اور سب سے پہلے خلیفۃ اللہ فی الارض حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو دنیا کے سب سے پہلے انسان بھی تھے۔ یہ ہے ہیئۃ اجتماعیہ کے وجود میں آنے کی دوسری صورت جو اول الذکر صورت سے بالکل متضاد ہے اور جسکی بنیاد عقلی و فطری اصول اور تشریعی و الٰہی احکام و علوم پر قائم ہے۔

لیکن اسلام اس کا منکر نہیں ہے کہ ریاست نے اپنے ارتقائی مدارج طبعی و حیوانی منہاج پر طے کیے ہیں۔ بلاشبہ ایسا ہوا ہے۔ مگر ریاست کی حقیقی ابتداء اس صورت سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اولاد آدم علیہ السلام کے پھیلنے کے بعد جذبات اور ماحول، نفس اور شیطان کے وساوس کا شکار ہو کر ایک کثیر انسانی جماعت نے ریاست کے اسلامی تصور کو بھلا دیا اور غیر اسلامی یعنی غیر انسانی طریق پر ریاست و حکومت کی بنیادیں قائم کرنا شروع کیں۔ اس قسم کی حیوانی ریاستوں کی تاریخ اور انکے وجود میں آنے کے اسباب بلاشبہ وہی ہیں جو یورپ کے فلاسفہ ذکر کرتے ہیں۔

خیر و شر اس عالم میں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اسلیے ریاست کے تصور کے دو سلسلے ابتداء آفرینشِ انسان سے لے کر آج تک جاری رہے ہیں۔ ایک تو ریاست کا اسلامی تصور اور دوسرا غیر اسلامی تصور۔ ایک خدائی حکومت کا تصور دوسرا حیوانی حکومت کا تصور۔ ایک خالص اصولی ریاست کا تخیل دوسرا جذبات، اور ہوا و ہوس کی ریاست کا تخیل۔ کل انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اسی حکومت الٰہی کی تعلیم و تبلیغ کے لیے تشریف لائے۔ لیکن اس کا واضح تفصیلی اور مکمل ترین خاکہ محض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے سامنے علمی و عملی صورت میں پیش کیا گیا اور کسی نبی نے اسکی اتنی واضح اور مکمل شکل کبھی نہیں پیش کی تھی۔

الحاصل اسلامی اور غیر اسلامی ریاستوں کا اختلاف محض اصول اور خاکہ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ انکی روحیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متبائن ہیں۔ اسلامی ریاست کی روح عبدیت اور اتباع امرِ الٰہی ہے اور غیر اسلامی ریاست کی روح طغیان اور اتباعِ ہوا۔ پھر ظاہر ہے کہ جس ریاست کی بنیاد کسی عقلی اصول اور اخلاقی ضابطہ پر قائم ہو بلکہ محض خواہشاتِ نفس پر، خواہ ان خواہشات کا محرک جذبۂ حُبِ جاہ و اقتدار ہو یا خوف و ہراس، بہرحال اس میں شرکت کرنے والوں کو کبھی راحت و فلاح میسر نہیں ہو سکتی اور نہ وہ کبھی مطمئن رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اور موجودہ دور کے واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر سیاسی نظریے آجتک دنیا کے سامنے آئے وہ سب تجربے سے غلط اور نقصان رساں ہی ثابت ہوئے اور ان نظریوں کو قبول کرنے والے بہت جلد خود ان سے متنفر ہو گئے حتیٰ کہ جس طرح پہلے وہ انکے محاسن کی تبلیغ کرتے تھے اس سے زیادہ انکے معائب کی تبلیغ میں کوشاں ہوئے۔

اس بیان سے یہ ثابت ہو گیا ہوگا کہ اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کا تصادم کوئی نیا تصادم نہیں ہے بلکہ ابتدائے آفرینشِ انسان سے کچھ ہی عرصہ کے بعد سے یہ تصادم شروع ہو گیا تھا اور آج تک جاری ہے۔ اسلیے اسوقت سے لیکر اب تک غیر اسلامی ریاست کے جتنے تخیلات پیش کیے گئے ہیں سب ہماری تنقید کے ذیل میں داخل ہیں۔ خواہ وہ ہندوؤں کے ویدوں والی ریاستیں ہوں یا افلاطون کی مثالی ریاست (Ideal state) یا موجودہ دور کی نازی و جمہوری ریاستیں۔ لیکن دورِ گذشتہ کے تصورات پر تنقید کرنا اسوقت بیسود ہے اسلیے ہم صرف موجودہ دور کے سیاسی افکار کے معائب کو واضح کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

موجودہ دور کے سیاسی نظریات کی تقسیم دو اعتبارات سے کی جا سکتی ہے۔

(۱) فرمانروا (یا مقتدرِ اعلیٰ) کی تعیین کے اعتبار سے۔

(۲) معاشی اعتبار سے۔

اعتبار اول کی بنا پر دو نظریے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ آمریت اور جمہوریت دونوں میں فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آمریت میں فرمانروا ارادۂ انفرادی (Individual will) ہوتا ہے اور جمہوریت میں ارادۂ اجتماعی (General will)۔ لیکن حق یہ ہے کہ دونوں میں جہاں تک اصول کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں ہے۔ عملی صورت میں ضرور کچھ فرق پیدا ہوتا ہے۔ مگر وہ بھی بعض اوقات۔ آمریت میں بھی اجتماعی ارادہ ہی درحقیقت فرمانروا ہوتا ہے جو ایک ڈکٹیٹر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور جمہوریت میں یہی اجتماعی ارادہ اکثریت رکھنے والی پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جمہوریت بھی درحقیقت جماعتی آمریت (Party-dictatorship) کا نام ہے۔

معاشی اعتبار سے دو قسم کی ریاستیں ہمارے سامنے ہیں، سرمایہ دار ریاست اور اشتراکی ریاست۔ دونوں میں فرق ظاہر ہے۔ اول الذکر میں سرمایہ رکھنے والا طبقہ حکمراں ہوتا ہے اور ثانی الذکر میں مزدور طبقہ فرمانروا ہوتا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ان سب پر علحدہ علحدہ نظر ڈالینگے۔

(باقی)

ضرورت مترجمین

عربی، فارسی، انگریزی سے براہ راست شستہ و رفتہ سلیس اردو میں ترجمہ کرنیوالوں کی ضرورت ہے۔ جو مناسب اجرت پر علمی، ادبی، تاریخی نیز متفرق علوم و فنون کی کتابوں اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کرسکیں۔ کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے۔ علمی قابلیت نیز تجربہ کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے۔ پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں۔

شباب۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۶ بمبئی نمبر ۳

زندگی بعدِ موت

[یہ تقریر ۱۴ ارجون ۱۹۴۱ء کو نشر گاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے یہاں نقل کی جاتی ہے]

موت کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کیسی ہے؟ یہ سوال حقیقت میں ہمارے علم کی رسائی سے دور ہے۔ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں جن سے ہم موت کی سرحد کے اُس پار جھانک کر دیکھ سکیں کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں جن سے ہم اُدھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آلہ بھی نہیں رکھتے جس کے ذریعہ سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جا سکے کہ اُدھر کچھ ہے یا کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اُسکے دائرے سے قطعی خارج ہے۔ جو شخص سائنس کا نام لیکر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، وہ بالکل ایک غیر سائنٹفک بات کہتا ہے۔ سائنس کی رو سے نہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی زندگی ہے، اور نہ یہ کہ کوئی زندگی نہیں ہے۔ جب تک ہم کوئی یقینی ذریعۂ علم نہیں پاتے کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنٹفک رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی بعد موت کا نہ انکار کریں نہ اقرار۔

مگر کیا عملی زندگی میں ہم اِس سائنٹفک رویہ کو نباہ سکتے ہیں؟ شاید نہیں — بلکہ یقیناً نہیں۔ عقلی حیثیت سے تو یہ ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جاننے کے ذرائع ہمارے پاس نہ ہوں تو اسکے متعلق ہم نفی اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں۔ لیکن جب اسی چیز کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہو تو ہمارے لیے اِسکے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یا تو انکار پر اپنا طرزِ عمل قائم کریں یا اقرار پر۔ مثلاً ایک شخص ہے جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اگر اُسکے ساتھ آپ کا کوئی معاملہ درپیش نہ ہو تب تو آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ اسکے ایماندار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں۔ لیکن جب آپکو اس سے معاملہ کرنا ہو تو

آپ مجبور ہیں کہ یا تو اسے ایماندار سمجھ کر معاملہ کریں یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اسکا ایماندار ہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کرینگے۔ مگر اسکی ایمانداری کو مشکوک سمجھتے ہوئے جو معاملہ آپ کرینگے عملاً اسکی صورت وہی تو ہو گی جو اسکی ایمانداری کا انکار کرنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے۔ عملی رویہ کبھی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اُس کے لیے تو اقرار یا انکار بہرحال ناگزیر ہے۔

یہ بات تھوڑے غور و فکر ہی سے آپکی سمجھ میں آسکتی ہے کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ دراصل ہمارے اخلاقی رویہ کا سارا انحصار ہی اسی سوال پر ہے۔ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور اسکے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو میرا اخلاقی رویہ ایک طرح کا ہو گا۔ اور اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اسکے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے جس میں مجھے اپنی موجودہ زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہو گا اور وہاں میرا اچھا یا برا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہو گا تو یقیناً میرا اخلاقی طرز عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہو گا۔ اسکی مثال یوں سمجھیے جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اسے بس یہاں سے بمبئی تک جانا ہے اور بمبئی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیگا بلکہ وہاں وہ پولیس اور عدالت اور ہر اس طاقت کی دست رس سے باہر ہو گا جو اس سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی ہو۔ برعکس اسکے ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے بمبئی تک تو اسکے سفر کی صرف ایک ہی منزل ہے، اسکے بعد اسے سمندر پار ایک ایسے ملک میں جانا ہو گا جہاں کا بادشاہ وہی ہے جو ہندوستان کا بادشاہ ہے، اور اس بادشاہ کے دفتر میں میرے اُس پورے کارنامہ کا خفیہ ریکارڈ موجود ہے جو میں نے ہندوستان میں انجام دیا ہے، اور وہاں میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائیگا کہ میں اپنے کام کے

لحاظ سے کس درجہ کا مستحق ہوں۔ آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرزِ عمل کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ پہلا شخص صرف یہاں سے بمبئی تک کے سفر کی تیاری کریگا، اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل منزلوں کے لیے بھی ہوگی۔ پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے بمبئی پہنچنے تک ہے، آگے کچھ نہیں۔ اور دوسرا یہ خیال کریگا کہ اصل نفع و نقصان سفر کے پہلے مرحلہ میں نہیں ہے بلکہ آخری مرحلہ میں ہے۔ پہلا شخص اپنے افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو بمبئی تک کے سفر میں نکل سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے شخص کی نگاہ اُن نتائج پر ہوگی جو سمندر پار، دوسرے ملک میں پہنچ کر نکلینگے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں شخصوں کے طرزِ عمل کا یہ فرق براہِ راست نتیجہ ہے انکی اُس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوعیت کے متعلق رکھتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی میں بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی بعد موت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اٹھائینگے اُسکی سمت کا تعین اس بات پر منحصر ہوگا کہ آیا ہم اسی زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں، یا کسی بعد کی زندگی اور اسکے نتائج کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت میں اٹھیگا اور دوسری صورت میں اسکی سمت بالکل مختلف ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ عملی زندگی کا سوال ہے۔ اور جب بات یہ ہے تو ہمارے لیے اس معاملہ میں شک اور تردد کے مقام پر ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں۔ شک کے ساتھ جو رویہ ہم زندگی میں اختیار کرینگے وہ بھی لامحالہ انکار ہی کے رویہ جیسا ہوگا۔ لہٰذا ہم بہرحال اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں۔ اگر سائنس اس کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتا تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینی چاہیے۔

اچھا تو عقلی استدلال کے لیے ہمارے پاس کیا مواد ہے؟ ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے، اور دوسرے یہ نظامِ کائنات۔ ہم انسان کو اس نظامِ کائنات کے اندر رکھ کر دیکھینگے کہ جو کچھ انسان میں

ہے آیا اسکے سارے مقتضیات اس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں یا کوئی چیز ایسی بچی رہ جاتی ہے جس کے لیے کسی دوسری نوعیت کے نظام کی ضرورت ہو۔

دیکھیے، انسان ایک تو جسم رکھتا ہے جو بہت سے معدنیات، نمکیات پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اسکے جواب میں کائنات کے اندر بھی مٹی، پتھر، دھاتیں، نمک، گیسیں، دریا، اور اسی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لیے جتنے قوانین کی ضرورت ہے وہ سب اس کائنات کے اندر کارفرما ہیں اور جس طرح وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں، دریاؤں، اور ہواؤں کو اپنے حصہ کا کام پورا کرنیکا موقع دے رہے ہیں اسی طرح انسانی جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنیکا موقع حاصل ہے۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے جو گردوپیش کی چیزوں سے غذا لے کر بڑھتا اور نشوونما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، پودے اور گھاس پھونس کائنات میں بھی موجود ہیں، اور وہ قوانین بھی یہاں پائے جاتے ہیں جو نشوونما پانے والے اجسام کے لیے درکار ہیں۔

پھر انسان ایک زندہ وجود ہے جو اپنے ارادہ سے حرکت کرتا ہے، اپنی غذا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے، اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سی قسمیں موجود ہیں۔ خشکی، تری اور ہوا میں بیشمار حیوانات پائے جاتے ہیں۔ اور وہ قوانین بھی بتمام وکمال یہاں کارفرما ہیں جو ان زندہ ہستیوں کے پورے دائرۂ عمل پر حاوی ہونے کے لیے کافی ہیں۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے جسکو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں۔ اسکے اندر نیکی اور بدی کا شعور ہے، نیک اور بد کی تمیز ہے، نیکی اور بدی کرنے کی قوت ہے، اور اسکی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ ظاہر ہو۔ وہ ظلم اور انصاف، سچائی اور جھوٹ، حق اور ناحق، رحم اور بے رحمی، احسان اور احسان فراموشی، فیاضی اور بخل، امانت اور خیانت،

اور ایسی ہی مختلف اخلاقی صفات کے درمیان فرق کرتا ہے۔ یہ صفات عملاً اسکی زندگی میں پائی جاتی ہیں اور یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مترتب ہوتے ہیں۔ لہذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے اس کا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اسکے افعال کے طبعی نتائج رونما ہوتے ہیں اُسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں۔

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھیے کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں اسکا امکان نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں اس کا انتظام ہی نہیں کیا گیا ہے۔ انسان کے سوا یہاں، کم از کم ہمارے علم کی حد تک، کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو۔ سارا نظام کائنات طبعی قوانین کے تحت چل رہا ہے، اخلاقی قوانین کسی طرح کارفرما نظر نہیں آتے۔ یہاں روپے میں وزن اور قیمت ہے مگر سچائی میں نہ وزن ہے نہ قیمت۔ یہاں آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے، مگر حق پرستی کا بیج بونے والے پر کبھی پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور کبھی، بلکہ اکثر جوتیوں کی۔ یہاں مادّی عناصر کے لیے مقرر قوانین ہیں جنکے مطابق ہمیشہ مقرر نتائج نکلتے ہیں مگر اخلاقی عناصر کے لیے کوئی مقرر قانون نہیں ہے کہ انکی فعلیت سے ہمیشہ مقرر نتیجہ نکل سکے۔ طبعی قوانین کی فرمانروائی کے سبب سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اُس حد تک جسکی اجازت طبعی قوانین دیدیں، اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاق ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلنے کا تقاضہ کرتا ہے مگر طبعی قوانین کی مداخلت سے نتیجہ بالکل برعکس نکل آتا ہے۔ انسان نے خود اپنے تمدنی و سیاسی نظام کے ذریعہ سے تھوڑی سی کوشش اس امر کی کی ہے کہ انسانی اعمال کے اخلاقی نتائج ایک مقرر ضابطہ کے مطابق برآمد ہو سکیں مگر یہ کوشش بہت محدود پیمانہ پر ہے اور بے حد ناقص ہے۔ ایک طرف طبعی قوانین اسکو محدود اور ناقص بناتے ہیں اور دوسری طرف انسان کی اپنی بہت سی کمزوریاں اس انتظام کے نقائص میں اور زیادہ اضافہ کرتی ہیں۔

میں اپنے مدعا کی توضیح چند مثالوں سے کرونگا۔ دیکھیے، ایک شخص اگر کسی دوسرے شخص کا دشمن ہو اور اسکے گھر میں آگ لگادے تو اسکا گھر جل جائیگا۔ یہ اسکے فعل کا طبعی نتیجہ ہے۔ اس کا اخلاقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس شخص کو اتنی ہی سزا ملے جتنا اس نے ایک خاندان کو نقصان پہنچایا ہے۔ مگر اس نتیجہ کا ظاہر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آگ لگانے والے کا سُراغ ملے، وہ پولیس کے ہاتھ آسکے، اس پر جرم ثابت ہو، عدالت پوری طرح اندازہ کرسکے کہ آگ لگنے سے اس خاندان کو اور اسکی آئندہ نسلوں کو ٹھیک ٹھیک کتنا نقصان پہنچا ہے، اور پھر انصاف کے ساتھ اس مجرم کو اتنی ہی سزا دے۔ اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ ہو تو اخلاقی نتیجہ یا تو بالکل ہی ظاہر نہ ہوگا یا اس کا صرف ایک تھوڑا سا حصہ ظاہر ہوکر رہ جائیگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے حریف کو برباد کرکے وہ شخص دنیا میں مزے سے پھولتا پھلتا رہے۔

اس سے بڑے پیمانے پر ایک اور مثال لیجیے۔ چند اشخاص اپنی قوم میں اثر پیدا کرلیتے ہیں اور ساری قوم ان کے کہے پر چلنے لگتی ہے۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھاکر وہ لوگوں میں قوم پرستی کا اشتعال اور ملک گیری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، گرد و پیش کی قوموں سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں، لکھوکھا آدمیوں کو ہلاک کرتے ہیں، ملک کے ملک تباہ کرڈالتے ہیں، کروڑوں انسانوں کو ذلیل اور پست زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اور انسانی تاریخ پر اُنکی کارروائیوں کا ایسا زبردست اثر پڑتا ہے جس کا سلسلہ آئندہ سینکڑوں برس تک پُشت در پشت اور نسل در نسل پھیلتا چلا جائیگا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ چند اشخاص جس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے ہیں اس کی مناسب اور منصفانہ سزا ان کو کبھی اسی دنیوی زندگی میں مل سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کی بوٹیاں بھی نوچ ڈالی جائیں، اگر ان کو زندہ جلا ڈالا جائے یا کوئی اور ایسی سزا دی جائے جو انسان کے بس میں ہے، تب بھی کسی طرح وہ اس نقصان کے برابر سزا نہیں پاسکتے جو انہوں نے کروڑہا انسانوں کو اور انکی آئندہ بے شمار نسلوں کو پہنچایا ہے۔ موجودہ نظام

کائنات جن طبعی قوانین پر چل رہا ہے انکے تحت کسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے جرم کے برابر سزا پاسکیں۔

اسی طرح اُن نیک انسانوں کو لیجیے جنہوں نے نوع انسانی کو حق اور راستی کی تعلیم دی اور ہدایت کی روشنی دکھائی، جنکے فیض سے بیشمار انسانی نسلیں صدیوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں اور نہ معلوم آئندہ کتنی صدیوں تک اٹھاتی چلی جائینگی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی خدمات کا پورا صلہ انکو اس دنیا میں مل سکے؟ کیا آپ تصور کرسکتے ہیں کہ موجودہ طبعی قوانین کی حدود کے اندر ایک شخص اپنے اُس عمل کا پورا صلہ حاصل کرسکتا ہے جس کا ردِ عمل اسکے مرنے کے بعد ہزاروں برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیل گیا ہو؟

جیسا کہ میں ابھی بیان کرچکا ہوں اول تو موجودہ نظام کائنات جن قوانین قدرت پر چل رہا ہے انکے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب ہوسکیں، دوسرے یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے اس کے ردِ عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور اتنی مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اسی کے پورے نتائج وصول کرنے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے اور موجودہ قوانین قدرت کے ماتحت انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی ہستی کے خاکی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لیے تو موجودہ طبعی دنیا (Physical world) اور اسکے طبعی قوانین کافی ہیں، مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لیے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے اس کے لیے ایک دوسرا نظام عالم درکار ہے جس میں حکمراں قانون (Governing Law) اخلاق کا قانون ہو، اور طبعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں۔ جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو۔ جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مترتب ہونے سے رہ گئے ہیں یا اُلٹے مترتب ہوئے ہیں، اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مترتب ہوسکیں۔ جہاں سونے اور چاندی کے بجائے

نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو۔ جہاں آگ صرف اُس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کی مستحق ہو جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو اور مصیبت اسکے حصہ میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا ایک نظام عالم ضرور ہونا چاہیے۔

جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے، وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیے" کی حد تک لیجا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا واقع میں ایسا کوئی عالم ہے بھی، تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے اور اسی طرح ہونے والی ہے جو موجودہ نظام عالم جو طبعی قوانین پر مبنی ہے، ایک وقت میں توڑ ڈالا جائیگا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہونگی۔ پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے، دوبارہ پیدا کریگا اور بیک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کریگا۔ وہاں ایک ایک شخص کا، ایک ایک قوم کا، اور پوری انسانیت کا ریکارڈ ہر غلطی اور ہر فروگذاشت کے بغیر محفوظ ہوگا۔ ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا ردِ عمل دنیا میں ہوا ہے اسکی پوری روداد موجود ہوگی۔ وہ تمام نسلیں گواہوں کے کٹہرے میں حاضر ہونگی جو اس ردِ عمل سے متاثر ہوئیں۔ ایک ایک ذرہ جس پر انسان کے اقوال اور افعال کے نقوش ثبت ہوئے، اپنی داستان سنائیگا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضاء شہادت دینگے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا۔ پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کریگا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے اور کون کتنی سزا کا۔ یہ انعام اور یہ سزا دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہونگی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہونگے، وہاں کی مقداریں کچھ

اور ہونگی، وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہونگے۔ انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہے ہیں وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کر سکیگا بغیر اسکے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اسکے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں۔ اور اسی طرح انسان کی جن برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزارہا برس تک اور بیشمار انسانوں تک پھیلتے رہے ہیں، وہاں وہ انکی پوری سزا بھگتے گا بغیر اسکے کہ موت اور بیہوشی آکر اسے تکلیف سے بچا سکے۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں، مجھے انکے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے۔ اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ناممکن ہے تو آخر ایک دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو؟ البتہ یہ بات کہ واقع میں ایسا ضرور ہوگا، تو اس کا تعین نہ دلیل سے ہو سکتا ہے اور نہ علمی ثبوت سے۔ اسکے لیے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم

جس میں اسلامی تحریک کے اصول و مقاصد اور طریق کار کی پوری توضیح کی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کے نصب العین، یعنی حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد کے لیے کس طرز کی جماعت درکار ہے۔ قیمت عہ

دفتر ترجمان القرآن مبارک پارک لاہور سے طلب فرمایئے

مطبوعات

دین و دانش | تالیف مولانا سید محمود علی صاحب سابق پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ۔ ضخامت ۵۰۰ صفحہ قیمت مجلد ۳ غیر مجلد ۲ ۔ کتب خانہ انصاریہ جالندھر۔

یہ جدید علم کلام کی ایک اچھی کتاب ہے۔ اس میں موجودہ زمانہ کے فلسفہ و سائنس سے متاثر لوگوں کو دین اور اسکے اعتقادی مسائل سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، اور عام اہلِ کلام کی طرح فاضل مصنف نے تفہیم کی سعی میں ایسی کھینچ تان نہیں کی ہے جس سے نفس معتقداتِ دینی ہی کی شکل بگڑ جائے۔ ہستیٔ باری، وحی، نبوت، ملائکہ، معجزات، ختم نبوت، جبر و قدر، جزا و سزا اور حشر و نشر وغیرہ پر مفصل کلام کرتے ہوئے انہوں نے ہر چیز کو معقول دلائل سے سمجھایا ہے، اور ملحد فلاسفہ و حکماء کے ساتھ ہندو فلسفہ اور مسیحی فلسفہ کی بھی اچھی طرح تردید کی ہے۔ لیکن یہ طبعی امر ہے کہ معتقداتِ دینی پر معقولی رنگ میں گفتگو کرتے ہوئے محتاط سے محتاط آدمی کو بھی بسا اوقات ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ جہاں ٹھیٹھ حقیقت کو محدود عقلوں کی رسائی تک لانے میں استدلال کے کمزور سہارے ناکافی ہو جاتے ہیں وہاں ایک صحیح العقیدہ متکلم بر سبیل تنزل ایسی باتیں مجبوراً کہہ جاتا ہے جو بجائے خود حقیقت سے بعید ہوتی ہیں۔ فاضل مصنف کو بھی بعض مقامات پر یہ مشکل پیش آئی ہے۔ مثلاً مذہب کے ارتقاء کا جو تصور انہوں نے پیش کیا ہے وہ قرآن کے بیان سے بہت ہٹا ہوا ہے اور اسی غلطی کے نتیجہ میں نسخ شرائع کی توجیہ بھی انہوں نے ایسی کی ہے جو قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کی رو سے دین ہرگز ایک ارتقائی چیز نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ حقیقت کا براہِ راست علم جب وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو تو اس میں ارتقاء کبھی نہیں ہو سکتا۔ ارتقاء اگر ہو سکتا ہے تو انسان کے اپنے مذہبی تجسس اور اسکے نتائج میں ہو سکتا ہے۔ مگر مذہب کا جو علم اللہ تعالیٰ خود انبیاء کو عطا کرے اسکو ارتقاء سے کیا تعلق۔ وہ کوئی

بتدریج دریافت ہونے والی چیز تھوڑی ہے کہ تجربات و مشاہدات کی ترقی کے ساتھ ساتھ علم میں اضافہ ہو۔ وہ تو امر واقعی کا کشفی علم ہے جسکی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے آنکھوں سے ہم کسی چیز کو دیکھ لیں۔ اس قسم کا علم جس زمانہ میں جسکو حاصل ہو وہ بعینہٖ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کسی بعد کے زمانہ میں کسی دوسرے کو حاصل ہو۔ اسی لیے نسخ شرائع کی بھی وہ توجیہ صحیح نہیں ہے جو مصنف نے کی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے علوم اور انکی معلومات میں کوئی تفاوت قرآن سے معلوم نہیں ہوتا۔ تمام انبیاء پر ایک ہی علم حق کا فیضان ہوا تھا اور امر حق کے علم میں ان کے درمیان اس حیثیت سے کوئی فرق نہ تھا کہ کسی کا علم کسی کے مقابلہ میں ناقص ہو۔ فرق اگر رہا ہے تو وہ ان احکام میں تھا جو مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات اور انکی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے دیے گئے تھے۔ اور ان کے بھی اصول میں فرق نہ تھا بلکہ صرف تفصیلی اشکال میں تھا۔

شیطان اور جن کی حقیقت کے متعلق بھی فاضل موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ ان کے بیان سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ شیاطین اور ملائکہ میں محض نوع کا فرق ہے، جنس ایک ہے، حالانکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل مختلف جنس کی ہستیاں ہیں۔ ملائکہ قطعی غیر مختار ہیں۔ بخلاف اسکے جن تقریباً انسان کی طرح ذی اختیار ہیں، اُن میں سے جو اللہ کی نافرمانی اختیار کریں ان کا نام شیاطین ہے، اور جو فرمانبرداری اختیار کریں وہ مومن جن ہیں۔

اس قسم کی چند لغزشوں کے باوجود کتاب فی الجملہ بہت مفید ہے اور جو لوگ اسلام کے عقائد کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

دین و آئین تالیف مولانا سید محمود علی صاحب۔ ضخامت ۲۵۲ صفحات۔ قیمت مجلد ۸ر۔ غیر مجلد ۶ر۔ کتب خانہ انصاریہ، جالندھر۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسلام کے ان قوانین کی تشریح کی ہے جن پر آج کل عموماً غیر مسلموں کی طرف سے اعتراضات کیے جاتے ہیں، اور جن میں ترمیم و تغیر کرنے کے لیے دین سے ناواقف اور دنیا پر

فریفتہ مسلمان بے چین نظر آتے ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے نہایت لطیف پیرایہ میں ان لوگوں کے خیال کی تردید کی ہے جو چاہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں دنیا جن جن راہوں پر چل رہی ہے اسلام بھی اسکے پیچھے پیچھے اپنی راہوں پر چلتا رہے اور تمام ان غلط کاریوں کے لیے جواز کا فتویٰ دیتا چلا جائے جو نفس کے بندے اور خواہشات کے غلام اختیار کرتے جائیں۔ اسکے بعد انہوں نے نماز، روزہ اور مناسک حج کے متعلق مخالفین کے اعتراضات اور مذبذبین کے بہانوں کا جواب دیتے ہوئے ان عبادات کی روح اور ان کے مصالح و فوائد بیان کیے ہیں۔ پھر سود، تعدد ازواج، طلاق و خلع، پردہ، قانون دیوانی، قانون وراثت، قانون فوجداری اور قتل مرتد وغیرہ مسائل پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور اسلامی احکام کی حمایت کا حق ادا کر دیا ہے۔

کتاب میں بعض مقامات ایسے نظر آئے جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فاضل مصنف ان پر نظر ثانی فرمائیں۔ مثلاً اختلاف مراتب نبوت کے بیان میں انکا یہ فرمانا کہ وحی کے ذریعہ سے جو علوم انبیاء علیہم السلام پر القا ہوئے ان میں انبیاء کی ذاتی استعدادوں کے لحاظ سے تفاوت تھا، اور یہ کہ بعض پیغمبروں پر الفاظ کے بغیر صرف خیال نازل ہوا ہے اور الفاظ انہوں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق خود وضع کیے، اور یہ کہ "بعض پیغمبروں پر الفاظ بھی القا ہوئے مگر انکی استعداد ایسی قوی نہ تھی کہ صاف اور صریح کو اخذ کر سکتے"، اور یہ کہ خالق کے لیے باپ کا استعارہ اور رسولوں کے لیے اوتار کا لفظ اسی کمی استعداد کے سبب سے بعض انبیاء نے استعمال کیا، یہ سب باتیں نہایت محل نظر ہیں۔ نہ ان کے لیے قرآن میں کوئی بنیاد ملتی ہے اور نہ قیاس عقلی ہی کے لحاظ سے انکو درست کہا جا سکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی کی گئی وہ اس وحی سے مختلف نہ تھی جو نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے نبیوں پر کی گئی تھی۔ رہا قیاس عقلی تو اسکی رو سے ہمارے لیے دو باتوں میں سے کسی ایک کو مانے بغیر چارہ نہیں، یا تو ہم انسان کو خود اپنی ہدایت کا ذمہ دار سمجھیں اور اس صورت میں نبوت بالکل غیر ضروری ہے، یا ہم اس بات کے قائل ہوں کہ راہِ راست بتانا اللہ کا کام ہے اور اس صورت میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے راہِ راست بتانے

کا جو کام اپنے ذمہ لیا ہے اسکو انجام دینے میں اسکی طرف سے کوئی کوتاہی ہو۔ ناقص استعدادوں کے اشخاص کو پیغام رسانی کے لیے منتخب کرنا، یا پیغام کی تعبیر کو پیغام رسانوں کے اوپر چھوڑ دینا کہ اپنے ذہن سے جس طرح چاہیں مختلف طور پر اسکو تعبیر کریں، یا کسی کے پاس اپنا پیغام غیر واضح صورت میں اور کسی کے پاس واضح صورت میں بھیجنا، ان میں سے جس بات کے بھی آپ قائل ہوں، اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت و ہدایت پر حرف آتا ہے، اور اُن تمام گمراہیوں کی ذمہ داری اللہ کی طرف عائد ہوتی ہے (معاذ اللہ) جو ناقص ہدایت پانے کی وجہ سے انسانوں میں پیدا ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے پیغمبر بھیجے ہی اس لیے ہیں کہ قیامت میں بازپرس کے موقع پر کوئی یہ حجت پیش نہ کر سکے کہ آپ نے خود ہی ہم کو راستہ نہ بتایا پھر غلط روی کے ذمہ دار ہم کیسے ہو سکتے ہیں (لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ)۔ لیکن اگر واقعہ وہی ہو جو فاضل مصنف نے تجویز کیا ہے تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ اللہ نے لوگوں کے لیے حجت پیش کرنے کی اچھی خاصی گنجائش چھوڑ دی ہے۔

سود کے مسئلہ میں فاضل موصوف نے مسلمانوں کی موجودہ مجبوریوں کو پیش نظر رکھ کر انتہائی متقیانہ احتیاط کے ساتھ ایسے قومی بینک کھولنے کے جواز کی صورت نکالی ہے جن میں محض تاجرانہ اغراض کے لیے سودی لین دین کیا جائے۔ اس تمام بحث کو ہم نے پورے غور کے ساتھ پڑھا۔ کوئی شک نہیں کہ آج کل جو لوگ نہایت بے باکی سے سود کی تحلیل کے لیے احکام شرعیہ میں قطع و برید کر رہے ہیں، ان کے مقابلہ میں مولانا محمود علی صاحب کی روش ایک خدا ترس اور ذمہ دار آدمی کی سی روش ہے، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ مجبوری و اضطرار کی حالت میں احکام شرعیہ کے اندر وہ تخفیف ہو سکتی ہے جو مولانا نے تجویز فرمائی ہے، مگر بہتر ہوتا کہ اس تجویز کو پیش کرنے کے ساتھ مولانا یہ بھی فرما دیتے کہ مسلمانوں کا کام یہ نہیں ہے کہ اضطرار کی حالت کو برقرار رکھ کر حرام کھاتے اور کھلاتے رہیں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ دنیا کے اس بگڑے ہوئے نظام کو بدلنے کے لیے جان توڑ جدوجہد کریں جسکی بدولت حرام و حلال کی تمیز مٹ گئی ہے اور جس کے تسلط نے اتنی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ خدا پرست لوگ خدا کی قائم کردہ حدود کی پابندی کر سکیں۔

مفردات القرآن | تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ضخامت ۴۷ صفحات۔ قیمت ۱۴ر۔ دائرہ حمیدیہ۔ سرائے میر۔ ضلع اعظم گڈھ۔

مولانا مرحوم نے اپنی تفسیر قرآن کے سلسلہ میں قرآن مجید کے بعض اُن الفاظ کی تحقیق کی تھی جن کے مفہوم میں یا تو اختلاف ہو ہے، یا جن کا پورا مفہوم متعین نہیں کیا گیا ہے، یا جنکے معنی کے متعلق غلط فہمیاں عام طور پر شائع ہوگئی ہیں۔ اس تحقیق کو انہوں نے ایک الگ کتاب کی صورت میں مرتب کرنا شروع کر دیا تھا مگر اسے مکمل نہ کر سکے۔ متعدد مقامات پر بحث تشنہ رہ گئی ہے اور بعض جگہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے لکھتے لکھتے یکایک چھوڑ دیا ہے۔ تاہم جتنا بھی لکھا ہے نہایت مفید ہے اور اس سے قرآن مجید کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کو بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ کتاب عربی زبان میں ہے۔

جمہرۃ البلاغہ | تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ضخامت ۸۸ صفحات۔ قیمت ۱۲ر دائرہ حمیدیہ سرائے میر۔ ضلع اعظم گڈھ۔

قرآن مجید کے معجزہ ہونے پر سب سے پہلی دلیل اسکی بلاغت ہے۔ اگرچہ اعجاز قرآنی کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں، اور ہر پہلو اپنی جداگانہ اہمیت رکھتا ہے، لیکن چونکہ پڑھنے والے کو سب سے پہلے نفس کلام سے سابقہ پیش آتا ہے، اور دوسرے پہلوؤں کی طرف بعد میں نظر جاتی ہے، اسلیے کلام کی بلاغت باقی تمام پہلوؤں پر مقدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام نے ابتدا سے قرآن مجید کے وجوہ بلاغت کو نمایاں کرنے کی طرف توجہ کی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ناگزیر تھا کہ نقد ادبی کے قواعد مدون کیے جاتے، محاسن کلام کا تتبع کیا جاتا اور یہ متعین کیا جاتا کہ کلام کا حسن کن چیزوں میں ہے اور بیان کی خوبی کا معیار کیا ہے۔ چنانچہ علماء نے یہ کام بھی بہت بڑے پیمانہ پر انجام دیا اور علم البلاغت ایک مستقل فن بن گیا جس پر گذشتہ ایک ہزار سال میں دفتر کے دفتر لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن جس طرح منطق، فلسفہ اور علم الاخلاق وغیرہ میں یونان کے اثر نے مسلمانوں کو تحقیق کی سیدھی راہ سے ہٹا دیا، اسی طرح نقد ادبی میں بھی وہ خصوصیت کے ساتھ

ارسطو سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور مزید برآں عجمی مذاق نے بھی ان پر کافی اثر ڈالا۔ اسلیے ابتدائی دور کے چند مصنفین کو چھوڑ کر بعد کے اکثر و بیشتر اہل علم نقد ادبی کے انہی قواعد کی پیروی کرتے چلے گئے جنکی بنا ارسطو نے ڈالی تھی، اور جنکو عجمی تکلفات کے اثر نے اور زیادہ مسخ کر دیا تھا۔ سمجھا یہ جانے لگا کہ کلام کا حسن تشبیہ و استعارہ و مجاز میں ہے اور صنائع و بدائع اسکی زینت ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ علم بلاغت کا ارتقا صحیح ذوق ادب سے بہت کچھ منحرف ہو گیا اور بلاغت قرآنی کے وجوہ نمایاں ہونے کے بجائے اور زیادہ مستور ہوتے چلے گئے۔

مولانا حمید الدین مرحوم کی خدمات میں سے یہ خدمت بھی بڑی قابل قدر ہے کہ انہوں نے علم بلاغت کو صدیوں کے یونانی و عجمی اثرات کی گرفت سے نکال کر از سر نو مدون کرنے کی بنا ڈالی۔ ان کا زیر نظر رسالہ اگرچہ نہایت مختصر ہے، مگر اس میں انکی شان تحقیق و اجتہاد کا کمال نظر آتا ہے۔ انہوں نے اگلوں کی دماغی غلامی سے آزاد ہو کر ان بہت سے غلط نظریوں کی تردید کی ہے جو خواہ مخواہ علم بلاغت کے مسلمات میں داخل ہو گئے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ ارسطو کے وضع کردہ اصولوں کی تو انہوں نے بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ بیخکنی کی ہے۔ پھر خود اپنے اجتہاد سے بلاغت کے اصول مرتب کیے ہیں جو ذوق ادب اور ذوق عربیت سے بھی مناسبت رکھتے ہیں اور جن سے کلام اللہ کی ادبی خصوصیات بھی زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ ہمارے عربی مدارس میں عموماً فن بلاغت کی تعلیم مختصر المعانی اور مطول جیسی کتابوں کے ذریعہ سے دی جاتی ہے جو ایک طرف فن تعلیم کے نقطۂ نظر سے انتہائی ناقص کتابیں ہیں اور دوسری طرف فن بلاغت کے اس دور کی تصنیف ہیں جبکہ یہ فن عجمیت و یونانیت کی آمیزش سے اپنے انحطاط کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان کتابوں میں طلبہ کا وقت ضائع کرنے کے بجائے مولانا حمید الدین مرحوم کے اس رسالہ کو داخل نصاب کیا جائے۔

یہاں یہ کہدینا بھی ضروری ہے کہ مولانا کے اس رسالہ کو جدید طرز پر اصول بلاغت کی تدوین کی راہ میں آخری چیز نہیں بلکہ ابتدائی چیز سمجھنا چاہیے۔ موجودہ دور میں نقد ادبی کا فن ایک بہت بڑا فن بن چکا ہے

اور ترقی یافتہ زبانوں میں اس پر بہت کام کیا گیا ہے۔ اگر کوئی صاحب ہمت اٹھے تو اس فن کے مطالعہ سے مولانا مرحوم کی قائم کردہ بنیادوں پر بڑی عمارت تعمیر کر سکتا ہے۔

تعلیم القرآن | مولوی محمد عبدالرحیم صاحب۔ دارالاشاعت تعلیم القرآن، قطبی گوڑہ جدید، حیدرآباد دکن۔

صاحب موصوف نے قرآن مجید کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے تفسیر قرآن کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو بیس صفحے کے رسالوں کی صورت میں مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ اب تک پارۂ عم تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ہر سورہ کے آغاز میں سورہ کے مضامین کا خلاصہ اور اس کے متعلق ضروری معلومات دینے کے بعد تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ دو دو چار چار آیتیں نقل کر کے پہلے ان کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ دیا ہے، پھر آیات کا مربوط ترجمہ ہے، پھر لغات کی تشریح ہے اور آخر میں تفسیر ہے۔ تفسیر قابل اطمینان ہے، صحیح عقائد کے مطابق ہے، اور عامۃ الناس کو قرآن کے مطالب سے جس قدر آشنا ہونا چاہیے اس کے لیے کافی ہے۔ ہر رسالہ کی قیمت ۱ر اور محصول ڈاک ۱ پائی ہے۔ ایک جلد کی قیمت (جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی) چار روپیہ مع محصول ڈاک رکھی گئی ہے۔

تدوین حدیث | مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ ضخامت ۱۰۶ صفحات۔

حدیث کے متعلق آج کل علم کی کمی اور اجتہاد کی جرأت بیجا کے سبب سے جو شبہات بکثرت پھیل گئے ہیں، انکی تردید میں بہت سے اہل علم حضرات نے مفید مضامین لکھے ہیں، مگر ہماری نظر میں مولانا مناظر احسن صاحب کے اس خطبہ سے زیادہ جامع، تشفی بخش اور فوائد سے لبریز کوئی چیز ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ یہ خطبہ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے توسیعی خطبات کے سلسلہ میں پڑھا گیا تھا اور وہیں کے مجموعۂ تحقیقات علمیہ میں شائع ہوا ہے۔ جو لوگ حدیث کے بارے میں اپنے شکوک کو واقعی رفع کرنا چاہتے ہیں، یا حقیقت امر سے آگاہ ہونے کے خواہشمند ہیں انکو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کتاب پر نہ تو قیمت لکھی گئی ہے اور نہ یہی لکھا ہے کہ کوئی منگانا چاہے تو کہاں سے منگائے۔ بہتر ہو کہ مولانا

ممدوح اسکی کثرت اشاعت کے لیے کوئی تدبیر فرمائیں۔

النبی الخاتم تالیف مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ ضخامت ۲۱۰ صفحات۔ قیمت مجلد ۱۲ر مکتبہ الفرقان، بریلی۔

سیرۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوٹی بڑی کتابیں تو بے شمار ہی لکھی گئی ہیں، مگر یہ مختصر سی کتاب اپنے رنگ میں بالکل نرالی ہے۔ مصنف کا خطیبانہ طرز بیان اور بعض مقامات پر بائیبل کا سا اسلوب اول اول پڑھنے والے کو ذرا پریشان کر دیتا ہے لیکن جب آدمی ان کے طرز خاص سے ذرا مانوس ہو جائے تو اس سے بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس میں سیرت پاک کے بہت سے اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو عموماً سیرت نگاروں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں، بہت سی بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے لطیف نکات پیدا کیے گئے ہیں، اور اسکے صفحات میں جگہ جگہ آدمی کو ایسی معلومات بکھری ہوئی ملتی ہیں جو شائد سیرت کی بڑی بڑی کتابوں میں بھی اسے نہ ملینگی۔

اسلام کیسے شروع ہوا؟ تالیف جناب عبدالواحد سندھی جامعی۔ ضخامت ۳۰۸ صفحات قیمت مجلد عہ۔ مکتبۂ جامعہ، دہلی۔

سندھی صاحب بچوں کے لیے مذہبی کتابیں لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے۔ اس سے پہلے وہ سیرت پاک اور قرآن کے متعلق دو اچھی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اب یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر انکی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے پہلے مختصراً اسلام کی تعلیم کا خلاصہ بیان کیا ہے، پھر یہ بتایا ہے کہ اس تعلیم کو لیکر ابتدا سے دنیا میں نبی آتے رہے، پھر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اسکی تکمیل کا ذکر کیا ہے، پھر یہ بتایا ہے کہ آخری رسول پاک نے کس طرح مشکلات کا مقابلہ کرکے لوگوں کی اصلاح کی اور ۲۳ سال کی مدت میں سارے ملک عرب کو مسلمان بنا کر چھوڑا۔ مصنف کی زبان شیریں اور سلیس ہے۔ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ نبی صلعم کی مکی زندگی کے واقعات کو بڑے سبق

آموز پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے امید ہے کہ بچوں کی ذہنیت پر اچھا اثر پڑیگا۔ مگر افسوس ہے کہ اس کتاب میں کتابت کی غلطیاں مکتبۂ جامعہ کی دوسری کتابوں کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔

تاریخ اسلام (حصہ دوم) | شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی۔ ضخامت ۴۷۴ صفحات۔ قیمت سے پتہ دار المصنفین، اعظم گڈھ۔

"تاریخ اسلام" کے نام سے دار المصنفین نے جو سلسلہ شائع کرنا شروع کیا ہے اس کے پہلے حصہ (مشتمل بر دور خلفاء راشدین) پر ان صفحات میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ زیر نظر کتاب اس کا دوسرا حصہ ہے جس میں بنی امیہ کے دور حکومت کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ اسلامی تاریخ کے متعلق ہمارے اور جناب مؤلف کے نقطۂ نظر میں جو اختلاف ہے اسکو ہم پہلے حصہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں، لہذا یہاں اس کے اعادہ کی حاجت نہیں۔ اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ کتاب تاریخی معلومات کی حیثیت سے اچھی اور مفید ہے۔ اردو زبان میں مسلمانوں کی ایک مستند اور مربوط تاریخ کی جو کمی تھی، امید ہے کہ اس سلسلہ کی تکمیل کے بعد وہ پوری ہو جائیگی۔ بنی امیہ کے لیے بحیثیت مجموعی، اور ان کے ایک ایک فرمانروا کے لیے فرداً فرداً جو وکیلانہ رویہ اس کتاب میں اختیار کیا گیا ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ ہر ایک کی برائیاں اور بھلائیاں جو تاریخ سے ثابت ہیں، جوں کی توں بیان کر دی جاتیں، اور جو تہمتیں ان پر ثابت نہیں ہیں انکی تردید کر دی جاتی۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ وکیلانہ طرز بیان ایک مورخ کے لیے موزوں نہیں ہے۔

حیات احمد بن حنبل | تالیف مولانا شاہ محمد عزیز الدین صاحب پھلواروی۔ ضخامت ۶۵ صفحات۔ قیمت ۶ر۔ مجیبیہ بک ڈپو، پھلواری ضلع پٹنہ۔

امام احمد رحمۃ اللہ کے حالات میں یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو خاصی تلاش و محنت سے لکھا گیا ہے۔ اگرچہ امام کی عظیم الشان شخصیت اور انکے جلیل القدر کارناموں کو نمایاں کرنے کے لیے تو ایک مبسوط کتاب درکار ہے، اور یہ مختصر رسالہ انکی سیرت نگاری کا حق ادا کرنے کے لیے کسی طرح بھی کافی نہیں ہو سکتا،

تاہم اردو خواں حضرات اس رسالہ سے بھی کسی حد تک اندازہ کر سکینگے کہ امام کس پایہ کے شخص تھے۔

خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں | مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، ضخامت ۱۲۴ صفحات۔ قیمت ۱۰ ار۔ مکتبۂ الفرقان، بریلی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، مصنف نے اس کتاب میں خاکسار تحریک پر دو حیثیتوں سے بحث کی ہے، ایک یہ کہ جن نظریات اور اصولوں پر اس تحریک کی بنا رکھی گئی ہے وہ دین اسلام سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ سیاسی حیثیت سے یہ تحریک مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید ہے۔ بحث کا تمام تر مدار خود اس تحریک کے مستند لٹریچر پر رکھا گیا ہے، یا پھر ایسے واقعات پر جو ناقابل انکار ہیں۔ طرز بحث نہایت سنجیدہ اور منصفانہ ہے، اور اگر کوئی شخص واقعی امر حق معلوم کرنے کا خواہشمند ہو تو یہ کتاب اس کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر | مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب۔ ضخامت ۳۴۲ صفحات۔ قیمت قسم خاص مجلد ۳؎ غیر مجلد ۲؎ قسم عام مجلد ۲؎ غیر مجلد ۱؎۔ دفتر الفرقان بریلی۔

الفرقان کو اس سے پہلے حضرت شاہ اسماعیل شہید اور حضرت شیخ احمد سرہندی رحمہما اللہ کے حالات میں دو مستقل نمبر شائع کرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اب اسی سلسلہ میں اس نے یہ تیسرا نمبر شائع کیا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی سیرت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تیسرا نمبر خود الفرقان کے بھی پچھلے دونوں نمبروں سے بازی لے گیا ہے، اور اس حیثیت سے بھی بے مثل ہے کہ شاہ صاحب اور ان کے دور اور انکے کارناموں کے متعلق نہ تو اتنی معلومات اس سے پہلے کہیں جمع کی گئی تھیں، اور نہ قلیل التعداد اہل علم کے ماسوا اس عظیم الشان شخصیت سے عامۂ خلائق کو کبھی اتنی تفصیل کے ساتھ روشناس ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس مجموعہ میں صرف شاہ صاحب کی سیرت ہی بیان نہیں ہوئی ہے، بلکہ تاریخ، عقائد، اصول دین، کلام، فقہ، حدیث اور مختلف موضوعات پر بھی بہت سی بیش قیمت معلومات ضمناً فراہم ہو گئی ہیں جو ناظرین کے لیے انشاء اللہ

ازدیاد بصیرت کی موجب ہونگی۔

خلافت وسلطنت | تالیف ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ قیمت اور مقام اشاعت درج نہیں۔ مؤلف سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔

یہ اُس مقالہ کا اردو ترجمہ ہے جو مولف نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے لندن یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ اِس کا نام غلط فہمی میں ڈالنے والا ہے۔ آدمی اس نام کو پڑھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ شاید اس میں خلافت اور سلطنت کے اصولی فرق و امتیاز کو نمایاں کیا گیا ہوگا۔ مگر دراصل یہ ایک تاریخی مضمون ہے جس میں مسلمانوں کی تاریخ کے اُس خاص دور سے بحث کی گئی ہے جبکہ عباسیوں کی نام نہاد خلافت سیاسی اقتدار سے محروم ہو کر رفتہ رفتہ ایک قسم کی مذہبی پاپائی میں تبدیل ہوگئی تھی اور اُسکے زیر اثر ممالک میں حکمرانی کے عملی اختیارات پر دوسرے متصرف ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس دور کی تاریخی و سیاسی تحلیل کر کے یہ دکھایا ہے کہ ایک ہی خطۂ ارضی میں "مذہبی خلافت" اور "سیاسی سلطنت" کے دو مختلف النوع ادارے کس طرح پیدا ہوئے، کس طرح انکا ارتقا ہوا اور تین چار سو برس تک اِن کے درمیان کس قسم کے تعلقات رہے۔

موضوع بلاشبہ دلچسپ ہے اور ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھا تاریخی مواد فراہم کیا ہے، لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ اِس مواد پر بحث کا جو انداز انہوں نے اختیار کیا ہے وہ اہلِ یورپ کے تاریخی ذوق سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام اور اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اُنکی بحث نہ صرف ناقص ہے بلکہ مسائل کو صاف کرنے کے بجائے اور زیادہ الجھا دیتی ہے۔ اگر وہ مغربی مذاق کے بجائے اسلامی مذاق کی رعایت کرتے تو پہلے خلافت کے معنی و مفہوم کو متعین کرتے، پھر واضح طور پر یہ بتاتے کہ عباسیوں نے پاپائی اور قیصریت کے جس مجموعہ پر لفظ "خلافت" کا اطلاق کیا تھا وہ حقیقی اسلامی خلافت سے کس قدر مختلف تھا اور اِن دونوں حقیقتوں کی وضاحت کرنے کے بعد اپنا تاریخی بیان پیش کرتے۔ اس تنقیح

کے بغیر ڈاکٹر صاحب نے جس طرح واقعات کو بیان کیا ہے اُس سے یہ غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ واقعی وہ مذہبی خلافت تھی جس سے آخر کار سلطنت جدا ہوئی۔ حالانکہ دراصل جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ ابتدائی شاہان عباسیہ کی بنائی ہوئی معجون مرکب تحلیل ہوگئی، اسکے ایک جزو یعنی پاپائی کو بعد کے عباسی سنبھال کر بیٹھ گئے اور دوسرے جزو یعنی قیصریت کو دوسروں نے بانٹ لیا، اور پھر یہ دونوں گروہ مذہبی اصطلاحوں اور مذہبی لباسوں کو محض سیاسی چال کے طور پر استعمال کر کر کے صدیوں تک عوام کو دھوکا دیتے رہے۔

فتنۂ رہبانیت تالیف جناب مرزا عزیز صاحب فیضانی۔ ضخامت ۴۶۴ صفحات۔ قیمت اکیس روپیہ۔ ملنے کا پتہ مرزا محبوب عالم صاحب۔ فیضانی منزل۔ اسلامیہ پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

اس کتاب میں مصنف نے پہلے دنیا پرستی اور ترکِ دنیا کے درمیان اسلام کی راہِ توسط و اعتدال کو بیان کیا ہے، پھر رہبانیت کی حقیقت بیان کرنے کے بعد نہایت تفصیلی تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ یہ کن کن شکلوں میں ظہور کرتی ہے، اور کس کس طرح انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثر ڈالتی ہے۔ آخر میں دنیا کو برتنے کے متعلق اسلام کے احکام کی تفصیلات دی ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا طریقہ رہبانیت کے طریقہ سے کس قدر مختلف ہے۔ کتاب نہایت جامع ہے، خصوصاً رہبانیت کی خفی سے خفی صورتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے اور اسلام و رہبانیت کے بیشمار مرکبات کا تجزیہ کر کے اصل فتنہ کا سراغ لگانے میں مصنف نے دقیقہ رسی کا حق ادا کر دیا ہے۔

ہندوستان کی کہانی تالیف مولوی عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی۔ ضخامت ۷۶ صفحات۔ قیمت ۱۲ر۔ دار المصنفین، اعظم گڈھ۔

اب تک ہندوستان کی تاریخ جس رنگ میں ہندوستانی بچوں کو پڑھائی جاتی رہی ہے اس نے یہاں کے باشندوں کو ایک دوسرے کے لیے درندہ بنا دیا ہے اور انکے درمیان مستقل قومی عداوتوں کے بیج بو دیے ہیں۔ اصلاح حال کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے سامنے اس ملک کی تاریخ ہر قسم کے

زہر سے پاک کرکے مجرد تاریخ کی حیثیت سے پیش کی جائے۔ دارالمصنفین اور مولوی عبدالسلام صاحب دونوں ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہمارے بچوں کے لیے ایسی ایک بے زہر تاریخ مہیا کردی ہے کم از کم غیر سرکاری مدرسوں کے لیے تو یہ موقع ہے کہ اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کرلیں۔

ابن خلدون | مولانا عبدالسلام ندوی۔ ضخامت ۲۶۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ دارالمصنفین، اعظم گڈھ۔

یہ کتاب دراصل ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری کے اس مقالہ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے فرانس کی سربون یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیا تھا۔ اصل مقالہ فرنچ میں تھا۔ پھر اس سے عربی میں ترجمہ ہوا اور اب عربی سے اردو میں منتقل ہوا ہے۔ ابتدا میں مصنف نے ابن خلدون کے ذاتی حالات زیادہ تر اسکی اپنی خودنوشت سوانح عمری سے اخذ کرکے مرتب کیے ہیں، پھر تاریخ و اجتماعیات کے متعلق اسکے فلسفہ کی تشریح توضیح اور تنقید کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان علوم میں اس مشہور مفکر کا اصلی مقام کیا ہے۔ کتاب اہل ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، اور فاضل مترجم نے ترجمہ بھی اس قدر رواں اور شگفتہ کیا ہے کہ کتاب پڑھتے وقت کم ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔

مفتاح القرأۃ | مرتبہ مولانا عبداللہ رشیدی صاحب خطیب سورتی جامع مسجد، رنگون۔

بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کا جو طریقہ ہندوستان میں رائج ہے اس میں من جملہ بہت سی خرابیوں کے ایک خرابی یہ بھی ہے کہ تجوید کے قواعد کا مطلق لحاظ نہیں رکھا جاتا اور ابتدا سے بچوں کو غلط تلفظ اور غلط لہجہ میں قرآن پڑھنے کی عادت پڑجاتی ہے۔ مولانا عبداللہ رشید صاحب نے اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے یہ قاعدہ مرتب کیا ہے۔ چونکہ فاضل مرتب محض ایک ماہر فن قاری ہی نہیں ہیں بلکہ انہیں تعلیم کا بھی بہت طویل تجربہ ہے اسلیے قاعدہ کی ترتیب ایسی اچھی ہے کہ اب تک اس سے بہتر قاعدہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ ابتدا میں استادوں کی ہدایت کے لیے طریق تعلیم کی کافی توضیح کردی گئی ہے، اور قاعدہ کے دوران میں بھی اکثر اسباق کی مشق کرانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ دراصل یہ قاعدہ بچوں کے لیے نہیں بلکہ استادوں کے لیے لکھا گیا ہے۔

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول سنہ ۶۰ھ (مطابق مئی سنہ ۱۹۴۱ء) جلد ۱۸۔ عدد ۳

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۷۰
دستورِ جماعت اسلامی	〃	۱۷۷
مقالات:-		
اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عالم	مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی	۱۸۳
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۱۱
معراج کی رات	〃	۲۳۵

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ میں طبع ہو کر

دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ۔ مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

محرم کی اشاعت میں جماعت اسلامی کی تشکیل کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا اس کو دیکھ کر ہی بہت سے اللہ کے بندوں نے ایسی ایک جماعت میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا، بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے مقامی جماعتیں بننے کی اطلاعیں بھی آنی شروع ہو گئی تھیں۔ پھر صفر کی اشاعت میں درخواست کی گئی کہ جو لوگ اس نقشہ پر کام کرنا پسند کرتے ہیں وہ براہ کرم ہم کو اطلاع دیں تاکہ ان کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوئی صورت نکالی جا سکے۔ اس کے جواب میں بہت سے وہ لوگ بھی گویا ہوئے جو دل میں ارادہ رکھتے تھے مگر اب تک خاموش تھے۔ اس طرح وسط ماہ اگست تک تقریباً ڈیڑھ سو اصحاب کی فہرست تیار ہو گئی پھر یہ مناسب سمجھا گیا کہ ۱۵ر اگست کو لاہور میں ان اصحاب کا ایک اجتماع عام منعقد کر لیا جائے۔ چنانچہ اجتماع کی دعوت دے دی گئی۔ تاریخ مقررہ پر ۷۵ اصحاب تشریف لائے، جن میں سے بعض اپنی مقامی جماعتوں کے نمائندہ مختار تھے، اور بعض انفرادی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ چار روز تک مشاورت جاری رہی۔ جماعتی تشکیل کا جو ابتدائی خاکہ محرم کے پرچہ میں شائع کیا گیا تھا اس پر غور کیا گیا اور باہمی مشورہ سے بالاتفاق ایک دستور جماعت مرتب ہوا جو اس اشاعت میں درج کیا جا رہا ہے۔ پھر تمام اصحاب نے دستور کے مطابق پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کلمۂ شہادت ادا کیا اور جماعتی نظم کے ساتھ اسلامی نصب العین کے لئے جدوجہد کرنے کا عہد کیا۔ پھر آئندہ کام کے متعلق ایک پروگرام بھی طے ہو گیا جس پر توکلاً علی اللہ کام شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ سب مراحل خدا کے فضل سے بخوبی طے ہو گئے۔ اب آئندہ مراحل کی کامیابی رفقاء کے خلوص نیت اور اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔

دستور جماعت کے بارے میں چند کلمات بطور تشریح عرض کرنے ضروری ہیں۔ اگرچہ دستور کو پڑھ کر ہر شخص خود ہی اس جماعت کی نوعیت اور اس کی ترکیب اور اس کے مقصد کے متعلق بآسانی رائے قائم کر سکتا ہے، تاہم بعض امور ایسے ہیں جن کی توضیح دستور میں نہ کی جا سکتی تھی، لہٰذا یہاں ان کو بیان کر دیا جاتا ہے۔

اس دستور کی بنیاد جس خیال پر رکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اسلام کے کسی ایک جزو کو، یا مسلمانوں کے دنیوی مقاصد میں سے کسی مقصد کو لے کر نہ اٹھیں بلکہ اصل اسلام اور پورے اسلام کو لے کر اٹھیں جس مقصد کے لئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے وہی ہمارا مقصد ہو۔ جس چیز کی طرف انہوں نے دعوت دی اُسی کی طرف ہم دعوت دیں۔ جس طرز پر وہ ایمان لانے والوں کی جماعت بناتے تھے اسی طرز پر ہم جماعت بنائیں، جو نظام جماعت اُن کا تھا وہی ہمارا ہو، جن ضوابط کو وہ اپنی جماعت میں نافذ کرتے تھے انہی کو ہم بلا کسی کمی و بیشی کے نافذ کریں، اور جس طریقہ سے وہ اپنے نصب العین کے لئے جد و جہد کرتے تھے اسی طریقہ سے ہم جد و جہد کریں۔ غرض یہ کہ ہماری یہ تحریک ذرہ برابر نہ اسلام سے کم کسی چیز پر مشتمل ہو اور نہ اُس سے زائد، بلکہ پورے کے پورے اسلام ہی کو ہم اپنی تحریک بنالیں۔ اسی لئے ہم اُس جماعت کو جو اس دستور پر بنی ہے "جماعتِ اسلامی" کہتے ہیں کیونکہ اس کا عقیدہ، نصب العین، نظام جماعت، اور طریق کار بعینہٖ وہی ہے جو اسلامی جماعت کا رہا ہے۔

قریبی دور میں مسلمانوں میں جو تحریکیں اٹھی ہیں ان میں چار اصولی خرابیاں تھیں۔ ایک یہ کہ اُن میں نفس اسلام کو بنائے حرکت نہیں ٹھہرایا گیا تھا بلکہ ان کے اندر بنائے حرکت یا تو اسلام کا کوئی ایک جزو رہتا جس سے محرکین کو خاص دلچسپی تھی، یا مسلمانوں کا کوئی دنیوی مقصد تھا جسے براہ راست اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کا نظام جماعت بے کم و کاست اسلامی طرز کا نہ تھا بلکہ مختلف غیر مسلم جماعتوں کے نظام ترکیبی کی نقل کی گئی تھی۔ تیسرے یہ کہ ان میں تمام عرفی مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان سمجھ کر ہر قسم کے رطب و یابس آدمی بھر لئے گئے جن کی سیرتوں پر ہرگز وہ اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا جس کا ایک حقیقی مسلمان مستحق

ہوتا ہے، اور یہی چیز آخر کار ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بنی، کیونکہ عام ارکان سے لے کر کارکنوں اور لیڈروں تک کم ہی آدمی ایسے تھے جو اعتماد کے لائق ہوں۔ چوتھے یہ کہ ان کی دعوت عام نہ تھی، صرف پیدائشی مسلمانوں تک محدود تھی، اور غیر مسلموں کے لئے صرف یہی نہیں کہ اُن میں کوئی کشش نہ تھی بلکہ بالفعل اُن میں سے اکثر میں غیر مسلموں کو اسلام سے اور زیادہ دور بھگا دینے کا سامان موجود تھا۔

ہم نے ان چاروں خرابیوں سے بچنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ یہاں عین اسلام ہی کو بنائے حرکت بنایا گیا ہے۔ نظام جماعت بے کم و کاست وہی کا وہی لیا گیا ہے جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ جماعت کا تھا۔ جماعتی ضوابط ایسے رکھے گئے ہیں کہ مسلمانوں کی قوم میں سے صرف وہ صالح عنصر چھٹ کر جماعت میں آئے جو حقیقت میں ایمان و عمل صالح کی دولت رکھتا ہو۔ اور جماعت کی دعوت محض پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھی گئی ہے بلکہ تمام روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کے لئے عام ہے، آدم کا جو بیٹا اور جو بیٹی توحید الٰہ کا اعتقاد، محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع، حکومت الٰہیہ کا نصب العین اور ضابطۂ شریعت کی پابندی قبول کرلے اس کے لئے جماعت اسلامی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

"جماعتِ اسلامی" کے نام سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس جماعت سے باہر جو لوگ ہیں ان کو ہم غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ ہم نے یہ نام جس وجہ سے اختیار کیا ہے وہ اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کے مسلک میں نہ اسلام سے کم کوئی چیز ہو نہ اُس سے زائد جس کا عقیدہ وہی ہو جو اسلام کا ہے، نصب العین وہی ہو جو اسلام نے پیش کیا ہے، نظام جماعت وہی ہو جس کا نقشہ کتاب و سنت میں ملتا ہے، اور کام کا ڈھنگ وہی ہو جو انبیاء نے سکھایا ہے، اس کے لئے آخر جماعت اسلامی کے سوا اور کیا نام ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ہرگز یہ فرض نہیں کرتے اور ایسا فرض کرنے کا ہم کو حق نہیں ہے کہ ایمان بس اسی جماعت کے اندر منحصر ہے اور اس کے باہر جو لوگ ہیں وہ مومن نہیں ہیں۔ بلکہ اگر کوئی اس جماعت کی مخالفت کرے تب بھی مجرد اس کی مخالفت کی بنا پر ہم اس کو غیر مومن نہیں کہہ سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں ایمان اُس جماعت کے اندر ہی منحصر ہوتا تھا جو انبیاء کی قیادت میں بنتی تھی، اور یہ بھی صحیح ہے کہ انبیاء کے بعد اُن کے خلفاء کے عہد میں جب تک اصل جماعت کا نظام

برقرار رہا، اُس سے علیحدہ رہنے کے معنی اسلام سے علیحدگی ہی کے تھے جیسا کہ صریح طور پر نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ لیکن بہت بڑا فرق ہے اُس جماعت میں جو ابتدا میں نبی کے زیر قیادت بنی ہو اور اُس جماعت میں جو ابتدائی نظام جماعت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد دوبارہ اس کی تجدید کے لئے کوشش کرے پہلی جماعت دنیا میں صرف ایک ہی ہوگی اور اس کے باہر کفر ہوگا، مگر دوسری قسم کی جماعتیں دنیا میں بہت سی ہو سکتی ہیں اور اُن میں سے کسی جماعت میں شامل نہ ہونے کے اسباب کفر و نفاق کے سوا اور بھی ہو سکتے ممکن ہیں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص ہم سے زیادہ صاحب ایمان ہو اور وہ نیک نیتی کے ساتھ کسی غلط فہمی کی بنا پر ہماری مخالفت کرے۔ اپنی حد تک ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ اپنے مسلک اور طریق کار کو عین اسلام کے مطابق رکھیں تاکہ کسی شخص صالح و مومن کے لئے ہم سے علیحدہ رہنے کی کوئی وجہ نہ ہو اور اس طرح تمام اہل ایمان آخر کار ایک ہی نظام میں منسلک ہو سکیں، لیکن اپنی اس آرزو کو ایک حاصل شدہ واقعہ فرض کر کے ہم ہرگز فتنہ میں نہ پڑیں گے۔ ہم کو ہر حال مسلمانوں میں ایک فرقہ بننے سے بچنا ہے اور اُس غلو سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں جو ہمیں خیر کے بجائے شر کا خادم بنا دے۔

ہمارے نصب العین میں محض لفظ "حکومت" کو دیکھ کر بعض لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے سیاسی اقتدار کو اپنا مقصود بنایا ہے اور اسلام کو بالکل ایک سیاسی چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ دراصل زمین و آسمان کا فرق ہے مجرد حکومت میں اور اُس حکومت الٰہیہ میں جس کو ہم اپنا نصب العین کہتے ہیں۔ "حکومت الٰہیہ کے قیام" سے ہماری مراد بعینہٖ وہی ہے جو لیظھرہ علی الدین کلہ سے قرآن کی مراد ہے، اور یہ ہمارا خود ساختہ نصب العین نہیں ہے بلکہ اللہ نے اپنے نبی کی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ اگر اس چیز کو اپنی سعی و جہد کا مقصود بنانے پر کوئی ہمیں الزام دینا چاہتا ہے تو وہ خود ہی سوچ لے کہ وہ کس کو الزام دے رہا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے ہم نے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام "اسلام" یعنی اللہ تعالیٰ

کی اطاعت پر قائم ہے۔ اس نظام کے اندر انسان جس کو طاعت و عصیان کا اختیار دیا گیا ہے، اگر اپنے دائرۂ اختیار کی حد تک اللہ کی اطاعت سے آزاد ہو جائے اور اپنے نفس کا حکم یا کسی اور کا حکم ماننے لگے تو یہ نہ صرف حق کے خلاف ہے، نہ صرف فطرت کائنات اور فطرت انسانی کے خلاف ہے، بلکہ اس کا لازمی نتیجہ فتنہ و فساد ہے، کیونکہ اللہ کے سوا کائنات کے کسی جزء میں کسی حیثیت سے بھی کسی دوسرے کا حکم چلنا نظام کائنات کی اُس ہم آہنگی کی ضد واقع ہو جاتا ہے جو اقتدار اعلیٰ کی وحدت پر قائم کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فتنہ کو مٹانا چاہتا ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ انسان جس طرح غیر شعوری طور پر مُسلم ہے اُسی طرح شعوری طور پر بھی اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر کے اور اس کے امر تشریعی کی ماتحتی قبول کر کے مسلم ہو جائے۔ اِسی چیز کا نام "الاسلام" اور "الدین" ہے جیسا کہ فرمایا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ لیکن اللہ اس کام کو اپنی قدرت قاہرہ کے زور سے جبراً نہیں کرتا، بلکہ انبیاء کے ذریعہ سے انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ تم الدین اور الاسلام کو اختیار کرو۔ پھر انسانوں میں سے جو لوگ اسے اختیار کریں اُن کو وہ اپنی پارٹی بناتا ہے اور اس بات پر امور کرتا ہے کہ پہلے تو تم فتنے کو مٹاؤ، یعنی میری زمین میں میرے سوا جس جس کا حکم چل رہا ہے اس کی حکمرانی کا خاتمہ کر دو، پھر اس بات کی کوشش کرو کہ سب انسان الدین اور الاسلام کو اختیار کر لیں۔ وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ، اور ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ۔ پس دراصل غیر الٰہی اقتدار کے فتنے کو مٹانا اور انسانی زندگی کے اختیاری حصہ میں اللہ کی حکومت قائم کرنا تو عین مقصد بعثتِ انبیاء ہے اور اللہ کے حکم سے انبیاء کرام نے جہاں بھی جماعت اسلامی بنائی ہے، اس کا مقصد وحید یہی رہا ہے۔ اِس مقصد کو سن کر اگر لوگ چونکتے ہیں تو بجز اس کے کہ ہم قرآن کے علم سے ایسے لوگوں کی محرومی پر ماتم کریں اور کیا کر سکتے ہیں۔

رہا بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اس نصب العین میں روحانیت کے بجائے اُدّیت ہے، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جو لوگ ایسا خیال رکھتے ہیں وہ دراصل روحانیت کے اسلامی تصور کے بجائے کسی جاہلی تصور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسلام میں روحانیت کا کوئی تصور قربِ خداوندی کے سوا نہیں ہے۔ اور خدا سے قرب کی اس سے بڑھ کر کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی کہ ایک مشن میں انسان اور خدا دونوں ایک دوسرے کے رفیقِ کار اور ساتھی ہوں۔ نماز میں، روزے میں اور تمام عبادات و معاملات میں تو بندہ عبد ہے اور خدا معبود۔ مگر قیامِ حکومتِ الٰہیہ کی جدوجہد میں عبد کو یہ شرف نصیب ہوتا ہے کہ وہ معبود کا رفیق بن جاتا ہے، معبود اس کا مددگار ہوتا ہے اور وہ معبود کا مددگار۔ کیا بندے کے لئے اس سے بڑھ کر بھی روحانی ترقی و عروج کے کسی مرتبے کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افضل الناس مومن مجاھد بنفسہ و مالہ فی سبیل اللہ۔ پس ہمارے نزدیک تو یہ بات علم دین کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ جو چیز کمال روحانیت بلکہ بلند ترین مرتبۂ روحانیت کی طرف لے جانے والی ہے اُس میں کسی کو اُدّیت کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

طبقات کی جو تقسیم دستور میں کی گئی ہے وہ بظاہر ایک اجنبی چیز معلوم ہوگی اور شاید اعتراض کیا جائے کہ یہ چیز تم نے خود ایجاد کی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دورِ نبوت میں اس چیز کا نشان ملتا ہے، اور خود قرآن میں اس کی طرف صریح اشارات موجود ہیں۔ مثلاً ایک وہ گروہ ہے جس کے متعلق فرمایا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (اہل ایمان میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو سچا کر دکھایا)۔ یہ لوگ ہر قربانی کے لئے مستعد تھے، ہر پکار پر لبیک کہتے تھے، اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کی خاطر کوئی چوٹ کھانے اور کوئی مشقت برداشت کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کے متعلق فرمایا لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ

وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ..... وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ۔

یہ وہ لوگ تھے جو دل سے تو سچے خیر خواہ تھے اور دل میں تمنا بھی رکھتے تھے کہ راہ خدا میں جانفشانی دکھائیں، مگر اپنے حالات سے واقعی مجبور تھے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایمان رکھتے تھے، ایمان کے کم سے کم مقتضیات کو پورا بھی کرتے تھے مگر محض ضعف ایمانی کی وجہ سے راہ خدا میں کوئی بڑی چوٹ سہنے اور کسی بڑے نقصان کو برداشت کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

یہاں تمام آیات کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا ہے کہ طبقات کی یہ تقسیم کتاب و سنت ہی کے اشارات سے ماخوذ ہے اور اس کو موجودہ حالات پر کافی غور و خوض کے ساتھ منطبق کیا گیا ہے۔ ان مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ اس طرح ہر طبقہ اپنے حدود کو پہچان کر اپنے دائرۂ عمل میں کام کرے گا، اور ایک طبقہ کی کمزوریاں دوسرے طبقہ کے لئے بندِ پا نہ بن سکیں گی۔ ان کو خلط ملط کر دینے میں یہ اندیشہ ہے کہ ضعفاء اپنی مصلحتوں کی خاطر نہ خود کوئی بڑا کام کر سکیں گے اور نہ دوسروں کو کرنے دیں گے۔

دستور جماعت اسلامی

عقیدہ

۱- جماعت اسلامی کا بنیادی عقیدہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے یعنی صرف اللہ ہی ایک الٰہ ہے، اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

تشریح:- اس عقیدہ کے پہلے جزء یعنی اللہ کے الٰہ واحد ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب ہے کہ زمین اور آسمان، اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے، سب کا خالق، پروردگار، مالک، مدبر اور حاکم صرف اللہ ہے، ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریادرس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہی نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امید بیم وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک وہی اکیلا ہے۔ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے، کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اسکی سفارش سے قضائے الٰہی ٹل سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیا یا اولیاء۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے، کسی کی نیازمندی نہ اختیار کرے، کیونکہ تنہا وہی عبادت کا مستحق ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک، مقتدر اعلیٰ نہ تسلیم کرے، کسی کو باختیار خود حکم دینے

اور منع کرنیکا مجاز نہ سمجھے، کسی کو شارع اور قانون ساز نہ مانے، اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کردے جو ایک اللہ کی اطاعت کے ماتحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک، اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے، اسکے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدہ کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ دے، اور اللہ کا بندہ بنکر رہے جسکو اس نے الاتسلیم کیا ہے۔ اسنے آپکو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز، حتی کہ اپنی جان، اپنے اعضاء، اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اسکی طرف سے امانت سمجھے۔ اسنے آپکو اللہ کے سامنے ذمہ دار و جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اسے اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔ اللہ کی رضا اور اسکے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھیرائے۔ اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت، اور صرف اسکے مقرر کیے ہوئے ضابطہ کو ضابطہ تسلیم کرے، اور ہر اس طریقہ کو رد کردے جس کا اللہ کی طرف سے ہونا ثابت نہ ہو۔

اس عقیدہ کے دوسرے جز یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سلطانِ کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعے سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا، اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کرکے ایک مکمل نمونہ قائم کردینے پر مامور کیا گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان ہر اس[1] تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ اسکو[2] کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسول خدا سے ثابت ہے، اسکے سوا کسی دوسری دلیل پر اسکی اطاعت موقوف نہ ہو۔ رسول[3] خدا کے سوا وہ کسی کی پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے، دوسرے انسانوں کی پیروی صرف اس حد تک ہو جس حد تک وہ رسول خدا کے پیرو ہوں، اور صرف اُن معاملات میں ہو جن میں اُنکے طریقہ کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ماخوذ ہونا ثابت ہو جائے۔ وہ[4] اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اسکے رسول کی سنت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ وہاں سے ثابت ہو اسے اختیار کرے، جو وہاں سے ثابت نہ ہو اُسے ترک کر دے، اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اُسے حل کرنے کے لیے اُسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔ تمام[5] عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی، کسی کی محبت یا عقیدت میں بھی ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسول خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آجائے یا اسکی مدمقابل بن جائے۔ رسول[6] خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اُس معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اُس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اسکو اُسی درجہ میں رکھے۔

نصب العین

۲۔ جماعت اسلامی کا نصب العین اور اسکی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں، حکومت الٰہیہ کا قیام، اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

تشریح:- جہاں تک امر تکوینی کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کی حکومت آپ اپنے زور پر قائم ہے اور اس سے بالاتر ہے کہ معاذ اللہ اُس کا قیام و بقاء بندوں کی مدد کا محتاج ہو۔ تمام مخلوقات خواہ ارضی ہوں یا سماوی، اسکے قہر و غلبہ سے مغلوب ہیں، اسکے زبردست قانون کی بندش میں جکڑی ہوئی ہیں، کسی میں اسکے حکم سے سرتابی کا یارا نہیں، اور دوسری مخلوقات کی طرح انسان بھی، خواہ مومن ہو یا کافر، اللہ کی تکوینی حکومت کے ماتحت محض ایک بندۂ مجبور ہے۔ لہذا حکومت الٰہیہ کے قیام سے مراد اللہ کی تکوینی حکومت کا قیام نہیں ہے، بلکہ دراصل اس سے مراد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے جسکا تعلق صرف انسان سے، اور انسان کی زندگی کے بھی اُس حصہ سے ہے جس میں اللہ نے انسان کو اختیار عطا کیا ہے۔

انسان کی زندگی کا جو حصہ حیوانی و طبعی ہے اسکو تو اللہ تعالیٰ نے حکم تکوینی کے ماتحت رکھا ہے، اور اس حصہ میں انسان دوسری تمام مخلوقات کی طرح بہرحال مسلم (مطیع) ہے، مگر جو حصہ انسانی ہے، یعنی جس میں انسان عقل اور تمیز استعمال کرکے خود اپنے ارادہ سے کام کرتا ہے، اس میں اللہ نے اسے آزادی عطا کی ہے کہ چاہے خود مختار بنکر کام کرے، چاہے اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ بن جائے، چاہے خود خدائی کا مدعی بنکر دوسروں کو اپنا بندہ بنائے، اور چاہے تو اپنے اصلی مالک کو پہچان کر برضا و رغبت اسکی بندگی اختیار کرلے۔ یہ آزادی جو اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی ان چاروں صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کرے وہ یکساں جائز اور حق ہے۔ نہیں، اس انتخاب و اختیار میں آدمی کو آزاد چھوڑنے کا مدعا دراصل امتحان اور آزمائش ہے۔ جائز اور حق تو صرف یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی اسی طرح اپنے خالق کا مطیع ہو جس طرح وہ اپنی زندگی کے غیر اختیاری حصہ میں اسکا مطیع ہے، کیونکہ حقیقت میں وہی ایک جائز فرمانروا ہے اور اسی کی اطاعت کائنات کے مجموعی نظام کے ساتھ صحیح مناسبت رکھتی ہے۔ لیکن اللہ نے اس حق پر انسان کو مجبور کرنے کے بجائے اُسے آزاد چھوڑ دیا ہے

تاکہ اگر وہ اس حق کو پہچانے اور آزادی رکھنے کے باوجود خود اپنی خوشی سے بندگی کا طریقہ اختیار کرے تو اسے ابدی انعام سے سرفراز کیا جائے، اور اگر وہ اسے نہ پہچانے یا پہچاننے کے باوجود خواہشات نفس کا ایسا غلام ہو کہ مالک حقیقی کی اطاعت گوارا نہ کرے تو اسکو ابدی سزا دی جائے۔

چونکہ اس امتحان و آزمائش کی غرض سے اللہ نے انسان کو خود آزادی عطا فرمائی ہے اس لیے وہ اپنی فرمانروائی کا حق تسلیم کرانے کے لیے اپنی اُس قاہرانہ طاقت سے کام نہیں لیتا جسکو وہ اگر چاہتا تو پہلے ہی استعمال کر سکتا تھا اور چاہے تو ہر وقت استعمال کر سکتا ہے۔ جبر و زور سے مغلوب کرنیکے بجائے وہ حجت و برہان کے ساتھ نصیحت اور فہمائش کرنے کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اور انسان کو سمجھاتا ہے کہ درحقیقت زمین و آسمان کا مالک میں ہوں، تو میری مخلوق اور میری رعیت ہے، اور تیرے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ جو امر واقعی ہے اسکو تسلیم کرکے تو میرا مطیع فرمان بندہ بن جائے۔ اس فہمائش کے کام میں اللہ نے سب سے پہلے تو اُن انسانوں سے مدد لی ہے جنکو اس نے اپنا رسول مقرر کیا تاکہ وہ دلائل سے انسان کو حقیقت نفس الامر یعنی اللہ واحد ہی کے تنہا مالک و مدبر کائنات اور حاکم ذی اقتدار ہونے کا یقین دلائیں اور بطوع و رغبت اسکی اطاعت اختیار کرنے پر راضی کریں۔ پھر جو انسان رسولوں کی فہمائش سے حقیقت کو جان گئے ہوں اور جان کر اسکے پیرو بن چکے ہوں اُن سے اللہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم اس کام میں میری مدد کرو۔ چنانچہ قرآن میں بار بار فرمایا گیا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ (اے ایمان لانے والو! اللہ کے مددگار بنو) اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ (اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کریگا) وَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ (اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اسکی اور اسکے رسولوں کی مدد کرتا ہے، درانحالیکہ اللہ پردۂ غیب میں چھپا ہوا ہے) وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ (اور اللہ ضرور ہی اسکی مدد کریگا جو اللہ کی مدد کریگا)۔ پس اللہ کی حاکمیت کا اقرار کرکے اور اسکی بندگی اختیار کرکے مومن کا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اسکے بعد یہ خدمت اسکے سپرد کی جاتی ہے کہ وہ جاہل انسانوں کو اسی حقیقت سے واقف کرائے جس سے وہ خود واقف

ہوا ہے، اور باغی انسانوں کو اُسی حاکم اعلیٰ کی اطاعت پر آمادہ کرے جس کا وہ خود مطیع بنا ہے۔ اسی خدمت کی انجام دہی میں اللہ کی رضا ہے، اور اسی کے لیے اللہ اور مومن کے درمیان وہ معاہدہ عمل میں آتا ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ:-

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ	درحقیقت اللہ نے (اپنے کام کے لیے) مومنوں سے انکی جانوں
اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور انکے مالوں کو خرید لیا ہے جسکے معاوضہ میں انکے لیے جنت ہے
فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ	وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں (اور اس لڑائی میں) مارتے بھی ہیں اور
وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ	مارے بھی جاتے ہیں (اسکے معاوضہ میں جنت کا) وعدہ اللہ کے ذمہ ہے
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ	اور یہ پکا وعدہ ہے جو توراۃ اور انجیل اور قرآن میں کیا گیا ہے اور
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ - ۱۴)	اللہ سے بڑھکر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے،

لہٰذا اپنی اُس بیع پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ کے ساتھ طے کی ہے کہ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

انسان کی زندگی کے اختیاری حصہ میں اللہ کے جس قانون کی اطاعت مطلوب ہے وہ اسکا قانونِ تکوینی نہیں بلکہ اُس کا وہ قانونِ شرعی ہے جو رسولوں کے واسطہ سے آتا ہے اور اس قانون کا تعلق عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن اور سیاست وغیرہ سے ہے۔ محض تکوینی حیثیت سے اللہ کو خالق اور مدبر کائنات اور مالک ارض و سما مان لینا کافی نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے اسی کو بادشاہ اور حاکم اور قانون ساز ماننا بھی ضروری ہے اور اسی کے بتائے ہوئے اصول اخلاق اور حدودِ قانون کی پیروی لازم ہے۔ اگر صرف تکوینی حیثیت سے کوئی اللہ کو مانتا ہو اور لاشریک مانتا ہو، لیکن انسانی زندگی کے اختیاری حصہ میں خود اپنے مختار مطلق ہونے کا ادعا کرے، یا زمین کے کسی حصہ پر اپنی حاکمیت کا مدعی ہو اور کہے کہ یہاں میں اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہونگا حکم چلاؤنگا (جیسا کہ نظامِ بادشاہی میں ہر بادشاہ، نظامِ آمریت میں ہر ڈکٹیٹر، نظامِ برہمنی دیوتائی میں ہر مذہبی پیشوا، نظامِ جمہوری میں جمہوریت کا ہر شہری کہتا ہے، اور جیسا کہ انفرادی زندگی میں ہر اُس شخص کا نفس کہتا ہے جو خدا کی اطاعت کا قائل نہ ہو)

(بقیہ بر صفحہ ۷۳)

اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عالم

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی

(۲)

آمریت | زمانہ قدیم کی مطلق العنان بادشاہت اور جمہوریت کے مجموعہ کا نام آمریت ہے۔ اسلیے یہ دونوں کے معائب کی حامل ہے۔ بادشاہی کے معائب کا اقرار تو اب ہر شخص کو ہے اسلیے انکے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جمہوریت کے عیوب انشاء اللہ آئندہ سطور میں تحریر کیے جائینگے۔ حیرت اُن مدعیانِ عقل و دانش پر ہے جو ایک طرف آمریت کے ایسے مہمل نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف اسکے بھی مدعی ہیں کہ ہم انسانیت کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں اس سے بڑھکر انسانیت کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت خود اپنے ہی جیسے ایک انسان کے ہاتھ میں بالکلیہ اپنی باگیں دیدے۔

چونکہ آمریت عقل اور فطرت کے خلاف چیز ہے اسلیے یہ کبھی معمولی حالات میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اُن غیر معمولی حالات میں پیدا ہوا کرتی ہے جبکہ مصائب کے کسی شدید حملہ نے ایک قوم کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا ہو۔ ایسے موقع پر اگر کوئی ہوشیار آدمی موجود ہوتا ہے تو وہ قوم کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاکر عام جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے، امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے، اور اس طرح توجہات کو اپنے اوپر مرکوز کرکے آمرانہ اقتدار حاصل کرلیتا ہے۔ اسکے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر قوم کے حواس برجا ہو گئے اور اسے سوچنے کی مہلت مل گئی تو اسکی آمار

ختم ہوجائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم ہیجان انگیز کارروائیاں کرتا رہتا ہے تاکہ اسکی قوم کو کبھی سکون قلب کے ساتھ غور و فکر کا موقع ہی نہ ملے، اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کل ڈکٹیٹروں کی تاریخ خونریزیوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ اسکا نتیجہ علاوہ خونریزی، بدامنی اور بے اطمینانی کے یہ بھی ہوتا ہے کہ سوسائیٹی میں عقل سلیم کا نشو و نما رک جاتا ہے اور لوگوں میں اسکی صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جماعت کی فکری ہی نہیں بلکہ اخلاقی زندگی بھی تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔

علاوہ بریں آمریت کے نظام میں جماعت کا اخلاق شخصی اخلاق کے تابع ہوکر شخصی ہوجاتا ہے اور اس میں صرف آمر کی زندگی کا نمایاں خلق غالب ہوجاتا ہے۔ حالانکہ قوام تمدن اور مزاج تہذیب کے قیام و بقاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف اشخاص کے مختلف اخلاق و اوصاف جماعت میں نشو و نما پاتے رہیں تاکہ جماعت کا اجتماعی مزاج اعتدال سے تجاوز نہ کرجائے، جماعت زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرسکے، اور اسکا کیرکٹر یک طرفہ (ONE SIDED) ہوکر نہ رہ جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آمریت جماعت کو جس سرعت کے ساتھ ایک ناپائدار ظاہری ترقی کی طرف لے جاتی ہے اس سے وہ چند زیادہ سرعت کے ساتھ وہ اسکو تنزل و ادبار کی طرف لیجاتی ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ جماعت کے اجتماعی مزاج کو غیر معتدل بناکر اسکی اخلاقی و فکری بنیادوں کو کھوکھلا کردیتی ہے اسلیے اسکی ترقی ہی اسکے تنزل و ادبار کا سبب بنجاتی ہے۔ بلکہ درحقیقت اسکی ترقی تنزل بصورت ترقی ہوتی ہے اور اسکا عروج بالکل اُس سُرخی کی طرح ہوتا ہے جو مریضِ دق کے چہرے پر نمایاں ہوجاتی ہے اور تیمارداروں اور خود مریض کو افزائش تندرستی و قوت کا فریب دیتی ہے۔

مزید یہ کہ آمر ہمیشہ ایسے افراد کو ابھرنے سے روکتا رہتا ہے جو اپنی قابلیت کی وجہ سے

اسکے مدِ مقابل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو افراد میں اپنی فطری قوتوں کو نشو و ترقی دینے کا جذبہ دب جاتا ہے اور دوسری طرف جماعت ایسے اشخاص کی اعلیٰ صلاحیتوں کے فوائد سے محروم ہو جاتی ہے۔

جمہوریت دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پر فریب اور پر تلبیس نظریہ جمہوریت ہے اس قدر کوئی بھی نہیں ہے۔ بظاہر یہ ایک جنت ہے جس میں خوف اور حزن کا نام و نشان بھی نہیں ہے، جس میں شخصی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے، جس میں انسانیت کی قدر و قیمت پہچانی جاتی ہے اور جس میں غربت و امارت کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب اسکے باطن پر نظر کی جائے تو یہ ایک جہنم نظر آتی ہے جس میں تکالیف اور پریشانیاں بھری پڑی ہیں، جس میں انسانیت کو کند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے، جس میں شخصی آزادی کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور جس میں غریب اور کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جمہوریت کے تمام معائب کو یہاں مفصل طور پر بیان کرنا مشکل ہے، مگر اس کی چند نمایاں خرابیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن سے اس فرد دس نما دوزخ کی حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے:

(۱) جمہوریت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں اجتماعی ارادہ (General Will) کی فرمانروائی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن یہی چیز جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اجتماعی ارادہ کسی مستقل اور پائیدار چیز کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک بڑی لوچ دار چیز ہے جو ہر پُر زور چیز سے دب کھا کر اپنی شکل بدل دیتی ہے۔ اسکو دھوکا دیا جا سکتا ہے، اسکو لالچ دلایا جا سکتا ہے، اس کو مشتعل کیا جا سکتا ہے، اس کو بسا اوقات نہایت معمولی اسباب بھی متغیر کر دیتے ہیں۔ ایسی غیر مستقل چیز پر جس ریاست کی بنیاد قائم کی جائیگی اس میں استقلال اور پائداری کبھی نہیں پائی جا سکتی۔

(۲) اجتماعی ارادہ کا ادبی، اخلاقی اور نفسیاتی تاثیرات سے متاثر ہونا یقینی ہے۔ ایسی حالت

میں ریاست کے لیے کوئی مستقل اخلاقی معیار اور قانون کے لیے کوئی پائیدار اخلاقی بنیاد نہیں رہتی اگر جمہور کے اندر برے میلانات نشوونما پانے لگیں تو ریاست اور قانون نہ صرف یہ کہ ان کو روک نہیں سکتے بلکہ وہ اُنکے بقاء و ارتقاء کا ذریعہ بن جاتے ہیں، کیونکہ یہاں ریاست اور قانون دونوں خود جمہور اور انکے میلانات ہی کے تابع ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ باشندے اگر تباہی کی جانب ایک قدم چلتے ہیں تو ریاست انکو سو قدم دھکیلتی ہے۔ اس طرح انسانیت کی تباہی و بربادی کا راستہ مختصر ہو جاتا ہے۔ کل کی تاریخ اور آج کا مشاہدہ اس چیز کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ بداخلاقی اور بدکرداری نے جمہوریتوں کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ کس طرح ترقی کی ہے، جمہوریتوں نے کس طرح انکو ترقی دینے میں امداد و اعانت کی ہے، پھر کس طرح یہ بداخلاقیاں قوموں کی تباہی و بربادی پر منتج ہوئی ہیں۔ واقعہ صرف یہی نہیں ہے کہ جمہوریت اخلاق عامہ کے بگڑ جانے کے بعد ان اخلاق سیئہ کی اشاعت و اعانت کرتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود جمہوریت اخلاق عامہ کی تباہی و بربادی اور انکی خرابیوں کو وجود میں لانے کا بہت بڑا اور یقینی سبب ہے۔ اسلیے کہ جمہوریت میں درحقیقت اخلاق کا کوئی مستقل معیار ہی نہیں باقی رہتا جسکو سامنے رکھکر جماعت یا افراد میں اخلاقی حس پیدا کی جائے۔ جمہور کی رائے کو اخلاق کا معیار قرار دیکر یہ امید رکھنا کہ جماعت میں اخلاق حسنہ باقی رہینگے سخت حماقت ہے۔ سوسائیٹی کی شرم انسان کو باہر اور کھلم کھلا بداخلاقیوں سے کسی نہ کسی حد تک روک سکتی ہے۔ لیکن خلوت میں روکنے سے وہ قطعاً قاصر ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ تخلیہ میں بداخلاقیوں کا ارتکاب جب ایک معتدبہ جماعت کرتی رہتی ہے تو رفتہ رفتہ بقیہ جماعت بھی اس سے متاثر ہوتی ہے اور مخالفین کی قوت خود بخود کمزور ہو جاتی ہے۔ آخر کار جمہور کے نزدیک بھی اس فعل میں کوئی شناعت باقی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بداخلاقی خوش اخلاقی بنکر ریاست کی

اعانت و امداد حاصل کر لیتی ہے اور اسکے زیر سایہ پھل پھول کر دوسرے معائب و خبائث کو پیدا کرنیکا سبب بنتی ہے

(۳) جماعتی تعصب اور گروہ بندی جمہوریت کے لیے ایک لازمی و ضروری چیز ہے۔ اس مہلک مرض کا اثر یہ ہوتا ہے کہ حق گوئی و حق پسندی کا وصف لوگوں میں بالکل مفقود ہو جاتا ہے ایسی صورت میں قوم کی اخلاقی تباہی یقینی ہے۔ پھر یہی چیز جماعتی استبداد اور اکثریت کے ظلم تک منتج ہوتی ہے جو نظام جمہوری کی بدترین خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے یورپ میں متعدد جمہوریتیں پاش پاش ہو گئی ہیں۔

(۴) قانون سازی کے اختیارات جمہوریتوں میں درحقیقت صرف برسر اقتدار جماعت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر ریاست کی کل جماعتیں قانون بنانے میں حصہ لیتی ہیں۔ پھر اس برسر اقتدار جماعت میں بھی پارٹی ڈسپلن کا دہانہ ہر ایک کے منہ پر چڑھا ہوتا ہے جسکی وجہ سے حق کا دم انکے حلق میں گھٹ کر نکل جاتا ہے۔ اسلئے اول تو اس میں اور آمریت میں کچھ زیادہ فرق باقی نہیں رہتا اور جمہور کا نام محض فریب دینے کے لیے لیا جاتا ہے، دوسرے یہ برسر اقتدار جماعت آخر انسانوں کی جماعت ہوتی ہے، فرشتوں کی جماعت نہیں ہوتی اسلیے اسکے رضع کیے ہوئے قوانین پر اسکے ذاتی رجحانات و تعصبات کا اثر پڑنا لازمی ہے۔ ایسی صورت میں عدل و انصاف کا معیار اس جماعت کے مفاد کے علاوہ کچھ نہیں رہجاتا۔ پھر یہ معیار بھی قطعاً غیر مستقل ہوتا ہے، اسلیے کہ جب دوسری پارٹی برسر اقتدار آتی ہے تو معیار اور نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں شہریوں اور ریاست دونوں کو "امن و عیش" کہاں نصیب ہو سکتا ہے جب کہ ہر وقت "جرس" "بر بندید محملہا" کی آواز بلند کر رہا ہو۔

(۵) طاقتور اور برسر اقتدار جماعت حزب مخالف (Opposition party) کو ہر ممکن طریقہ

سے دبانے کی کوشش کرتی رہتی ہے، اور اسکا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ مخالف پارٹی بھی اول الذکر کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے۔ اس وجہ سے جمہوریتوں میں باہمی تفرقہ کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی ہے اور اسکا خانہ جنگی تک منجر ہوجانا کچھ بعید نہیں ہوتا۔

(۶) اجتماعی ارادہ چونکہ ایک تغیر پذیر شئے ہے اسلیے جمہوریتیں کبھی مستقل اور پائیدار اصولوں پر نہیں چلتیں بلکہ ان میں تلوّن اور ابن الوقتی کی شان پائی جاتی ہے، جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دوست ان پر اعتماد کرسکتے ہیں نہ دشمن۔ انکے ساتھ معاملہ کرتے وقت کوئی بھی یہ بھروسہ نہیں کرسکتا کہ آج انکی جو پالیسی ہے کل بھی وہی قائم رہیگی۔

(۷) اگر جمہوریت نظام سرمایہ داری کے ساتھ مخلوط ہو تو یہ ناگزیر ہے کہ حکومت و فرمانروائی صرف سرمایہ دار طبقہ کے قبضہ میں آجائے اور غربا کی قسمت میں ابدی محکومی و غلامی لکھدی جائے۔ اسلیے کہ جمہوریت میں اقتدار اس جماعت کو حاصل ہوتا ہے جسکے پاس پروپیگنڈے کے ذرائع زیادہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ چیز دولتمندوں کو غریبوں کی بہ نسبت زیادہ میسر ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہمارے اس بیان کی تائید کررہا ہے۔ انگلستان میں جو جمہوریت کی محبت میں درجہ جنون سے بھی آگے بڑھ گیا ہے، محض سرمایہ دار طبقہ کی فرمانروائی ہے اور یہی حال امریکہ اور تمام دوسرے جمہوری ممالک کا ہے۔

(۸) جمہوریت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اسکے اوپر جس ریاست کی بنیاد رکھی جاتی ہے اسکی پالیسی کا محور صرف معاشیات کو بنانا پڑتا ہے۔ یہ ایک لازمی و ضروری چیز ہے جس سے کسی جمہوریت کو مفر نہیں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی ارادہ جو جمہوری ریاستوں کا طاغوت مسجود ہے انفرادی ارادوں کے اجتماع سے وجود میں آتا ہے اور انفرادی ارادے جب خدا کی بندگی سے آزاد ہوں تو ان کا منتہائے مقصود صرف مطالبات نفس و بدن کا پورا کرنا ہوتا ہے جو معاشیات

کا سرچشمہ ہے۔ اسلیے ہر جمہوریت اس امر پر مجبور ہے کہ وہ معاشی مسائل کو اولیت و اولویت کا درجہ دے اور دوسرے مسائل کو محض انکے تابع سمجھے۔ زندگی کے ہر شعبہ کو معاشیات کے تابع کر دینے کا لازمی و لابدی نتیجہ وہ حیوانیت و بہیمیت ہے جسکا مشاہدہ آج دنیا کے اکثر حصہ میں ہو رہا ہے۔ اخلاقی حس کی موت، خدا سے بے نیازی بلکہ بیزاری، مادہ پرستی کا غلبہ، یہ سب چیزیں اسی شکم پرستی اور عبدیت حرص و ہوس کے ضروری اور لازمی نتائج ہیں جن سے نجات اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ جمہوریت کا وجود دنیا میں باقی ہے اور جب تک معاشیات کے بت کی پرستش اس عالم میں جاری ہے۔ جوزف اسٹالین نے بالکل سچ کہا ہے کہ "لوگوں کو مذہب و روحانیت سے بیگانہ اور متنفر بنانے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان کو معاشیات کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کر دیا جائے"

معاشیات کے اس غلبہ کا دوسرا ضروری اور لابدی اثر یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت کے ساتھ سرمایہ داری کا ناقابلِ انقطاع رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں ہر جگہ نظام سرمایہ داری اور نظام جمہوری ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی ملک میں نظام سیاسی جمہوری ہو اور معاشی نظام سرمایہ داری کے علاوہ کچھ اور ہو۔ اسلیے کہ جمہوریت کے معاملہ میں ذیل کی دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بہر حال ہوگی:

اول یہ کہ جمہوریت کے قیام سے پیشتر نظام سرمایہ داری موجود ہو۔ اس صورت میں یہ یقینی ہے کہ برسر اقتدار جماعت یا تو خود سرمایہ دار ہوگی یا کم از کم سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ہوگی۔ اسکی وجہ ہم سابق میں ذکر کر چکے ہیں اور مشاہدہ بھی اسکی تائید کرتا ہے، چنانچہ انگلستان کے جمہوری نظام میں بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹر اور وزیر اعظم کی پوزیشن بالکل یکساں ہے بلکہ دستوری قانون کے ماہرین کی ایک بہت بڑی جماعت ڈائرکٹر کے عہدہ کو وزیر اعظم

کے عہدہ سے اہم تر خیال کرتی ہے۔ اسی طرح فرانس کے بینک (Banque de France) کا ڈائرکٹر فرانسیسی حکومت پر اس طرح حاوی رہتا ہے کہ حکومت اسکے اشارۂ چشم و ابرو کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ حکومت اگر اس سے نہیں نباہ سکتی تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ قریبی دور کی فرانسیسی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ فرانسیسی کابینۂ حکومت میں روز روز کے تغیرات و انقلابات کس حد تک اسی بینک کے رہینِ منت رہے ہیں۔ بلکہ جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کی موجودہ بے دست و پائی بھی اسی سرمایہ پرستی کی برکت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے وقت نظام معاشی سرمایہ دارانہ نہ ہو بلکہ کوئی اور مثلاً اشتراکی ہو۔ ایسی صورت میں بھی یہ لازمی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد نظام معاشی رفتہ رفتہ متغیر ہو کر سرمایہ دارانہ ہو جائے۔ اسلیے کہ اس صورت میں جو جماعت بھی جمہوریت میں برسرِ اقتدار ہوگی وہ سرمایہ پر پورا قبضہ رکھیگی اور اس میں ایسے تصرفات کریگی جو اسکے مفاد کے مناسب ہوں۔ اگر شخصی سرمایہ داری نہ بھی ہو تو جماعتی سرمایہ داری تو یقینی ہے جو شخصی سرمایہ داری سے بھی زیادہ مضر ہے۔ پھر معاشیات سے واقفیت رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جماعتی سرمایہ داری ایک عرصہ کے بعد شخصی سرمایہ داری میں ضرور تبدیل ہو جاتی ہے۔ اشتراکیت کے گہوارہ روس کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں سرمایہ داری کئی صورتیں بدل کر شخصی صورت میں واپس آگئی ہے۔

اس خالص معاشی ریاست و سیاست کے تباہ کن اثرات کا احاطہ مشکل ہے اس سے جو اخلاقی بربادی ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن اسکا ایک نتیجہ عجیب و غریب ہوتا ہے جسکا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ خود اس جمہوریت و ریاست

کی بنیاد بھی کھوکھلی کر دیتی ہے جو اسکو وجود عطا کرتی ہے۔ قاروں نسبت کا غلبہ انسان سے انسانیت کا جوہر سلب کر لیتا ہے۔ ایک سرمایہ دار کو صرف سرمایہ عزیز ہوتا ہے، نہ اسکو قوم کی پروا ہوتی ہے نہ ملک کی نہ جماعت کی، اسلیے وطنیت و قومیت کے وہ تصورات جن پر عموماً جمہوریت کی بنیاد قائم ہوتی ہے سرمایہ دار کے ذہن سے قطعاً محو ہو جاتے ہیں، اور وہ ہر اس چیز کی اعانت و امداد کرتا ہے جس سے اسکے سرمایہ کی ترقی و حفاظت ہوتی ہو، خواہ اسکے نتیجہ میں ریاست، ملک، قوم سب تباہ و برباد ہو جائیں۔ انگلستان کا مشہور اہلِ قلم جان گنتھر اپنی کتاب "باہر یورپ" (Inside Europe) میں لکھتا ہے "فرانسیسی سپاہی کے سینہ میں جرمنی کی جانب سے جو گولی آکر لگی۔ ہے بہت ممکن ہے کہ وہ فرانس ہی کے کسی کارخانہ کی بنی ہوئی ہو" موجودہ جنگ کے متعلق قریبی زمانہ میں ایک خبر یہ بھی آئی تھی کہ جرمنی نے فرانس کے مقابلے میں جو بھاری ٹینک استعمال کئے تھے ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد خود فرانس کے بنے ہوئے ٹینکوں کی تھی۔ مسٹر چیمبرلین آنجہانی کی پالیسی جس نے جنگ کو برطانیہ کے لیے اس قدر تباہ کن بنا دیا اور جرمنی کی ہمتوں کو اسقدر بلند کر دیا اسی سرمایہ پرستی کا نتیجہ تھی۔ پولینڈ کے مقابلہ میں جرمنی کی اسقدر عاجل کامیابی اور پولینڈ کی تباہی کی ذمہ دار بھی وہاں کی سرمایہ پرست جماعت ہے جس کو جرمنی کی غلامی میں سرمایہ بڑھانا بہ نسبت آزادی کے زیادہ پسند آیا۔

(۹) اجتماع کے وجود میں آنیکے دو سبب ہوتے ہیں: کوئی عقلی اصول جو کل جماعت کا مقصد و مطمح نظر ہو جائے اور یہ مقصد و عقیدہ کی ہم آہنگی پوری جماعت کو متحد و مجتمع کر دے یا کوئی خاص جذبہ جو افراد میں ہم آہنگی پیدا کر کے ان میں ایک ہیئت اجتماعیہ کو وجود میں لانیکا سبب بنے۔ جمہوری ریاست میں چونکہ اصول کا معیار خود اجتماع ہے اسلیے اسکے سامنے کوئی

ایسا مستقل عقلی اصول و قانون نہیں ہوتا جو افراد میں ہئیت اجتماعیہ پیدا کرکے جمہوریت کے وجود میں آنیکا سبب بنے۔ لہٰذا یہ لازم آیا کہ اس میں اجتماع کی بنیاد عقلی کے بجائے محض جذباتی ہو، جسکے مندرجہ ذیل نتائج یقینی ہیں:

(الف) جماعت میں عقلیت کے بجائے جذباتیت پیدا ہوجاتی ہے جس سے اسکے قوائے عقلیہ روز بروز کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ نہ اسکا فکری نظام صحیح رہتا ہے نہ اخلاقی۔ اور رفتہ رفتہ وہ حیوانیت و بہیمیت کے درجہ پر پہنچ کر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔

(ب) جذبات میں استقلال نہیں ہوتا اسلیے یہ اجتماع بھی سخت متلوّن اور سیماب وش ہوتا ہے۔ یورپ کی جمہوریتوں میں روز بروز کے تغیرات و انقلابات اسکی نظیر میں پیش کیے جاسکتے ہیں یہانتک کہ انگلستان کا ایسا قدامت پسند اور جامد ملک بھی چھوٹے موٹے انقلابات کی آماجگاہ تو بن چکا ہے اور ایک بڑے انقلاب کی جانب بھی قدم بڑھا رہا ہے جیسا کہ وہاں کے ارباب سیاست کے اقوال سے باوجود سعی اخفاء معلوم ہوتا ہے۔

(ج) جمہوریت میں ایک جماعت محض اس بنا پر دوسری جماعت پر صاحب اقتدار بنادی جاتی ہے کہ وہ ثانی الذکر سے تعداد میں زیادہ ہے۔ یہ چیز جس قدر انصاف و عدل کے خلاف ہے وہ ظاہر ہے۔ عقل سلیم کسی صورت سے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوسکتی کہ محض تعداد کی اکثریت حکمرانی و فرمانروائی کا حق پیدا کردیتی ہے۔

فتلک عشرۃ کاملۃ۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ صرف ان دس معائب کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ جمہوریت کی خرابیاں اس سے کہیں زائد ہیں۔ اب میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو "اسلامی جمہوریت" کی لایعنی اصطلاح بڑے زور سے استعمال کیا کرتے ہیں کہ اسی پر از معائب جمہوریت کو آپ اسلام کے سر تھوپنا چاہتے ہیں؟ اور اگر یہ نہیں ہے

بلکہ جمہوریت سے آپ کوئی دوسرا مفہوم مراد لیتے ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ آپ اسی لفظ کو اسلام کے ساتھ ملا کر گمراہ کرنیکا سبب بنیں۔ کیا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا الخ کا حکم محض لفظ "راعنا" ہی کے استعمال تک محدود ہے؟ اور کیا یہ تلبیس الحق بالباطل نہیں ہے؟

جمہوریت، آمریت، اشتراکیت وغیرہ یہ سب خالص دنیاوی ریاست (Seculat State) کی قسمیں اور انسانی فرمانروائی (Human Sovereignty) کی مختلف صورتیں ہیں۔ انکو اسلامی ریاست اور خلافت الٰہیہ سے کیا نسبت جسکی بنیاد ہی انسانی حکومت کی نفی اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اثبات ہے۔ اسلیے اسلامی ریاست کی نظیر تلاش کرنا نہ صرف عبث بلکہ سخت گمراہی و ضلال بھی ہے۔ مگر ان مرعوب و ماؤف ذہنوں اور دماغوں کو کیا کہا جائے جنھوں نے اسلامی مسائل کی حقانیت کا معیار مغربی خیالات سے انکے انطباق کو قرار دیدیا ہے۔ پھر اس کوشش میں واقعیت وغیر واقعیت سے انکو کیا بحث۔ اسلامی مسئلہ خواہ وہ مغربی اصول سے قطعاً متضاد ہی کیوں نہو، اور مغربی مسئلہ خواہ کتنا ہی لغو و مہمل کیوں نہو مگر انکا تو کام بس اتنا ہے کہ اسلام کو کھینچ تان کر اس پر منطبق کردیں، خواہ اس کوشش میں اسلام کے ٹکڑے ہی کیوں نہ اڑ جائیں۔ اس چیز کا نام انکے نزدیک مغربی سیاست سے واقفیت اور جدید علم کلام میں مہارت ہے۔

میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ بیشک آپکو اسکا حق حاصل ہے کہ اپنا جو مسلک چاہیں اختیار کریں۔ لیکن آپکو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ آپ اپنے ذاتی رجحانات و خیالات کو اسلام کی جانب منسوب کردیں؟ پھر اگر صحیح اسلامی خیالات آپکے نزدیک موجودہ دور میں ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہیں اور آپ کو انکے اظہار سے شرم آتی ہے تو آپ صاف صاف اسلام سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ اخلاقی جرأت اور دیانت کا اقتضاء تو یہی ہے۔

اگر آپ اسلام سے شرماتے ہیں تو اسلام آپ سے سو بار شرماتا ہے۔ اسکو کوئی پرواہ نہیں خواہ اسکا کوئی پیرو رہے یا نہ رہے۔ وہ خود ایک زندہ حقیقت ہے۔ اسکی زندگی ہمارے وجود کی محتاج نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی اسکے وجود کی محتاج ہے۔ اللہ اللہ مسلمانوں کے علماء تک کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ اسلامی خیالات کو صحیح صورت میں ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور انکو کفر و ضلال کے ساتھ آمیز کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے پھر کہتا ہوں وَلَا تَلْبِسُوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون ؕ

غیر جمہوری سرمایہ دارانہ ریاست پر گفتگو اس موقع پر لاحاصل ہے اسلیے کہ اسکی قباحت اظہر من الشمس ہو چکی ہے۔ نیز جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کے قبائح پر جو روشنی ڈالی جا چکی ہے اسکے بعد اس موضوع پر الگ مستقل بحث کی حاجت نہیں۔

اشتراکی ریاست اسوقت جو غیر اسلامی نظریہ سب سے زیادہ گمراہی کا سبب بن رہا ہے وہ اشتراکیت ہے۔ اسکا اضلال اس حد پر پہونچگیا ہے کہ اب دینِ ابراہیمی و ملت حنیفی کے محافظین تک اسکے شکار ہو رہے ہیں اور بے سوچے سمجھے اس خلاف عقل و نقل نظام کی تائید میں کوشاں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قیامت کے دن جس پر انکا بھی ایمان ہے، جب ان سے یہ پوچھا جائیگا تو اسکا کیا جواب ان کے پاس ہوگا کہ کیا تم اسلام کو دین کامل نہ سمجھتے تھے؟ پھر کیا اسلام اور کفر کے علاوہ دنیا میں کوئی تیسری چیز بھی تھی؟ پھر جب تم نے اسلام کے سیاسی و معاشی نظام سے روگردانی کر کے ایک دوسرے نظام کو پسند کر لیا تو یہ ترجیح کفر علی الاسلام اور رضا بالکفر تھی یا نہیں؟ پھر رضا بالکفر اور ترجیح کفر علی الاسلام کا حکم تم کیا نہیں جانتے تھے؟ تم خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنے کیا اسکا انجام تم کو معلوم نہ تھا؟ قسم ہے مالک عرش بریں کی کہ ان سوالات کا کوئی جواب انکے پاس نہ ہوگا۔

اس سے پیشتر میں ترجمان القرآن کے صفحات میں ایک مبسوط مقالہ اشتراکیت پر لکھ چکا ہوں جس میں واضح دلائل سے اس نظریہ کا ابطال کیا گیا تھا، اسلیے یہاں اس پر زیادہ تفصیلی گفتگو کی تو کوئی حاجت نہیں ہے۔ البتہ کچھ مزید دلائل یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ان دلائل کو سمجھنے کے لیے یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اشتراکیت درحقیقت ایک معاشی نظریہ ہے اور مارکس نے اسکو اسی صورت میں پیش کیا تھا۔ لینن نے اس کی پیشینگوئی کو ایک سیاسی انقلاب کے ساتھ آمیز کر کے اس میں سیاست کی بو پیدا کر دی۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ اس کی سیاسی حیثیت کو ہم کسی حالت میں بھی اسکی معاشی حیثیت سے جدا کر سکیں۔ اسکی سیاسی حیثیت اسکی معاشی حیثیت پر موقوف ہے، اسلیے معاشی حیثیت کے انہدام کے بعد سیاسی حیثیت خود بخود فنا ہو جاتی ہے۔

اشتراکیت محنت و سرمایہ کو ایک ہی طبقہ کی ملکیت میں دیدیتی ہے، اور وہ طبقہ بھی محض جماعتی حیثیت سے سرمایۂ دولت کا مالک ہوتا ہے، ورنہ جماعت کا کوئی فرد حقوق ملکیت نہیں رکھتا بلکہ حکومت اس سے محنت لیکر اسکی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اور وہی کل دولت کی مالک ہوتی ہے۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ لازمی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد قانون تقلیل افادہ (Law of diminishing utility) کا عمل شروع ہو جائے۔ اس قانون کے اثرات میں آئندہ سطور میں تحریر کرونگا۔ پہلے اس امر کی وضاحت کرتا ہوں کہ اس قانون کا عمل ہونا کیوں ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ایک اشتراکی ریاست کے ایک مزدور کے متعلق فرض کیجیے کہ وہ اوسطاً ۸ گھنٹہ روزانہ کام کرتا ہے۔ محنت کی یہ مقدار اسکے لیے حکماً لازمی ہے۔ اور یہ محنت ایسی ہے کہ جس سے اسکی صحت و تندرستی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور حکومت کے لیے اسکا کام کافی مفید ہو جاتا

ہے - ۸ گھنٹہ کی محنت کا معاوضہ حکومت کی طرف سے اسکو یہ ملتا ہے کہ اسکو اسکی ضروریاتِ زندگی مہیا کردی جاتی ہیں، مثلاً دو وقت کھانا، صبح کو ناشتہ، گرمی و سردی سے بچنے کے لیے کپڑے - ان ضروریات زندگی کو ہم سہولت کے لیے بصورتِ زر فرض کیے لیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اسکو گویا ایک روپیہ روزانہ اجرت ملتی ہے - اب اگر وہ بالفرض ۹ گھنٹہ روزانہ کام کرنے لگے تو بھی اسکو وہی ایک روپیہ روزانہ اجرت ملیگی اسلیے کہ ایک روپیہ کے معنی اسکی ضروریات زندگی کے ہیں، اور ضروریات زندگی محدود ہوتی ہیں، ان میں بڑھنے اور گھٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور اگر ہوتی ہے تو برائے نام جو ناقابلِ اعتنا رہے - اس صورت میں کوئی شخص اس پر رضامند نہ ہوگا کہ ۸ گھنٹہ کے بجائے ۹ گھنٹہ محنت کرکے خواہ مخواہ تکلیف اٹھائے لہذا سرمایہ کا وہ حصہ جو محنت کرنیوالوں کی ضروریات زندگی سے زائد ہے بالکل فضول ہوجائیگا اور اسکا افادہ ختم ہوجائیگا اسلیے کہ اسکے معاوضہ میں محنت نہیں حاصل کی جاسکتی، نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے -

اب فرض کیجیے کہ کسی اشتراکی ریاست کی آبادی ۳۰ ہزار افراد پر مشتمل ہے جنکی محنت کا معاوضہ ایک روپیہ فی کس فی یوم کے حساب سے (عہ یہ ایک شخص کی ضروریات زندگی) ۳۰ ہزار روپیہ روزانہ ہے - اور ریاست کی آمدنی مثلاً ۴۰ ہزار روپیہ یومیہ ہے تو یہ ۱۰ ہزار روپیہ یومیہ کی بچت بالکل بیکار اور غیر مفید ہے - اس دولت سے محنت کرنے والوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی اور اسکا افادہ بالکل غائب ہوجائیگا -

اس قانون کے عمل میں آنے کے بعد اشتراکی حکومت ذیل کی دو صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کرسکتی ہے -

پہلی صورت تو یہ ہے کہ وہ اس کل غیر مفید اور زائد از ضرورت دولت کو کل پبلک پر

بحصۂ مساوی تقسیم کردے - اس صورت میں چونکہ مختلف اشخاص کی ضروریات زندگی، نیز اخراجات مختلف ہونگے، کسی کے کم ہونگے اور کسی کے زائد، اسلیے معاشی اعتبار سے مختلف طبقات کا پیدا ہوجانا یقینی ولابدی ہے - خصوصاً اسلیے کہ محض ضروریات زندگی سے زائد دولت کا تقسیم کردینا اس میں افادہ پیدا کرنیکے لیے کافی نہ ہوگا، بلکہ اسکے لیے پبلک کو تجارت کی اجازت دینا بھی ناگزیر ہوگا - نیز یہ کہ تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنے کے لیے اسکو زر کی صورت میں تقسیم کرنا پڑے گا -

دوسری صورت یہ ہے کہ اس زائد از ضرورت دولت کو تقسیم کرنے کے بجائے خزانہ ہی کی زینت بنایا جائے - یہ صورت اول تو سخت احمقانہ اور ظالمانہ ہے - دوسرے یہ کہ اس صورت حال کو محنتی طبقہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا، اسلیے کہ جب وہ دیکھے گا کہ اسی کی محنت سے مہیا کی ہوئی دولت تجوریوں میں مقفل ہے اور وہ برابر محنت و مشقت میں مصروف ہے تو وہ یقیناً اسکے خلاف بغاوت کریگا - ہڑتالیں، کارخانوں کو تباہ کرنے کی کوششیں (Sabotage) اور تعطل کی سازشیں شروع ہوکر ریاست کے امن و امان کو خاک میں ملادینگی - اور اس وقت کسی منطق سے انکو اشتراکیت اور سرمایہ داری کا فرق نہ سمجھایا جاسکے گا - نیز اس صورت میں ایک اور خرابی بھی لازم آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس فضول دولت کو محفوظ رکھنے کے لیے ناگزیر ہوگا کہ اسکو زر کی صورت میں تبدیل کیا جائے، مگر ظاہر ہے کہ یہ مبادلہ اشتراکی حکومتوں سے تو ہو نہیں سکتا، اسلیے کہ وہ خود اسی قارونیت کی مصیبت میں گرفتار ہونگی، لہذا سرمایہ دار ممالک اور حکومتوں سے معاملہ کرنا پڑیگا - پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اشتراکی حکومت کو تو کسی چیز کی خریداری کی احتیاج ہوگی نہیں اسلیے وہ اس زائد از ضرورت دولت کے معاوضہ میں صرف زر حاصل کریگی یا کم از کم زیادہ سے زیادہ مقدار زر طلب کریگی - نتیجہ یہ ہوگا کہ زر کے یک طرفہ اجتماع سے لازماً دونوں ممالک

ہیں معاشی توازن بگڑ جائیگا۔

اب ایک دوسری حیثیت سے دیکھیے۔ انسان کی ضروریات زندگی محدود ہیں اور انکو پورا کرنے کے لیے کل آدمیوں کو مصروف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً سو آدمیوں کی ضروریات پوری کرنیکے لیے زیادہ سے زیادہ پچیس آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس طرح کہ مثلاً دس آدمی غلہ مہیا کر سکتے ہیں، ایک آدمی گوشت دیسکتا ہے، ایک آدمی انکے کپڑے سی سکتا ہے، ۲ آدمی انکے لیے کپڑا بن سکتے ہیں، ایک آدمی روشنی کا انتظام کر سکتا ہے، ایک چوکیدار انکی حفاظت کا کام انجام دے سکتا ہے، دو آدمی انکے لیے پانی مہیا کر سکتے ہیں، سات آدمی اور متفرقات کے لیے رکھ لیجیے۔ اس طرح صرف پچیس ۲۵ آدمی سو آدمیوں کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ ایسی حالت میں اشتراکی ریاست ان پچہتر فیصدی بیکار اشخاص کے لیے کیا کریگی؟ مجبوراً انکو کام مہیا کرنیکے لیے اسباب تعیش (Luxuries) تیار کرانا ضروری ہونگے اور نہ صرف تیار کرانا ہونگے بلکہ پبلک کو ان کے استعمال کی عادت بھی ڈالنی ہوگی اسکے جو اخلاقی اور نفسیاتی اثرات ہونگے اور یہ جسطرح تباہی و بربادی کی طرف منتج ہوگا وہ بالکل ظاہر ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اشتراکیت کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں جو اسکے وجود سے کبھی منفک نہیں ہوسکتیں۔ اول تو قلیل ہی عرصہ میں اس کا سرمایہ داری میں تبدیل ہوجانا۔ دوسرے اس کا اخلاقی و روحانی بربادی پیدا کرنا۔ پس حیرت و افسوس ہے ان اسیرانِ دامِ اشتراکیت پر جو اشتراکیت کو دنیا کے لیے آیۂ رحمت سمجھتے ہیں اور اسکو رواج دینے کے لیے کوشاں ہیں اور انما نحن مصلحون کے نعرے لگاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں "الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون"

نظریۂ خلافت الٰہیہ ریاست کے غیر اسلامی نظریات مع انکے معائب اور نقائص کے گذشتہ صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں - انکے نقائص اور معائب کو دیکھ کر ہر شخص انکے وجود کو دنیا اور اہل دنیا کے لیے ایک مصیبت عظمیٰ اور لعنت کبریٰ سمجھیگا - بلاشبہ دنیا کے اوپر جو مصیبتیں آ رہی ہیں وہ زیادہ تر انہیں غلط اور غیر اسلامی افکار سیاسی و اصول معاشی کی رہین منت ہیں - ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو ان مصائب سے نجات دلانیکا عزم کریں اور اسکے لیے اپنی عمر کا ہر لمحہ اور اپنے خون کا ہر قطرہ وقف کر دیں - مسلم ہونیکے معنی یہ ہیں کہ ہم نے صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کے احکام کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیا اور صرف اسی کی بادشاہت و سلطنت کو تسلیم کر کے دنیا کے ہر بادشاہ، ہر حاکم، ہر سلطان کی حکومت و سلطنت کی نفی کر دی - اسلیے یہ ناممکن ہے کہ ہم مسلم ہوتے ہوئے غیر اللہ کی حکمرانی اور غیر اللہ کی حکومت تسلیم کریں، یا غیر اللہ کے بنائے ہوئے کسی نظام حیات اور کسی اصول زندگی کو قبول کر لیں، یا انکے وجود کو جیتے جی گوارا کر لیں - نفی کا اقتضاء یہ ہے کہ ہم ہر غیر اسلامی اور غیر الٰہی حاکمیت و فرمانروائی کو صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹا دیں، اور اثبات کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حکومت اُسکی زمین میں قائم کریں - ان دونوں فرضوں میں سے اگر ایک میں بھی کوتاہی ہو تو یقیناً ہم گناہگار اور سخت گناہگار ہیں، بلکہ ہمارے اسلام میں کمی اور کمزوری ہے - یقیناً جس طرح غیر اسلامی نظام حیات اور غیر الٰہی حاکمیت و فرمانروائی کا قبول کرنا اور اسکو رائج کرنیکی کوشش کرنا جرم عظیم اور علامت ضعف ایمان ہے، اُسی طرح اسکے خلاف جد و جہد نہ کرنا اور خاموشی و سکوت کے ساتھ اسکو گوارا کر لینا بھی سخت جرم اور بہت بڑا گناہ ہے - پھر خلافت الٰہیہ کے قیام اور اس نظریہ کی قبولیت کے لیے وقت بھی موزوں ترین ہے - شاید دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا ہے جو خلافت اسلامیہ کی مقبولیت کے لیے موجودہ دور سے زیادہ موزوں و مناسب ہو - اسلیے کہ دنیا اس وقت خود

غیر اسلامی نظریات و اصول سے عاجز و پریشان ہے اور بدل متمنی ہے کہ کوئی نیا نظام رواج پذیر ہو کر اسکے مصائب کا خاتمہ کردے اور اسکو راحت و سکون سے ہم آغوش کرے۔ تحریک اسلام کے لیے وقت کی یہ موزونیت و مناسبت ہماری خاموشی و بے عملی کے جرم کو اور بھی سنگین بنا دیتی ہے۔

مقام حیرت و غیرت ہے کہ ایک نازی بالکل ناسازگار و نامساعد حالات میں اپنے وطن سے باہر جاکر نازی ازم کا پروپیگنڈا کرتا ہے اور کسی نہ کسی حد تک اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ایک اشتراکی سرمایہ پرست ممالک میں جاکر اشتراکیت کی تبلیغ کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ مگر ایک مسلمان اتنے سازگار و مساعد حالات میں بھی زبان سے کلمہ حق نکالتے ہوئے اور نظریۂ خلافت الٰہیہ کی تبلیغ کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ حالانکہ دونوں نظریوں میں بہت بڑا فرق ہے نازیت، اشتراکیت وغیرہ کل غیر اسلامی نظریات کی حالت یہ ہے کہ انکی بنیادیں کھوکھلی اور کمزور ہیں، انکے فوائد سطحی، وقتی اور قلیل، انکے مضار و معائب بیحد و بیحساب، اور انکا نتیجہ آلام، مصائب، تباہیاں اور پریشانیاں۔ اسکے بالکل برعکس اسلامی نظریہ کی بنیاد مضبوط مستحکم اور ٹھوس منطقی دلائل پر قائم ہے، اسکے فوائد بے حد و حساب، اور مضرت سے اسکا دامن بالکل پاک ہے، اور اس کا نتیجہ دائمی امن و سلام و ترقی و خوشحالی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے لیے اسکی ترویج ضروری ہو جاتی ہے نہ کہ کسی قومی عصبیت کی بنا پر۔ لاریب انتہائی ننگ انسانیت اور حد درجہ بددیانتی کا فعل ہوگا اگر ہم بنی نوع انسان کو گوناگوں مصائب دنیوی میں مبتلا اور ہلاکت و عذاب آخرت کی طرف جاتے ہوئے دیکھکر خاموش بیٹھے رہیں اور وہ نسخہ کیمیا ان کو نہ بتائیں جو فلاح و سعادت کا یقینی اور واحد ضامن ہے۔

ذیل کی سطور میں ہم خلافت اسلامیہ کا ایک مجمل خاکہ پیش کرتے ہیں اور دنیا کے ہر اس شخص کو اسکی طرف دعوت دیتے ہیں جس میں انسانیت کا ایک ذرہ بھی باقی رہ گیا ہے۔ خواہ

وہ جرمن ہو یا جاپانی، ترکی ہو یا ایرانی، اطالوی ہو یا برطانوی، ہندو ہو یا بودھ، عیسائی ہو یا یہودی، یا دورِ موجودہ کا نسلی مسلمان خواہ کانگریسی ہو یا مسلم لیگی، ہم سب سے نہایت پُرزور الفاظ میں پورے علم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ جمہوریت، نازیت، فاشیت، اشتراکیت وغیرہ کے طلسمات کو توڑ دو اور انسانی حاکمیت کو لات مار کر خدائے واحد قدوس کی حکومت اِس عالم آب و گل میں قائم کر کے خلیفتہ اللہ فی الارض کا مرتبہ عظمیٰ حاصل کرو۔ اور یہ سب ہم اپنے کسی ذاتی نفع کے لیے نہیں کہتے، کسی قومی عصبیت، کسی ملکی تعصب، کسی نسلی تفوق کی بنا پر نہیں کہتے، بلکہ محض تمہاری ہی ہمدردی کی بنا پر اور تم کو دنیا کی تباہی اور آخرت کے عذابِ الیم سے بچانے کے لیے کہتے ہیں۔ آئندہ تم کو اختیار ہے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

ریاست و حکومت کا اسلامی تصور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے دنیا کے کل سیاسی تصورات سے بالکل انوکھا ہے۔ اسلام انسانی حکومت و فرمانروائی کا قائل نہیں ہے بلکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اور محض قائم ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ تخلیق انسانی کی غرض و غایت اسی استخلاف فی الارض کو قرار دیتا ہے۔ قولہ تعالیٰ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ اس طرح وہ انسانیت کی قدر و عزت کو بلند ترین مرتبہ پر پہونچا دیتا ہے۔

اسلام کی روح ارتقاء و عروج ہے۔ مگر وہ وہمی اور عارضی ارتقاء نہیں جو غیر مسلمین کا نصب العین اور منتہائے فکر ہے بلکہ وہ ارتقاء جو گہوارہ سے شروع ہو کر عالمِ آخرت تک جاری رہتا ہے اور جسکی حد و نہایت متعین نہیں ہے۔ غیر اسلام میں ارتقاء و عروج کا تخیل بالکل محدود ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ انسان کی موت تک جاری رہتا ہے لیکن اسلام اسکو غیر محدود بناتا ہے اور موت کے بعد (جو اسکے نزدیک فنا کا نہیں بلکہ حیاتِ ثانیہ کا نام ہے) بھی جاری

رہتا ہے۔

انسان اپنے ابتدائے وجود سے ایک راستہ پر گامزن ہوتا ہے جو مختلف منازل سے گذرتا ہوا منزلِ آخرت کو جاتا ہے۔ یہ راستہ ترقی کا راستہ ہے بشرطیکہ آدمی اسلامی اصول و قوانین کی پابندی کے ساتھ اس پر گامزن ہو۔ اسلامی اصول یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح اور کس نیت و غرض سے اس راستہ کی ہر چیز کو استعمال میں لایا جائے تاکہ ہر منزل ترقی و عروج کی منزل بن جائے۔ یہاں تک کہ انسان ترقی کے اس اعلیٰ درجہ پر پہنچ جائے جسکا نام جنت ہے، جو اپنے علو و بلندی نیز دائمی و ابدی ہونے کی وجہ سے منتہائے نظر ہونیکا مستحق ہے۔ تمدن و عمران کی ترقی، علوم و فنون کی ترقی، معاشی و اقتصادی ترقی، اخلاقی و نفسیاتی ترقی، ذہنی و فکری ترقی، آلاتی و میکانکی ترقی، الغرض وہ کل ترقیاں اسلام کے مقاصد میں داخل ہیں جو حقیقت میں ترقیات ہوں نہ کہ تنزلات، جو انسان کو اوپر لے جائیں نہ کہ نیچے، جو ترقی کے مرتبہ اعلیٰ کے حصول کے لیے ذریعہ بن سکیں نہ کہ اسکی راہ میں حجاب و مزاحم بنجائیں، اور جو فلاح و سعادت کی موجب ہوں نہ کہ خسران و شقاوت کی۔

ترقی و عروج کی ان تمام اقسام کے حصول کے لیے یہ لازمی و ضروری ہے کہ انسان کائنات کا صحیح استعمال کرے، ہر چیز کے مفید پہلو سے فائدہ اٹھائے اور مضر پہلو سے اجتناب کرے۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ انسان اپنے صحیح مرتبہ اور دوسری مخلوقات عالم کے صحیح درجہ سے واقف ہو، پھر کچھ ایسے قوانین کا پابند ہو جو تمدن و عمران، معاش و اخلاق، ذہانت و تفکر، علم و ادراک کے ان منازل ارتقاء کو باقی رکھ سکیں جو انسان کو حاصل ہو چکے ہوں اور ان مراتب کو آئندہ مراتب ارتقاء کے حصول کا ذریعہ بنا سکیں۔

"خلافت الٰہیہ" کا نظریہ ارتقاء و عروج کے ان دونوں ضروری عناصر کو مجتمع کر دیتا ہے

انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دے کر اسلام نے ایک طرف تو کائنات میں انسان کی صحیح حیثیت اور موجودات کے ساتھ اسکے تعلق کی صحیح نوعیت متعین کر دی ہے، اور دوسری طرف اسکے لیے موجودات میں تصرف کا صحیح طریقہ بھی معین کر دیا ہے، کیونکہ جب انسان اللہ کا خلیفہ ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ یہاں مالکِ مختار کی حیثیت سے کوئی تصرف کرنیکا مجاز نہیں ہے بلکہ اسے تمام تصرفات اصل مالک کے مقرر کیے ہوئے قانون کے مطابق کرنے چاہییں۔ خلیفۃ اللہ ہونے کے بعد انسان سمجھتا ہے کہ کل کائنات عالم اسکے فائدہ اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اُس کا یقین "وَخَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" اور "وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" اور اسی قسم کے دوسرے پیغاماتِ الٰہیہ پر ہوتا ہے۔ اسلیے وہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ پر غائر نظر ڈالتا ہے، عالم خلق کے چپہ چپہ کو کھنگال کر استعمال میں لاتا ہے تاکہ "ربنا ما خلقت هذا باطلا" کے فحوٰی پر عمل ہو جائے۔ پھر وہ اس سب مخلوقات کو ارتقاء کے مرتبہ عظمی یعنی ترقی آخرت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بناتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدن و عمران، علوم و فنون، فکر و ادراک، غرض ہر میدان میں پیش قدمی کا صحیح رخ متعین ہو جاتا ہے۔

نظریۂ خلافت انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان نوعیت کا فرق قائم کر دیتا ہے۔ دوسری مخلوقات کے لیے صرف قانون طبیعت (Law of Nature) کی پیروی ہے، اور اس پیروی میں ان کے لیے محض جبلّت (Instinct) کی ہدایت کافی ہے۔ لیکن انسان ان کے برعکس خلیفہ یا نائب کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو دوسری مخلوق پر تصرف کے اختیارات دیے گئے ہیں، اس کو تمیز اور استدلال اور استنتاج اور تفکر کی قوتیں دی گئی ہیں، اور وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا ذمہ دار و جواب دہ عہدہ دار ہے، اس لیے اس کا کام محض تکوینی قوانین اور طبیعی اصول کی پیروی نہیں ہے، بلکہ اُن سے زائد ایک تشریعی قانون، ایک اخلاقی ضابطہ اور ایک جلی ہدایت

کی پیروی کرنا بھی اس پر لازم ہے، بلکہ اسکی فلاح و سعادت کا انحصار اسی دوسری چیز کی پیروی پر ہے۔ اسکی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکومت کی سول سروس کا کام محض اُن قوانین کی پیروی کرنا ہی نہیں ہے جو عام رعایا کے لیے بنائے گئے ہوں، بلکہ ان کو حکومت بالادست کی ہدایات اور ضابطۂ ملازمت (Government Servants Conduct Rules) کی پیروی بھی کرنی پڑتی ہے، اور ان کی کامیابی و ترقی کا انحصار دراصل اسی دوسری چیز کی پیروی پر ہوتا ہے۔ پس انسان کے لیے محض قوانین تکوینیہ کی اساس پر سعی و عمل اور ترقی و عروج کا کوئی ایسا پروگرام اور نظام نہیں بنایا جاسکتا جو سفرِ زندگی کی ہر منزل اور حیات کے کل شعبوں میں اسکی رہنمائی کے لیے کافی ہو، اور جسکا اتباع کرکے آدمی ترقی کی دنیوی منزلوں سے سلامتی کے ساتھ گذرتا ہوا آخرت کی انتہائی منازل ترقی تک پہنچ سکے۔ اسکی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ عالم خلق میں سرے سے وہ ضروری مواد Data ہی موجود نہیں ہے جس سے آدمی بطور خود اس پروگرام اور نظام کو اخذ کرسکے، اور اسکی وجہ صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ آدمی کے ذرائع استدلال و استنتاج اس ضابطہ کو معلوم کرنے کے لیے ناکافی ہیں، بلکہ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سفرِ زندگی کی آخری منزل جس کے نتائج پر ہماری کامیابی و ناکامی اور ترقی و تنزل کے اصلی فیصلہ کا دارمدار ہے، ہماری نگاہ سے قطعی اوجھل ہے اور ہم بطور خود کسی طرح بھی یہ نہیں جان سکتے کہ وہاں ہمارے کس دنیوی عمل کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ لہٰذا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان کو زمین پر اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لیے جس پروگرام اور نظام کی ضرورت ہے وہ لازماً خداوند تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت یا بالفاظِ دیگر وحی کے طور پر آنا چاہیے۔

اس طرح انسانی ارادہ ارادۂ الٰہی کے، اور انسانی تعقل علمِ الٰہی کے تابع ہو جاتا ہے جسکا ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ انسان کی قوتِ ارادی اور قوتِ تصرف میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے

کیونکہ ہر قدم پر وہ محسوس کرتا ہے کہ فرمانروائے عالم کی طاقت اسکی پشت پر ہے۔ دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے، کیونکہ ہر اساسی اہمیت رکھنے والے مسئلے میں انسان کو صحیح رہنمائی مل جاتی ہے اور اسکی قوت غلط تجربات میں ضائع نہیں ہوتی۔ تیسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان ان تمام نقصانات سے محفوظ رہتا ہے جو انسانی حاکمیت کے بے اصل مفروضہ پر کام کرنے کی صورت میں لازماً پہنچتے ہیں۔ اس میں نہ طبقاتی کشمکش ہوتی ہے نہ سرمایہ دار و مزدور کی آویزش، نہ پارٹی بندیاں ہوتی ہیں نہ فرقہ پرستیاں، نہ خونریزیاں ہوتی ہیں نہ ہلاکت آفرینیاں، اسلیے کہ یہ سب تو انسانی حکومت کے نتائج ہیں، حکومت الٰہیہ میں انکا وجود کہاں؟ ان خرابیوں کے بالکل برعکس وہاں ایک ایسے تمدن کی تعمیر ہوتی ہے جسکا ہر جزء انتہائی ترقی یافتہ اور جس کا ہر حصہ امن و سلامتی اور راحت و اطمینان کا ضامن ہوتا ہے۔

آزادی و مساوات کا حقیقی وجود صرف حکومت الٰہیہ ہی میں ممکن ہے، اسلیے کہ وہاں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کے خیالات، اعمال و افعال کسی فرد یا جماعت کے تابع نہیں ہوتے، بلکہ صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کے احکام و تعلیمات کے تابع ہوتے ہیں۔ اخلاق کے حسن و قبح کو تمدن کے فنا و بقا میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسلامی حکومت کی بنیاد ہی اصلاح اخلاق پر قائم ہے۔ حکومت الٰہی نہ صرف یہ کہ اظہار گناہ سے مانع ہوتی ہے بلکہ اندھیری کوٹھڑی میں بھی برے اخلاق و افعال کے ارتکاب کو روکتی ہے۔ گناہوں کی روک تھام وہاں ظاہر ہی میں نہیں ہوتی بلکہ باطن میں بھی ہوتی ہے، اسلیے کہ خدا کی حکومت اُن اخلاقی بنیادوں کو منہدم کر دیتی ہے جن پر بدکرداریوں کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست میں قانون سازی کے اختیارات انسان کو نہیں حاصل ہوتے، نہ کسی فرد کو نہ کسی جماعت کو، بلکہ سب کو قانونِ الٰہی کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اسکا ایک بہت بڑا فائدہ

یہ ہوتا ہے کہ حکومت اور پبلک میں یک جہتی اور باہمی تعاون و ہمدردی کی روح پیدا ہو جاتی ہے جس سے ریاست دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی ہے۔ علاوہ بریں قوانین کے اجراء و تنفیذ میں کوئی دشواری نہیں پیدا ہوتی اسلیے کہ سوسائیٹی کے افراد میں اطاعت کا داعیہ خود موجود ہوتا ہے اور قانون الٰہی کی اطاعت کی جانب اس عام رجحان کی وجہ سے جو فضا پیدا ہوتی ہے اس میں خود بخود مطیع اور پابندِ قانون اشخاص پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

قانون کے اجراء و تنفیذ کے اختیارات بے شک ہیئت انتظامیہ، یعنی حکومت ہی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اور حکومت میں بھی ایک شخص، یعنی خلیفہ یا امیر کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے، لیکن سب سے بڑا بنیادی فرق جو اس حکومت کو دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت ایک متقی سوسائیٹی کے اندر بنتی ہے اور انتظامی کاموں کے لیے عاملین کا انتخاب اہلِ تقویٰ لوگوں میں سے کیا جاتا ہے۔ برعکس اسکے دوسری حکومتیں اُس سوسائیٹی میں بنتی ہیں جس میں تقویٰ کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اس فرق کی وجہ سے انتظامی اختیارات ایک شخص یا چند اشخاص کے ہاتھ میں دینے کے جو نتائج غیر متقی سوسائیٹی میں ظاہر ہوتے ہیں وہ متقی سوسائیٹی میں ظاہر نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ اختیارات جو عاملین حکومت کو دیے جاتے ہیں، یہ بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ جن امور میں شرع کے احکام صریح ہیں ان میں حکومت کی حیثیت ایک آلۂ تنفیذ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور جو امور ان کے ماسوی ہیں ان میں اول تو حکومت کو مشورے کا پابند کیا گیا ہے، دوسرے اسلامی شعور رکھنے والی پبلک کو محاسبہ اور تنقید کے پورے اختیارات دیے گئے ہیں۔ اسلام لوگوں میں یہ اسپرٹ پیدا کرتا ہے کہ وہ حکمرانوں کے اعمال کو غور سے دیکھتے رہیں۔ جب تک وہ خدا و رسول کی ہدایت پر چل رہے ہوں، اُنکی پوری اطاعت کریں، جب اُن کا

رویہ مشکوک ہو تو محاسبہ کریں، تنقید اور نصیحت سے اصلاح کی کوشش کریں، اور جب انکو اتنا منحرف پائیں کہ دین میں فساد کا خطرہ ہو تو انہیں معزول کر دیں۔

خلافت الٰہیہ کا مقصد مندرجہ بالا سطور پڑھنے کے بعد قیام خلافت الٰہیہ کا مقصد خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ لیکن ہم اسکے ماخذ کے ساتھ اسکا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ شک و ریب کی گنجائش نہ رہے۔ قرآن مجید مندرجہ ذیل الفاظ میں خلافت اسلامیہ کے مقاصد کا تذکرہ کرتا ہے:-

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی	(وہ لوگ ایسے ہیں) کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار
الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا	عطا کریں تو وہ نماز قائم کرینگے اور زکوٰۃ دینگے
الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا	اور اچھے کاموں کا حکم کرینگے اور برے کاموں
عَنِ الْمُنْكَرِ	سے روکینگے۔

اس آیت میں قیام خلافت کے چار مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ اقامۃ[1] صلوٰۃ - ایتاء[2] زکوٰۃ امر بالمعروف[3] - نہی عن المنکر[4]۔ اقامۃ صلوٰۃ سے مراد صرف نماز ہی پڑھنا نہیں ہے بلکہ کل عبادات بدنیہ اپنے اپنے درجات کے اعتبار سے اس میں داخل ہیں۔ اسی طرح ایتاء زکوٰۃ سے مراد محض زکوٰۃ دینا ہی نہیں ہے بلکہ پورے معاشی نظام کو اسلامی معیار و اصول پر قائم کر دینا بھی اس میں داخل ہے۔ رہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تو پہلے ترقی کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے پیش نظر رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر معروف انسان کی حقیقی ترقی میں معاون اور ہر منکر اسکی ترقی میں مانع ہے۔ پس دوسرے الفاظ میں خلافت الٰہیہ کے قیام کے مقاصد یہ ہیں: عبد[1] و معبود کے تعلق کو مضبوط و مستحکم بنانا اور بنی نوع انسان کو صحیح معنوں میں خداوند عالم کا بندہ بنانا دنیا[2] کے معاشی نظام کو درست کر کے ایسی حالت پر قائم رکھنا جس میں نہ جماعتی قار و نیبت کا وجود ہو سکے نہ شخصی قار و نیبت کا، اور نہ فاقہ کشی و غربت کے دلگداز نظارے دیکھنے میں آئیں۔

نوع انسانی کو ہر شعبہ زندگی میں ارتقاء و عروج کی طرف بڑھانا اور اس راہ میں جو موانع ہوں انکو دور کرنا۔

خلافت الٰہیہ کا مفہوم اور مقصد معلوم کرنیکے بعد غالباً مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی وہ غلط فہمیاں رفع ہو جائینگی جو وہ تحریک اسلام اور اسلامی ریاست و حکومت کے متعلق رکھتے ہیں۔ غیر اسلامی ماحول میں عرصہ دراز سے پرورش پانے کی وجہ سے غیر مسلم تو غیر مسلم، خود مسلمان بھی اسلامی حکومت کے متعلق بہت زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ عوام تو عوام خود علماء اسلام میں بھی ریاست کے اسلامی تصور اور اسکے اصول و مقاصد پر نظر رکھنے والے شاذ و نادر ہی ہونگے۔ مسلمانوں کے ذہن میں اسلامی حکومت کا جب تصور آتا ہے تو انکی آنکھوں کے سامنے زمانہ سابق کے مسلمان بادشاہوں کی مطلق العنان فرمانروائی، یا زمانۂ حال کے اتاترک اور عصمت اینونو کی جمہوریت کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ ہم حاکم مطلق ہونگے خوب دادِ عیش دینگے اور ہمارے ماتحت جو قومیں ہونگی انکے ساتھ جو چاہینگے سلوک کرینگے۔ حالانکہ اسلامی حکومت کا اگر یہ مفہوم ہو تو اس میں اور غیر اسلامی حکومت میں کوئی فرق نہیں۔ یہی غلط فہمی ہے جسکی بناء پر ہندوستان کا مسلمان یہ احمقانہ خیال رکھتا ہے کہ غیر اسلامی طریقے اختیار کرکے، شعائر اسلامی کو پامال کرکے، مغربی معاشرت و تمدن اختیار کرکے، عورتوں اور مردوں کی مخلوط تعلیم رائج کرکے، بے حیائی و بے غیرتی کی اشاعت کرکے، اور سر سے پیر تک غیر اسلامی بنکر بھی وہ اسلامی حکومت قائم کرسکتا ہے۔ رہے غیر مسلم تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے معنی مسلمان نامی ایک قوم کے دوسری قوموں پر حکمراں بن جانے کے ہیں۔ یہ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت وہ ہی ایک بدمزہ چیز ہے جس کا کوئی بھی برضا و رغبت خیر مقدم نہیں کرسکتا۔ مگر جب وہ اپنے ہمسایہ مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کو دیکھتا ہے تو اس خیال سے اسکی روح کانپ

جاتی ہے کہ یہ مالک الملک اور ہم رعیت ہوں تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو اخلاق و اعمال ہندوؤں اور سکھوں اور دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں انکو دیکھتے ہوئے کوئی غیر قوم ہندو یا سکھ حکومت کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتی۔ بالکل اسی طرح اسلامی حکومت کو مسلمانوں کی قومی حکومت، اور وہ بھی ان مسلمانوں کی حکومت سمجھنے کے بعد غیر مسلموں میں اس سے وحشت بلکہ نفرت ہونا کوئی خلافِ توقع امر نہیں ہے۔

ان غلط فہمیوں نے تحریک اسلام اور دعوتِ خلافت الٰہیہ کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کردی ہے۔ گذشتہ سطور ان غلط فہمیوں کو دور کردینے کے لیے کافی ہیں۔ مگر یاددہانی کے طور پر میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں اور مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو اچھی طرح اس سے واقف ہوجانا چاہیے کہ اسلامی حکومت کے معنی مسلمانوں کی حاکمیت (Sovereignty) کے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی حاکمیت اسی طرح اور اسی قدر ناجائز اور خلافِ حق و انصاف ہے جس قدر غیر مسلموں کی حاکمیت۔ اسلام سرے سے انسانی حاکمیت ہی کا مخالف ہے۔ اس کا مدعا تو اللہ کی حاکمیت قائم کرنا ہے اور اس اصل الاصول کے خلاف جہاں جو حکومت بھی ہو وہ اسکو غلط کہتا ہے خواہ وہ کسی مسلمان بادشاہ یا رئیس کی حکومت ہو یا غیر مسلم راجہ اور قیصر کی، اور خواہ وہ کسی مسلمان قوم کی حکومت ہو یا غیر مسلم قوم کی۔ درحقیقت اسلامی حکومت نام ہے ان اصول و قوانین کی حکومت کا جو حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی فلاح و ترقی کے لیے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے انسان کو تعلیم کیے ہیں۔ اور اسلامی حکومت کی جانب دعوت دینے کا مطلب انہی اصول و قوانین کی جانب دعوت دینا ہوتا ہے نہ کہ مسلمانوں کی غلامی اور ماتحتی کی جانب۔ ہم غیر مسلموں کو اپنے ماتحت لانا نہیں چاہتے نہ ہم اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہم تو چند اصول و قوانین کی تبلیغ کرتے ہیں اور انکے مطابق اپنی اور

دوسروں کی زندگی کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ اصول اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ہیں اسلیے دوسرے الفاظ میں ہم دنیا کے ہر انسان کو دوسرے انسانوں کی اور خود اسکے اپنے نفس کی غلامی سے آزادی دلاکر اللہ تعالیٰ کی حکومت میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہم میں اور غیر مسلموں میں جو فرق نظر آتا ہے وہ اسلیے ہے کہ ہم داعی ہیں اور وہ مدعو۔ لیکن جب وہ ان اصولوں کو قبول کرکے ان پر عمل پیرا ہو جائینگے تو ہم اور وہ مساوی ہو جائینگے، بلکہ ممکن ہے کہ انفرادی حیثیت سے موجودہ دور کے نسلی مسلمان سے وہ اشخاص اور جماعتیں ترقی و عروج میں بازی لیجائیں جو اسلام کے اصول و قوانین کو بعد میں قبول کریں۔ ان اصول و قوانین کے منافع کسی نسل و وطن، قوم و قبیلہ کے ساتھ مقید و محدود نہیں ہیں۔ دنیا کی ہر قوم و ہر نسل کے اشخاص اس سے یکساں طور پر منتفع ہو سکتے ہیں۔ جس طرح ان سے عبداللہ و عبدالرحمٰن ترقی و فلاح حاصل کر سکتے ہیں اسی طرح ان پر عمل کرکے گاندھی و جواہر لال بھی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

پھر ہماری یہ دعوت کسی تعصب، کسی عناد، کسی مجادلہ و مقابلہ کے لیے نہیں ہے بلکہ محض بنی نوع انسان کی فلاح اور بلندی و ترقی کے لیے ہے۔ دشمنی کے بجائے انکی ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ اس دعوت کا محرک ہے۔ اور اسکی بنیاد محض جذبات پر قائم نہیں ہے بلکہ قوی و مستحکم عقلی و فکری دلائل پر قائم ہے جو ہر صحیح الفطرت اور سلیم العقل انسان کو اپیل کر سکتے ہیں۔

جالندھر میں ہماری ایجنسی

جالندھر میں رسالہ ترجمان القرآن اور تالیفاتِ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایجنسی قائم کر دی گئی ہے ضرورت مند حضرات ذیل کے پتہ سے ہمارا شائع کردہ لٹریچر حاصل کر سکتے ہیں۔

پبلک بک ڈپو۔ رینک بازار۔ جالندھر

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

الٰہ، رب، دین اور عبادت، یہ چار لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن کی ساری دعوت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اکیلا رب اور الٰہ ہے، اسکے سوا نہ کوئی الٰہ ہے نہ رب، اور نہ الوہیت و ربوبیت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ لہٰذا اُسی کو اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرو اور اسکے سوا ہر ایک کی الٰہیت و ربوبیت سے انکار کرو، اسکی عبادت اختیار کرو اور اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اسکے لیے اپنے دین کو خالص کرو اور ہر دوسرے دین کو رد کر دو۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (انبیاء - ۲)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کی طرف یہی وحی کی ہے کہ "میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے لہٰذا میری عبادت کرو"۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (التوبہ - ۵)

اور انکو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اسکے کہ ایک ہی الٰہ کی عبادت کریں۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ پاک ہے اُس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (انبیاء - ۶)

یقیناً تمہارا (یعنی تمام انبیاء کا) یہ گروہ ایک ہی گروہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں لہٰذا میری عبادت کرو۔

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (انعام - ۲۰)

کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (کہف - ۱۲)

تو جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کی عبادت شریک نہ کرے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

ہم نے ہر قوم میں ایک رسول اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے پرہیز کرو۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ (اٰل عمران - ۵) وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (اٰل عمران - ۹)

تو کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب چار و ناچار اسی کی مطیع ہیں اور اسی کی طرف انہیں پلٹ کر جانا ہے۔

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (الزمر - ۲)

اے نبی کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں اپنے دین کو اسکے لیے خالص کرتے ہوئے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (اٰل عمران - ۵)

اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تم سب کا رب بھی، لہٰذا اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

یہ چند آیات محض نمونہ کے طور پر ہیں، ورنہ جو شخص قرآن کو پڑھے گا وہ اول نظر میں محسوس کر لیگا کہ قرآن کا سارا بیان انہی چار اصطلاحوں کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی خیال (Central Idea) یہی ہے کہ اللہ رب اور الٰہ ہے اور ربوبیت و الٰہیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے، لہٰذا عبادت اسی کی ہونی چاہیے اور دین خالصتہً اسی کے لیے ہونا چاہیے۔

اصطلاحات اربعہ کی اہمیت اب یہ ظاہر بات ہے کہ قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لیے ان چاروں اصطلاحوں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا بالکل ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص نہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے، عبادت کی کیا تعریف ہے، اور دین کسے کہتے ہیں، تو در اصل اسکے لیے

پورا قرآن بے معنی ہو جائیگا، وہ توحید کو جان سکیگا، نہ شرک کو سمجھ سکیگا، نہ عبادت کو اللہ کیلئے مخصوص کر سکیگا، اور نہ دین ہی کو اللہ کے لیے خالص کر سکیگا۔ اسی طرح اگر کسی کے ذہن میں ان اصطلاحوں کا مفہوم غیر واضح اور نامکمل ہو تو اسکے لیے قرآن کی پوری تعلیم غیر واضح ہوگی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اسکا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل رہ جائینگے۔ وہ لا الٰہ الا اللہ کہتا رہیگا اور اسکے باوجود بہتوں کو الٰہ بناتا رہیگا۔ وہ اللہ کے سوا کسی کے رب ہونے کا اعلان کرتا رہیگا اور اسکے باوجود بہت سے ارباب من دون اللہ اس کے رب بنے رہینگے۔ وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ کہے گا کہ میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا، اور پھر بھی بہت سے معبودوں کی عبادت میں مشغول رہیگا۔ وہ پورے زور کے ساتھ کہیگا کہ میں اللہ کے دین میں ہوں، اور اگر کسی دوسرے دین کی طرف اسے منسوب کیا جائے تو لڑنے پر آمادہ ہو جائیگا، مگر اسکے باوجود بہت سے دینوں کا قلادہ اسکی گردن میں پڑا رہیگا۔ اسکی زبان سے کسی غیر اللہ کے لیے "الٰہ" اور "رب" کے الفاظ تو کبھی نہ نکلینگے، مگر یہ الفاظ جن معانی کے لیے وضع کیے گئے ہیں اُنکے لحاظ سے اسکے بہت سے الٰہ اور ارباب ہونگے اور اس بے چارے کو خبر تک نہ ہوگی کہ میں نے واقعی اللہ کے سوا دوسرے ارباب و الٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسکے سامنے اگر آپ کہیں کہ تو دوسروں کی "عبادت" کر رہا ہے اور "دین" میں شرک کا مرتکب ہو رہا ہے تو وہ پتھر مارنے اور منہ نوچنے کے لیے دوڑیگا مگر عبادت اور دین کی جو حقیقت ہے اسکے لحاظ سے واقعی وہ دوسروں کا عابد اور دوسروں کے دین میں داخل ہوگا اور نہ جانے گا کہ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ حقیقت میں دوسروں کی عبادت ہے، اور یہ حالت جس میں مبتلا ہوں یہ حقیقت میں غیر اللہ کا دین ہے۔

غلط فہمی کا اصل سبب عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا اُس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ الٰہ کے کیا معنی ہیں اور رب کسے کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں لفظ انکی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے،

انہیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے۔ اسلیے جب ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا الٰہ اور رب ہے اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں، تو وہ پوری بات کو پا گئے۔ انہیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہو گیا کہ دوسروں کے لیے کس چیز کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ کے لیے کس چیز کو خاص کیا جا رہا ہے۔ جنہوں نے مخالفت کی یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے، اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان لائے کہ اس عقیدہ کو قبول کر کے ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہوگا۔ اسی طرح عبادت اور دین کے الفاظ بھی ان کی بولی میں پہلے سے رائج تھے، انکو معلوم تھا کہ عبد کسے کہتے ہیں، عبودیت کس حالت کا نام ہے، عبادت سے کونسا رویہ مراد ہے، اور دین کا کیا مفہوم ہے، اسلیے جب ان سے کہا گیا کہ سب کی عبادت چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کرو، اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو، تو انہیں قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی۔ وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے۔

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لیے خاص ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائیٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے اُن کے لیے الٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائیٹی میں رائج تھے۔ انہی دونوں وجوہ سے دورِ اخیر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے

مسلمان سمجھتے تھے۔ مثلاً لفظ الٰہ کو قریب قریب بتوں اور دیوتاؤں کا ہم معنی بنا دیا گیا، رب کو پالنے پوسنے والے یا پروردگار کا مترادف ٹھیرایا گیا، عبادت کے معنی پوجا اور پرستش کے کیے گئے، دین کو دھرم اور مذہب اور (Religion) کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا، طاغوت کا ترجمہ بُت یا شیطان کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ بناؤ، لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بتوں اور دیوتاؤں کو چھوڑ دیا ہے لہٰذا قرآن کا منشا پورا کر دیا، حالانکہ الٰہ کا مفہوم اور جن چیزوں پر عائد ہوتا ہے ان سب کو وہ اچھی طرح پکڑے ہوئے ہیں اور انہیں خبر نہیں کہ یہ ہم غیر اللہ کو الٰہ بنا رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو رب تسلیم نہ کرو، لوگ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ کے سوا کسی کو پروردگار نہیں مانتے لہٰذا ہماری توحید مکمل ہو گئی، حالانکہ رب کا اطلاق اور جن مفہومات پر ہوتا ہے ان کے لحاظ سے اکثر لوگوں نے خدا کے بجائے دوسروں کی ربوبیت تسلیم کر رکھی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ طاغوت کی عبادت چھوڑ دو اور صرف اللہ کی عبادت کرو، لوگ کہتے ہیں کہ ہم بتوں کو نہیں پوجتے، شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، اور صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، لہٰذا ہم نے قرآن کی یہ بات بھی پوری کر دی، حالانکہ پتھر کے بتوں کے سوا دوسرے طاغوتوں سے وہ چمٹے ہوئے ہیں اور پرستش کے سوا دوسری قسم کی تمام عبادتیں انہوں نے اللہ کے بجائے غیر اللہ کے لیے خاص کر رکھی ہیں۔ یہی حال دین کا ہے کہ اللہ کے لیے دین کو خالص کرنے کا مطلب صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی "مذہب اسلام" قبول کرے اور ہندو یا عیسائی یا یہودی نہ رہے، اس بنا پر ہر وہ شخص جو "مذہب اسلام" میں ہے یہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے اللہ کے لیے دین کو خالص کر رکھا ہے، حالانکہ دین کے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کا دین اللہ کے لیے خالص نہیں ہے۔

غلط فہمی کے نتائج پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم، بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آ رہے ہیں ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی مرکزی تعلیم اور اسکے حقیقی مدعا کو واضح کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان اصطلاحوں کی پوری پوری تشریح کی جائے۔

اگرچہ میں اس سے پہلے اپنے متعدد مضامین میں ان کے مفہوم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر چکا ہوں، لیکن جو کچھ اب تک میں نے بیان کیا ہے وہ نہ تو بجائے خود تمام غلط فہمیوں کو صاف کرنے کے لیے کافی ہے، اور نہ اس سے لوگوں کو پوری طرح اطمینان حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ لغت اور آیات قرآنی سے استشہاد کے بغیر لوگ میری ہر تشریح کو میری ذاتی رائے سمجھتے ہیں، اور میری رائے کم از کم ان لوگوں کے لیے تو اطمینان کی موجب نہیں ہو سکتی جو مجھ سے اختلافِ رائے رکھتے ہوں۔ اس مضمون میں میں کوشش کرونگا کہ ان چاروں اصطلاحوں کا مکمل مفہوم واضح کروں، اور کوئی ایسی بات بیان نہ کروں جس کا ثبوت لغت اور قرآن سے نہ ملتا ہو۔

ترتیب کے لحاظ سے ہم سب سے پہلے لفظ الٰہ کو لینگے۔ پھر رب، پھر عبادت، پھر دین،

الٰہ

لغوی تحقیق اس لفظ کا مادّہ آ ل ہ ہے اس مادّہ سے جو الفاظ لغت میں آئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

اَلِہَ اذا تحیّر، یعنی حیران و سرگشتہ ہوا۔

الہت الیٰ فلانٍ ای سکنت الیہ، یعنی اس کی پناہ میں جا کر یا اس سے تعلق پیدا کر کے میں نے سکون و اطمینان حاصل کیا۔

الہ الرجل یألہ اذا فزع من امر نزل بہ فالٰھہ غیرہ ای اجارہ یعنی آدمی کسی مصیبت یا تکلیف کے نزول سے خوف زدہ ہوا اور دوسرے نے اسکو پناہ دی۔

الہ الرجل الی الرجل اتجہ الیہ لشدۃ شوقہ الیہ۔ آدمی نے دوسرے کی طرف شدت شوق کی وجہ سے توجہ کی۔

الہ الفصیل اذا ولع بامہ۔ اونٹنی کا بچہ جو اس سے بچھڑ گیا تھا ماں کو پاتے ہی اس سے چمٹ گیا۔

لاہ یلیہ لیہا ولاھًا اذا احتجب۔ یعنی پوشیدہ و مستور ہوا۔ نیز ارتفع یعنی بلند ہوا۔

اَلَہَ اِلٰھَۃً وَاُلُوھَۃً وَالوھیۃً عَبَدَ۔ یعنی عبادت کی۔

ان تمام معانی مصدریہ پر غور کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اَلَہَ یَاْلَہُ اِلٰھَۃً کے معنی عبادت و پرستش، اور الٰہ کے معنی معبود کس مناسبت سے پیدا ہوئے:

انسان کے ذہن میں عبادت کیلیے اولین تحریک اپنی حاجتمندی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی کی عبادت کا خیال تک نہیں کر سکتا جب تک اسے یہ گمان نہ ہو کہ وہ میری حاجتیں پوری کر سکتا ہے، خطرات اور مصائب میں مجھے پناہ دے سکتا ہے، اضطراب کی حالت میں مجھے سکون بخش سکتا ہے۔

پھر یہ بات کہ آدمی کسی کو حاجت روا سمجھے اس تصور کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتی ہے کہ وہ اسے اپنے سے بالاتر سمجھے اور نہ صرف مرتبہ کے اعتبار سے اسکی برتری تسلیم کرے بلکہ طاقت اور زور کے اعتبار سے بھی اسکی بالادستی کا قائل ہو۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سلسلۂ اسباب و علل کے تحت جن چیزوں سے بالعموم انسان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور جنکی حاجت روائی کا سارا عمل انسان کی آنکھوں کے سامنے یا اسکے حدودِ علم کے اندر واقع ہوتا ہے انکے متعلق پرستش کا کوئی جذبہ اس میں پیدا نہیں ہوتا مثلاً مجھے خرچ کیلیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے، میں جا کر ایک شخص سے نوکری یا مزدوری کی درخواست کرتا ہوں، وہ میری درخواست کو قبول کر کے مجھے کوئی کام دیتا ہے اور اس کام کا معاوضہ مجھے دے دیتا ہے۔ یہ سارا عمل چونکہ میرے حواس اور علم کے دائرے کے اندر پیش آیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس نے میری یہ حاجت کس طرح پوری کی ہے، اسلیے میرے ذہن میں اسکے لائق پرستش ہونے کا وہم تک نہیں گذرتا۔ پرستش کا تصور میرے ذہن میں صرف

اسی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ کسی کی شخصیت یا اسکی طاقت یا اسکی حاجت روائی و اثر اندازی کی کیفیت پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہو۔ اسی لیے معبود کے معنی میں وہ لفظ اختیار کیا گیا جسکے اندر رفعت کے ساتھ پوشیدگی اور حیرانی و سرگشتگی کا مفہوم بھی شامل ہے۔ پھر جسکے متعلق بھی انسان یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ احتیاج کی حالت میں حاجت روائی کر سکتا ہے، خطرات میں پناہ دے سکتا ہے، اضطراب میں سکون بخش سکتا ہے، اسکی طرف انسان کا اشتیاق کے ساتھ توجہ کرنا ایک امر ناگزیر ہے۔

پس معلوم ہوا کہ معبود کیلیے الٰہ کا لفظ جن تصورات کی بنا پر بولا گیا وہ یہ ہیں: حاجت روائی۔ پناہ دہندگی۔ سکون بخشی۔ بالاتری۔ بالادستی۔ ان اعتبارات اور ان طاقتوں کا مالک ہونا جن کی وجہ سے یہ توقع کی جائے کہ معبود قاضی الحاجات اور پناہ دہندہ ہو سکتا ہے۔ اسکی شخصیت کا پراسرار ہونا یا منظرِ عام پر نہ ہونا۔ انسان کا اسکی طرف مشتاق ہونا۔

اہلِ جاہلیت کا تصورِ الٰہ اس لغوی تحقیق کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ الوہیت کے متعلق اہلِ عرب اور امم قدیمہ کے وہ کیا تصورات تھے جنکی تردید قرآن کرنا چاہتا ہے:

(۱) وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا (مریم - ۵)
اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے ذریعۂ قوت ہوں (یا انکی حمایت میں آکر وہ محفوظ رہیں)

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ (یٰس - ۷)
اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا لیے ہیں اس امید پر کہ انکی مدد کی جائیگی (یعنی وہ الٰہ انکی مدد کرینگے)

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جاہلیت جنکو الٰہ کہتے تھے انکے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ انکے پشتیبان ہیں مشکلات اور مصائب میں انکی حفاظت کرتے ہیں، اور انکی حمایت میں وہ خوف اور نقصان سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

(۲) فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ مِن شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ (ہود - ۹)
پھر جب تیرے رب کے فیصلہ کا وقت آگیا تو انکے وہ الٰہ جنہیں وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، انکے کچھ بھی کام نہ آسکے اور وہ انکے لیے تباہی و ہلاکت کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ کا سبب نہ بنے۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ أَمْوَاتٌ
اور اللہ کے بجائے جنکو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں، مردہ

غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ، إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَاحِدٌ (النحل - ۳)

ہیں نہ کہ زندہ، اور انہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ انہیں کب دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائیگا۔ تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔

لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ، لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ (قصص - ۹)

اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکار، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُرَكَاءَ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (یونس - ۷)

جو لوگ اللہ کے بجائے دوسرے شریکوں کو پکارتے ہیں وہ محض وہم پر چلتے ہیں اور نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

ان آیات سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ اہل جاہلیت جنکو الٰہ کہتے تھے انہیں مشکل کشائی وحاجت روائی کے لیے پکارتے یا بالفاظ دیگر ان سے دعا مانگتے تھے دوسرے یہ کہ انکے یہ الٰہ صرف جن یا فرشتے یا دیوتا ہی نہ تھے بلکہ وفات یافتہ انسان بھی تھے، جیسا کہ اموات غیر احیاء وما یشعرون ایان یبعثون سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان الٰہوں کے متعلق وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ انکی دعاؤں کو سنتے ہیں اور انکی مدد کو پہنچنے پر قادر ہیں۔

یہاں دعا کے مفہوم اور اُس امداد کی نوعیت کو ذہن نشین کرلینا ضروری ہے جسکی الٰہ سے توقع کی جاتی ہے۔ اگر مجھے پیاس لگتی ہے اور میں اپنے خادم کو پانی لانے کے لیے پکارتا ہوں یا اگر میں بیمار ہوتا ہوں اور علاج کے لیے ڈاکٹر کو بلاتا ہوں تو اس پر نہ دعا کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ اسکے معنی خادم یا ڈاکٹر کو الٰہ بنانے کے ہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ سلسلۂ اسباب کے تحت ہے نہ کہ اس سے مافوق لیکن اگر میں پیاس کی حالت میں یا بیماری میں خادم یا ڈاکٹر کو پکارنے کے بجائے کسی ولی یا کسی دیوتا کو پکارتا ہوں تو یہ ضرور اسکو الٰہ بنانا اور اس سے دعا مانگنا ہے، کیونکہ جو ولی صاحب

مجھ سے سینکڑوں میل دور کسی قبر میں آرام فرما رہے ہیں، انکو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ میں ان کو سمیع و بصیر سمجھتا ہوں اور یہ خیال رکھتا ہوں کہ عالم اسباب پر انکی فرمانروائی قائم ہے جسکی وجہ سے وہ مجھ تک پانی پہنچانے یا میری بیماری دور کر دینے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ایسی حالت میں کسی دیوتا کو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ پانی یا صحت و مرض پر اسکی حکومت ہے اور وہ فوق الطبیعی طور پر میری حاجت پوری کرنے کے لیے اسباب کو حرکت دے سکتا ہے۔ پس الٰہ کا وہ تصور جسکی بنا پر اس سے دعا مانگی جاتی ہے لامحالہ ایک فوق الطبیعی اقتدار اور اس کے ساتھ ہی فوق الطبیعی قوتوں کے مالک ہونے کا تصور ہے۔

(۳) وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ، فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً، بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (احقاف - ۴)

تمہارے اردگرد جن بستیوں کے آثار ہیں انکو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ انہیں ہم نے بار بار بدل بدل کر اپنی نشانیاں دکھائی تھیں تاکہ وہ رجوع کریں۔ تو جنکو انہوں نے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اللہ کے سوا اپنا الٰہ بنایا تھا انہوں نے نزولِ عذاب کے وقت کیوں نہ انکی مدد کی؟ مدد تو درکنار وہ تو انہیں چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ یہ تھی حقیقت ان کے جھوٹ اور ان کی من گھڑت باتوں کی۔

وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ (۳۶-۲)

کیوں نہ میں اس کی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے؟ کیا اس کے سوا میں ان کو الٰہ بناؤں جن کا حال یہ ہے کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو انکی سفارش میرے کچھ کام نہیں آسکتی اور وہ مجھے چھڑا نہیں سکتے؟

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ، مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى، اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (الزمر - ۱)

اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے حامی یا کارساز ٹھیرا رکھے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو انکی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے قریب کردیں، اللہ ان کے درمیان اُس معاملہ کا فیصلہ (قیامت کے روز) کریگا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس - ۲)

وہ اللہ کے سوا انکی عبادت کرتے ہیں جو نہ انکو ضرر پہنچانے پر قادر ہیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

ان آیات سے چند مزید باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت اپنے الٰہوں کے متعلق یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ساری خدائی انہی کے درمیان تقسیم ہوگئی ہے اور انکے اوپر کوئی خداوندِ اعلیٰ نہیں ہے۔ وہ واضح طور پر ایک خداوندِ اعلیٰ کا تصور رکھتے تھے جس کے لیے ان کی زبان میں اللہ کا لفظ تھا، اور دوسرے الٰہوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس خداوندِ اعلیٰ کی خدائی میں ان الٰہوں کا کچھ دخل اور اثر ہے، انکی بات مانی جاتی ہے، ان کے ذریعہ سے ہمارے کام بن سکتے ہیں، انکی سفارش سے ہم نفع حاصل کرسکتے ہیں اور نقصانات سے بچ سکتے ہیں۔ اپنی خیالات کی بنا پر وہ اللہ کے ساتھ اُن کو بھی الٰہ قرار دیتے تھے لہٰذا اُنکی اصطلاح کے لحاظ سے جسکے متعلق بھی یہ خیالات رکھے جائیں وہ الٰہ ہے، یا بالفاظِ دیگر کسی کے متعلق یہ خیالات رکھنا اُسے الٰہ بنانا ہے۔

(۴) وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (النحل - ۷)

اللہ فرماتا ہے کہ دو الٰہ نہ بناؤ، الٰہ تو ایک ہی ہے۔ لہٰذا تم مجھی سے ڈرو،

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کی ناراضی سے خوف کیا جائے اور جس کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ اگر ہم اسکی توجہ اور عنایت سے محروم ہو گئے تو نقصان اٹھائینگے، وہ الٰہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں الٰہ کے تصور میں اسکے لائق خوف و حذر ہونے کا تصور بھی شامل ہے۔

(۵) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (التوبہ - ۵)

انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی رب ٹھیرایا حالانکہ انہیں صرف ایک الٰہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (الفرقان - ۴۳)

ذرا کیا خیال ہے اس شخص کے متعلق جس نے اپنی خواہش نفس کو الٰہ بنا لیا ہے؟ کیا تو اسکی ذمہ داری لے سکتا ہے؟

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ (انعام - ۱۶)

اس طرح بہت سے مشرکوں کے لیے انکے ٹھیرائے ہوئے شریکوں (یعنی شرکا فی الالوہیت) نے اپنی اولاد کو قتل کرنے کا فعل خوشنما بنا دیا۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ - ۳)

یا وہ ایسے شرکاء (یعنی شرکاء فی الالوہیت) رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے ازقسم دین ایسی شریعت مقرر کی ہے جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی؟

ان آیات میں الٰہ کا ایک اور مفہوم ملتا ہے جو پہلے مفہومات سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں فوق الطبیعی اقتدار کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جسکو الٰہ بنایا گیا ہے وہ یا تو کوئی انسان ہے یا انسان کا اپنا نفس ہے۔ اور الٰہ اسکو اس معنی میں نہیں بنایا گیا ہے کہ اس سے دعا مانگی جاتی ہو یا اسے نفع و نقصان کا مالک سمجھا جاتا ہو اور اسکی پناہ ڈھونڈی جاتی ہو، بلکہ وہ الٰہ اس معنی میں بنایا گیا ہے کہ اس کے حکم کو قانون تسلیم کیا گیا، اسکے امر و نہی کی اطاعت کی گئی، اسکے حلال کو حلال اور اسکے حرام کو

حرام مان لیا گیا، اور یہ خیال کر لیا گیا کہ اس کو بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار حاصل ہے کوئی اور اقتدار اس سے بالاتر نہیں ہے جس کی سند لینے اور جس سے رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ پہلی آیت میں علماء اور راہبوں کو الٰہ بنانے کا ذکر ہے۔ اس کی واضح تشریح ہم کو حدیث میں ملتی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ جس چیز کو تمہارے علماء اور راہبوں نے حلال کیا اسے تم لوگ حلال مان لیتے تھے اور جسے انہوں نے حرام قرار دیا اسے تم حرام تسلیم کر لیتے تھے اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ اللہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے۔ رہی دوسری آیت تو اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جو شخص اپنی خواہش نفس کی اطاعت کرتا ہو اور اسی کے حکم کو بالاتر رکھتا ہو وہ دراصل اپنے نفس ہی کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہے۔ اسکے بعد والی دونوں آیتوں میں اگرچہ الٰہ کے بجائے شریک کا لفظ آیا ہے، مگر جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں واضح کیا ہے شریک سے مراد الٰہیت میں شریک ٹھیرانا ہے، اور یہ دونوں آیتیں صاف فیصلہ کرتی ہیں کہ جو لوگ اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے مقرر کیے ہوئے رواج یا ضابطہ یا طریقہ کو جائز قانون سمجھتے ہیں وہ اُس قانون ساز کو الٰہیت میں خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں۔

الوہیت کے باب میں ملاکِ امر الٰہ کے یہ جتنے مفہومات اوپر بیان ہوئے ہیں ان سب کے درمیان ایک منطقی ربط ہے۔ جو شخص فوق الطبیعی معنی میں کسی کو اپنا حامی و مددگار، مشکل کشا اور حاجت روا، دعاؤں کا سننے والا اور نفع یا نقصان پہنچانے والا سمجھتا ہے، اسکے ایسا سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ اسکے نزدیک وہ ہستی نظام کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت کا اقتدار رکھتی ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی سے تقویٰ اور خوف کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اسکی ناراضی میرے لیے نقصان کی اور رضامندی میرے لیے فائدے کی موجب ہے اُسکے اس اعتقاد اور اس عمل کی وجہ بھی

اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے ذہن میں اس ہستی کے متعلق ایک طرح کے اقتدار کا تصور رکھتا ہے پھر جو شخص خداوند اعلیٰ کو ماننے کے باوجود اسکے سوا دوسروں کی طرف اپنی حاجات کے لیے رجوع کرتا ہے اسکے اس فعل کی علت بھی صرف یہی ہے کہ خداوندی کے اقتدار میں وہ انکو کسی نہ کسی طرح کا حصہ دار سمجھ رہا ہے۔ اور علی ہذا القیاس وہ شخص جو کسی کے حکم کو قانون اور کسی کے امر و نہی کو اپنے لیے واجب الاطاعت قرار دیتا ہے وہ بھی اس کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتا ہے۔ پس الوہیت کی اصل روح اقتدار ہے، خواہ وہ اقتدار اس معنی میں سمجھا جائے کہ نظام کائنات پر اس کی فرمانروائی فوق الطبیعی نوعیت کی ہے، یا وہ اس معنی میں تسلیم کیا جائے کہ دنیوی زندگی میں انسان اسکے تحت امر ہے اور اس کا حکم بذاتِ خود واجب الاطاعت ہے۔

قرآن کا استدلال یہی اقتدار کا تصور ہے جسکی بنیاد پر قرآن اپنا سارا زور غیر اللہ کی الٰہیت کے انکار اور صرف اللہ کی الٰہیت کے اثبات پر صرف کرتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ زمین اور آسمان میں صرف ایک ہی ہستی تمام اختیارات و اقتدارات کی مالک ہے، خلق اسی کی ہے نعمت اسی کی ہے، امر اسی کا ہے، قوت اور زور بالکل اسکے ہاتھ میں ہے، ہر چیز چار و ناچار اسی کی اطاعت کر رہی ہے، اسکے سوا نہ کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے، نہ کسی کا حکم چلتا ہے، نہ کوئی خلق اور تدبیر اور انتظام کے رازوں سے واقف ہے، اور نہ کوئی اختیارات حکومت میں ذرہ برابر شریک و حصہ دار ہے، لہٰذا اسکے سوا حقیقت میں کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور جب حقیقت میں کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے تو تمہارا ہر وہ فعل جو تم دوسروں کو الٰہ سمجھتے ہوئے کرتے ہو اصلاً غلط ہے خواہ وہ دعا مانگنے یا پناہ ڈھونڈنے کا فعل ہو، یا خوف و رجا کا فعل ہو، یا سفارشی بنانے کا فعل ہو، یا حکم ماننے اور اطاعت کرنے کا فعل ہو۔ یہ تمام تعلقات جو تم نے دوسروں سے قائم کر رکھے ہیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں کیونکہ وہی اکیلا صاحب اقتدار ہے۔

اس باب میں قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے وہ اسی کی زبان سے سنیے :

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلٰهٌ وَّفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (الزخرف ۸۴)

وہی ہے جو آسمان میں بھی اکیلا الٰہ ہے اور زمین میں بھی وہی الٰہ ہے، اور وہی حکیم اور علیم ہے

(یعنی آسمان و زمین میں حکومت کرنے کے لیے جس علم اور حکمت کی ضرورت ہے وہ اسی کے پاس ہے)

أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ... وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ... إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَاحِدٌ (النحل ۱۷-۲۲)

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو پیدا نہیں کرتا دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی؟ ..... خدا کو چھوڑ کر یہ جن دوسروں کو پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں .... تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (فاطر - ۱)

لوگو! تم پر اللہ کا جو احسان ہے اس کا دھیان کرو کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، پھر تم کدھر بھٹکائے جا رہے ہو؟

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَىٰ قُلُوبِكُم مَّنْ إِلٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِهِ (انعام - ۵)

کہو تم نے کبھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری سننے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کر لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے (یعنی عقل چھین لے) تو اللہ کے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو یہ چیزیں تمہیں لا دیگا؟

وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ

وہی اللہ ہے کہ اسکے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ اُسی کے لیے تعریف ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ - قُلْ أَرَأَيْتُمْ
إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ
بِضِيَاءٍ أَفَلَا تَسْمَعُونَ - قُلْ أَرَأَيْتُمْ
إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ
بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ أَفَلَا تُبْصِرُونَ
(قصص - ۷)

وہی اکیلا صاحب حکم و اقتدار ہے - اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو - کہو تم نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اسکے سوا کونسا دوسرا الٰہ ہے جو تمہیں روشنی لا دیگا؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ کہو تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اگر اللہ تمہارے اوپر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اس کے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو تمہیں رات لا دیگا کہ اس میں تم سکون حاصل کرو؟ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ
مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ
ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ
وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ
مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ
عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ (السبا - ۳)

کہو کہ اللہ کے سوا جن کو تم نے الٰہ سمجھ رکھا ہے انہیں پکار دیکھو، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں، نہ آسمان و زمین کے انتظام میں ان کی کوئی شرکت ہے، نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے، اور نہ اللہ کے ہاں کوئی سفارش کام آتی ہے بجز اُس کے جس کے حق میں اللہ خود ہی سفارش کی اجازت دے -

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ
بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ
النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى .....

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر چڑھا کر لاتا ہے اس نے سورج اور چاند کو تابع کر رکھا ہے اور ہر ایک اپنی مدت مقررہ تک چل رہا ہے .....

.... خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ	... اس نے ایک نفس سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی
ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ	(یعنی نسل انسانی کا آغاز کیا) پھر اسی نفس سے اس کا
مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ،	جوڑا بنایا اور تمہارے لیے مویشیوں کے آٹھ جوڑے
يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا	اتارے۔ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں اس طرح
مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ،	پیدا کرتا ہے کہ تین پردوں[1] کے اندر تمہاری تخلیق
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ	کے یکے بعد دیگرے کئی مدارج طے ہوتے ہیں۔
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (الزمر-۱)	یہی اللہ تمہارا رب ہے، اقتدار حکومت اسی کا

ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، پھر تم کدھر پھیرے جا رہے ہو؟

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا
وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا	اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر وہ خوش
بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ	منظر باغ لگائے جنکے درخت لگانا تمہارے بس
اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ،	میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں
بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ۔ اَمَّنْ جَعَلَ	میں شریک ہے؟ مگر یہ لوگ حقیقت سے منہ موڑتے
الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا	ہیں۔ پھر وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار
وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ	بنایا اور اس میں دریا جاری کیے اور اس کے
حَاجِزًا، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، بَلْ اَكْثَرُهُمْ	لیے پہاڑوں کو لنگر بنایا اور دو سمندروں کے درمیان
لَا يَعْلَمُوْنَ۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ	پردہ حائل کیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں
اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ	میں بھی شریک ہے؟ مگر اکثر مشرکین بے علم ہیں۔
خُلَفَآءَ الْاَرْضِ، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، قَلِيْلًا	پھر وہ کون ہے جو اضطرار کی حالت میں آدمی کی دعا

[1] تین پردوں سے مراد پیٹ، رحم اور مشیمہ ہے

مَّا تَذَكَّرُونَ - اَمَّنْ يَّهْدِيكُمْ فِي
ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ
الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ
مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ -
اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (النمل - ۵)

سُنتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو تم کو زمین میں خلیفہ بناتا ہے (یعنی تصرف کے اختیارات دیتا ہے)؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ مگر تم کم ہی دھیان کرتے ہو۔ پھر وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور تری کے اندھیاروں میں راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت (یعنی بارش) سے پہلے خوشخبری لانے والی ہواؤں بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ اللہ بالاتر ہے ان کے اُس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔ پھر وہ کون ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا اور اس کا اعادہ کرتا ہے، اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ کہو اگر تم اپنے شرک میں سچے ہو تو اس پر دلیل[1] لاؤ۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ
يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ
كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا وَاتَّخَذُوْا
مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا
وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ

وہ جو آسمانوں اور زمین کی حکومت کا مالک ہے اور جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے اور اقتدار حکومت میں جسکا کوئی شریک نہیں ہے اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور ہر چیز کے لیے پورا پورا اندازہ مقرر کیا ہے، لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے الٰہ بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، جو خود اپنی

[1] یعنی اگر تم مانتے ہو کہ یہ سب کام اللہ ہی کے ہیں اور ان کاموں میں کوئی اسکا شریک نہیں ہے تو آخر کس دلیل سے تم الٰہیت میں اسکے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہو؟ جنکے پاس اقتدار نہیں اور زمین و آسمان میں جنکا کوئی خود مختارانہ کام نہیں وہ الٰہ کیسے ہو گئے؟

لَا نَفْسِهِمْ ضَرًّا وَّ نَفْعًا وَّ لَا يَمْلِكُوْنَ
مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا (الفرقان-۱)

ذات کے لیے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور جنکو موت اور زندگی اور دوبارہ پیدائش پر کسی قسم کا اقتدار حاصل نہیں ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى
يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَّ
خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ،
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ
كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
وَّكِيْلٌ (انعام-۱۳)

آسمان و زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا اسکا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اسکی کوئی بیوی نہیں ہے، اس نے تو ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی اسکے سوا الٰہ نہیں ہے، ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو اور وہی ہر چیز کی حفاظت و خبر گیری کا کفیل ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوْ يَرَى
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ
اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بقرہ - ۲۰)

بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو خدائی میں اسکا شریک و مماثل قرار دیتے ہیں اور اللہ کی طرح اُنکو بھی محبوب رکھتے ہیں، حالانکہ جو ایمان لانے والے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ کاش یہ ظالم اُس حقیقت کو جسے نزولِ عذاب کے وقت محسوس کرینگے آج ہی محسوس کر لیتے کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے پاس ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ
اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ
اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ
لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (احقاف-۱)

کہو تم نے اپنے ان معبودوں کی حالت پر کبھی غور بھی کیا جنہیں تم خدا کے بجائے حاجت روائی کے لیے پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین کا کتنا حصہ ان کا بنایا ہوا ہے اور آسمانوں کی پیدائش میں انکی کس قدر شرکت ہے؟ .... اس سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر

کسی ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (انبیاء - ۲)

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور بھی الٰہ ہوتے تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ پس اللہ جو عرش (یعنی کائنات کے تخت سلطنت) کا مالک ہے اُن تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ اسکی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ اپنے کسی فعل کے لیے جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِن وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (المومنون - ۵)

اللہ نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ اسکے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کو لے کر اٹھتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔

قُل لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ۝ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا (بنی اسرائیل - ۵)

اے نبی کہو کہ اگر اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ ہوتے، جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے، تو وہ مالک عرش کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے ضرور تدبیریں تلاش کرتے۔ پاک ہے وہ اور بہت بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ان تمام آیات میں اول سے آخر تک ایک ہی مرکزی خیال پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ الٰہیت اور اقتدار لازم و ملزوم ہیں، اور اپنی روح و معنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ جو اقتدار نہیں رکھتا وہ الٰہ نہیں ہو سکتا اور اسے الٰہ نہ ہونا چاہیے، اور جو اقتدار رکھتا ہے وہی الٰہ ہو سکتا ہے اور اسی کو الٰہ ہونا چاہیے، کیونکہ الٰہ سے تمہاری جس قدر ضروریات متعلق ہیں، یا جن ضروریات کی خاطر تمہیں کسی کو الٰہ ماننے کی حاجت پیش آتی ہے، ان میں سے کوئی ضرورت بھی اقتدار کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی، لہٰذا غیر مقتدر کا الٰہ ہونا بے معنی ہے،

حقیقت کے خلاف ہے، اور اسکی طرف رجوع کرنا لاحاصل ہے۔

اس مرکزی خیال کو لے کر قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے اسکے مقدمات اور نتائج حسب ذیل ترتیب کے ساتھ اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں:

(۱) حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی، امداد و اعانت، خبر گیری و حفاظت، اور استجابت دعوات جنکو تم نے معمولی کام سمجھ رکھا ہے، دراصل یہ معمولی کام نہیں ہیں بلکہ انکا سررشتہ پورے نظام کائنات کی تخلیقی اور انتظامی قوتوں سے جا ملتا ہے۔ تمہاری ذرا ذرا سی ضرورتیں جس طرح پوری ہوتی ہیں اس پر غور کرو تو تم کو معلوم ہو کہ زمین و آسمان کے عظیم الشان کارخانہ میں بیشمار اسباب کی مجموعی حرکت کے بغیر ان کا پورا ہونا محال ہے۔ پانی کا ایک گلاس جو تم پیتے ہو، اور گیہوں کا ایک دانہ جو تم کھاتے ہو، اسکو مہیا کرنے کے لیے سورج اور زمین اور ہواؤں اور سمندروں کو خدا جانے کتنا کام کرنا پڑتا ہے تب کہیں یہ چیزیں تم کو بہم پہنچتی ہیں۔ پس تمہاری دعائیں سننے اور تمہاری حاجتیں رفع کرنے کے لیے کوئی معمولی اقتدار نہیں بلکہ وہ اقتدار درکار ہے جو زمین و آسمان کو پیدا کرنے کے لیے، سیاروں کو حرکت دینے کے لیے، ہواؤں کو گردش دینے اور بارش برسانے کے لیے، غرض پوری کائنات کا انتظام کرنے کے لیے درکار ہے۔

(۲) یہ اقتدار ناقابل تقسیم ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خلق کا اقتدار کسی کے پاس ہو، اور رزق کا کسی اور کے پاس، سورج کسی کے قبضہ میں ہو اور زمین کسی اور کے قبضہ میں، پیدا کرنا کسی کے اختیار میں ہو، بیماری و صحت کسی اور کے اختیار میں، اور موت اور زندگی کسی تیسرے کے اختیار میں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ نظام کائنات کبھی چل ہی نہ سکتا۔ لہٰذا تمام اقتدارات و اختیارات کا ایک ہی مرکزی فرمانروا کے قبضہ میں ہونا ضروری ہے، کائنات کا انتظام چاہتا ہے کہ ایسا ہو، اور فی الواقع ایسا ہی ہے۔

(۳) جب تمام اقتدار ایک ہی فرمانروا کے ہاتھ میں ہے اور اقتدار میں کسی کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں ہے تو لا محالہ الوہیت بھی بالکلیہ اُسی فرمانروا کے لیے خاص ہے اور اس میں بھی کوئی حصہ دار نہیں ہے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں کہ تمہاری فریاد رسی کر سکے، دعائیں قبول کر سکے، پناہ دے سکے، حامی و ناصر اور ولی و کارساز بن سکے، نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ لہذا الٰہ کا جو مفہوم بھی تمہارے ذہن میں ہے اسکے لحاظ سے کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کوئی اس معنی میں بھی الٰہ نہیں کہ فرمانروائے کائنات کے ہاں مقرب بارگاہ ہونے کی حیثیت ہی سے اس کا کچھ زور چلتا ہو اور اسکی سفارش مانی جاتی ہو۔ اُسکے انتظام سلطنت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، کوئی اسکے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا، اور سفارش قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اسی کے اختیار میں ہے، کوئی زور کسی کے پاس نہیں ہے کہ اُسکے بل پر وہ اپنی سفارش قبول کرا سکے۔

(۴) اقتدار اعلیٰ کی واحدانیت کا اقتضا یہ ہے کہ حاکمیت و فرمانروائی کی جتنی قسمیں ہیں سب ایک ہی مقتدر اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہوں اور حاکمیت کا کوئی جزو بھی کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو۔ جب خالق وہ ہے اور خلق میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب رازق وہ ہے اور رزق رسانی میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب پورے نظام کائنات کا مدبر و منتظم وہ ہے اور تدبیر و انتظام میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، تو یقیناً حاکم اور آمر اور شارع بھی اسی کو ہونا چاہیے اور اقتدار کی اس شق میں بھی کسی کے شریک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح اسکی سلطنت کے دائرے میں اُسکے سوا کسی دوسرے کا فریاد رس اور حاجت روا اور پناہ دھندہ ہونا غلط ہے اُسی طرح کسی دوسرے کا مستقل بالذات حاکم اور خود مختار فرمانروا اور آزاد قانون ساز ہونا بھی غلط ہے۔ تخلیق اور رزق رسانی، احیاء اور اماتت، تسخیر شمس و قمر اور تکویر لیل و نہار قضاء اور قدر، حکم اور بادشاہی، امر اور تشریع سب ایک ہی کلی اقتدار و حاکمیت کے مختلف پہلو

ہیں اور یہ اقتدار و حاکمیت ناقابل تقسیم ہے - اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھتا ہے تو وہ ویسا ہی شرک کرتا ہے جیسا ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے - اور اگر کوئی شخص سیاسی معنی میں مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، تو اسکا یہ دعویٰ بالکل اسی طرح خدائی کا دعویٰ ہے جس طرح فوق الطبیعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ میں تمہارا ولی و کارساز اور مددگار و محافظ ہوں - اسی لیے جہاں خلق اور تقدیر اشیاء اور تدبیر کائنات میں اللہ کے لاشریک ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہیں لہ الحکم اور لہ الملک اور لم یکن لہ شریک فی الملک بھی کہا گیا ہے جو اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ الوہیت کے مفہوم میں بادشاہی و حکمرانی کا مفہوم بھی شامل ہے اور توحید الٰہ کے لیے لازم ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے بھی اللہ کے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کی جائے اس کو اور زیادہ کھول کر حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ (آل عمران - ۳)	کہو یا اللہ تو جو ملک کا مالک ہے، تجھے اختیار ہے جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے -
فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ (المومنون - ۶)	پس بالا و برتر ہے اللہ جو حقیقی بادشاہ ہے، اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ عرش بزرگ کا مالک ہے -
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ (الناس)	کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب سے، انسانوں کے بادشاہ سے، انسانوں کے الٰہ سے -

اور اس سے زیادہ تصریح سورۂ مومن میں ہے جہاں فرمایا:

یَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ، لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ؟ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (رکوع ۲-۲)

یعنی جس روز سب لوگ بے نقاب ہونگے، کسی کا کوئی راز اللہ سے چھپا نہ ہوگا، اس وقت پکارا جائیگا کہ آج بادشاہی کس کی ہے؟ اور جواب اسکے سوا کچھ نہ ہوگا کہ اس اکیلے اللہ کی جس کا اقتدار سب پر غالب ہے۔ اس آیت کی بہترین تفسیر وہ حدیث ہے جو امام احمد نے حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا انہ تعالیٰ یطوی السمٰوات والارض بیدہ ثم یقول انا الملك انا الجبار انا المتکبر، این ملوك الارض؟ این الجبارون؟ این المتکبرون؟ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو اپنی مٹھی میں لیکر پکاریگا میں ہوں بادشاہ، میں ہوں جبار، میں ہوں متکبر، کہاں ہیں وہ جو زمین میں بادشاہ بنتے تھے؟ کہاں ہیں جبار؟ کہاں ہیں متکبر؟۔ عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ جس وقت حضور خطبہ میں یہ الفاظ فرما رہے تھے اس وقت آپ پر ایسا لرزہ طاری تھا کہ ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں آپ منبر سے گر نہ پڑیں۔

(باقی)

لکھنؤ میں ہماری ایجنسی

لکھنؤ میں ہم نے اپنی ایجنسی قائم کر دی ہے جہاں سے رسالہ ترجمان القرآن اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تالیفات ہر وقت مل سکتی ہیں۔ ضرورت مند حضرات ذیل کے پتہ سے دریافت فرمائیں۔

احترام اینڈ سنز۔ جنرل مرچنٹس۔ امین آباد۔ لکھنؤ

معراج کی رات

[یہ وہ تقریر ہے جو ۲۰ اگست کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے یہاں نقل کی جاتی ہے]

عام روایت کے مطابق آج کی رات معراج کی رات ہے۔ یہ معراج کا واقعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سب سے زیادہ مشہور واقعات میں سے ہے۔ لیکن یہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر انسانوں کی نہیں اس پر چڑھ گئی ہیں۔ عام لوگ عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ انکی عجائب پسندی کے جذبہ کو بس اپنی تسکین کا سامان چاہیے۔ اسلیے معراج کی اصل روح اور اسکی غرض اور اسکے فائدوں اور نتیجوں کو تو انہوں نے نظر انداز کر دیا اور ساری گفتگو اس پر ہونے لگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جسم کے ساتھ آسمان پر گئے تھے یا صرف روح گئی تھی، براق کیا تھا، جنت اور دوزخ کا حال آپ نے کیا دیکھا اور فرشتے کس شکل کے تھے۔ حالانکہ دراصل یہ واقعہ تاریخ انسانی کے ان بڑے واقعات میں سے ہے جنہوں نے زمانہ کی رفتار کو بدلا اور تاریخ پر اپنا مستقل اثر چھوڑا ہے۔ اور اسکی حقیقی اہمیت کیفیت معراج میں نہیں بلکہ مقصد اور نتیجہ معراج میں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ کرۂ زمین جس پر ہم آپ رہتے ہیں خدا کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہے۔ اس صوبہ میں خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھیجے گئے ہیں انکی حیثیت کچھ اس طرح کی سمجھ لیجیے جیسے دنیا کی حکومتیں اپنے ماتحت ملکوں میں گورنر یا وائسرائے بھیجا کرتی

ہیں - ایک لحاظ سے دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے - دنیوی حکومتوں کے گورنر اور وائسرائے محض انتظام ملکی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں - اور سلطان کائنات کے گورنر اور وائسرائے اس لیے مقرر ہوتے ہیں کہ انسان کو صحیح تہذیب، پاکیزہ اخلاق، اور سچے علم و عمل کے وہ اصول بتائیں جو روشنی کے مینارے کی طرح انسانی زندگی کی شاہراہ پر کھڑے ہوئے صدیوں تک سیدھا راستہ دکھاتے رہیں - مگر اس فرق کے باوجود دونوں میں ایک طرح کی مشابہت بھی ہے - دنیا کی حکومتیں گورنری جیسے ذمہ داری کے منصب انہی لوگوں کو دیتی ہیں جو انکے سب سے زیادہ قابل اعتماد آدمی ہوتے ہیں، اور جب وہ انہیں اس عہدے پر مقرر کر دیتی ہیں تو پھر انہیں یہ دیکھنے اور سمجھنے کا پورا موقع دیتی ہیں کہ حکومت کا اندرونی نظام کس طرح کس پالیسی پر چل رہا ہے، اور ان کے سامنے اپنے وہ راز بے نقاب کر دیتی ہیں جو عام رعایا پر ظاہر نہیں کیے جاتے - ایسا ہی حال خدا کی سلطنت کا بھی ہے - وہاں بھی پیغمبری جیسے ذمہ داری کے منصب پر وہی لوگ مقرر ہوئے ہیں جو سب سے زیادہ قابل اعتماد تھے، اور جب انہیں اس منصب پر مقرر کر دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے خود انکو اپنی سلطنت کے اندرونی نظام کا مشاہدہ کرایا اور ان پر کائنات کے وہ اسرار ظاہر کیے جو عام انسانوں پر ظاہر نہیں کیے جاتے -

مثال کے طور پر حضرت ابراہیم کو آسمان اور زمین کے ملکوت، یعنی اندرونی انتظام کا مشاہدہ کرایا گیا[1] اور یہ بھی آنکھوں سے دکھا دیا گیا کہ خدا کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے[2] - حضرت موسیٰ کو طور پر جلوۂ ربانی دکھایا گیا اور ایک خاص بندے کے ساتھ کچھ مدت تک پھرایا گیا تاکہ اللہ کی مشیت کے تحت دنیا کا انتظام جس طرح ہوتا ہے اسکو دیکھیں اور سمجھیں[3] - ایسے ہی کچھ تجربات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] وکذالک نری ابراھیم ملکوت السمٰوات والارض (انعام - ۸)

[2] واذ قال ابراھیم رب ارنی کیف تحی الموتیٰ (بقرہ - ۳۵)

[3] فوجدا عبدًا من عبادنا اٰتینٰہ رحمۃ من عندنا وعلمنٰہ من لدنا علما (کہف ۹ - ۱۰)

کے بھی تھے۔ کبھی آپ خدا کے مقرب فرشتے کو افق پر علانیہ دیکھتے ہیں[1]، کبھی وہ فرشتہ آپ سے قریب ہوتے ہوتے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ آپ کے اور اسکے درمیان دو کمانوں کے بقدر بلکہ اس سے بھی کچھ کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔ کبھی وہی فرشتہ آپکو سدرۃ المنتہیٰ، یعنی عالم مادّی کی آخری سرحد پر ملتا ہے اور وہاں آپ خدا کی عظیم الشان نشانیاں دیکھتے ہیں[2]۔

اسی نوعیت کے تجربات میں سے ایک وہ چیز ہے جس کو معراج کہتے ہیں۔ معراج صرف سیر اور مشاہدہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایسے موقع پر ہوتی ہے جبکہ پیغمبر کو کسی کار خاص پر مقرر کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے اور اہم ہدایات دی جاتی ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ کی معراج ہی تھی جبکہ انکو وادیٔ سینا میں بلا کر احکام عشر (Ten Commandments) دیے گئے اور انکو حکم دیا گیا کہ مصر جا کر فرعون کو منشاء خداوندی کے مطابق نظام حکومت میں اصلاح کرنے کی دعوت دو۔ اسی طرح وہ حضرت عیسیٰ کی معراج تھی جب انھوں نے ساری رات پہاڑ پر گذاری اور پھر اٹھ کر بارہ رسول مقرر کیے اور وہ وعظ کہا جو پہاڑی کے وعظ کے نام سے مشہور ہے۔ ایسا ہی ایک اہم موقع وہ تھا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو طلب کیا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب آپ کو اپنے مشن کی تبلیغ کرتے ہوئے تقریباً بارہ سال گذر چکے تھے، حجاز کے اکثر قبائل میں، اور قریب کے ملک حبش میں آپ کی آواز پہنچ چکی تھی، اور آپکی تحریک ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں قدم رکھنے کو تھی۔ دوسرے مرحلہ سے میری مراد یہ ہے کہ اب وقت آگیا تھا کہ آپ مکہ کی ناموافق سرزمین کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف منتقل ہو جائیں جہاں آپ کی کامیابی کے لیے زمین تیار تھی۔ اس دوسرے مرحلہ میں آپکا مشن بہت پھیلنے والا تھا۔ صرف حجاز اور صرف عرب ہی

[1] ولقد رآہ بالافق المبین (التکویر)

[2] وھو بالافق الاعلیٰ ..... الیٰ قولہ لقد رأیٰ من آیات ربہ الکبریٰ (النجم - ۱)

نہیں بلکہ گرد و پیش کی دوسری قوموں سے بھی سابقہ پیش آتا تھا، اور اسلام کی تحریک ایک اسٹیٹ میں تبدیل ہونے کو تھی، اسلیے اس اہم موقع پر آپ کو ایک نیا پروانۂ تقرر اور نئی ہدایات دینے کے لیے بادشاہ کائنات نے اپنے حضور میں طلب فرمایا۔

اسی پیشی و حضوری کا نام معراج ہے۔ عالم بالا کا یہ حیرت انگیز سفر ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس سفر کے ضمنی واقعات احادیث میں آئے ہیں، مثلاً بیت المقدس پہنچ کر نماز ادا کرنا، آسمان کے مختلف طبقات سے گذرنا، پچھلے زمانہ کے پیغمبروں سے ملنا اور پھر آخری منزل پر پہنچنا۔ لیکن قرآن ضمنی چیزوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اصل مقصد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے اس لیے اس نے کیفیت معراج کا کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ وہ چیز تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے جس کے لیے آنحضرت کو بلایا گیا تھا۔ قرآن کی سترھویں سورت میں آپکو یہ تفصیل مل سکتی ہے۔ اسکے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں مکہ کے لوگوں کو آخری نوٹس دیا گیا کہ اگر تمہاری سختیوں کی وجہ سے خدا کا پیغمبر جلاوطنی پر مجبور ہوا تو مکہ میں تم کو چند سال سے زیادہ رہنے کا موقع نہ مل سکے گا[1]۔ اور بنی اسرائیل کو، جن سے عنقریب مدینہ میں پیغمبر سے براہ راست سابقہ پیش آنا تھا، خبردار کیا گیا کہ تم اپنی تاریخ میں دو زبردست ٹھوکریں کھا چکے ہو اور دو قیمتی موقعے کھو چکے ہو، اب تم کو تیسرا موقع ملنے والا ہے اور یہ آخری موقع ہے[2]۔

دوسرے حصہ میں وہ بنیادی اصول بتائے گئے جن پر انسانی تمدن و اخلاق کی تعمیر ہونی چاہیے۔ یہ ۱۴ اصول ہیں[3]:

---

[1] وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منھا واذا لا یلبثون خلفک الا قلیلا (بنی اسرائیل ۸)

[2] وقضینا الی بنی اسرائیل .... الی قولہ عسی ربکم ان یرحمکم (بنی اسرائیل - ۱)

[3] سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۳-۴

(۱) صرف اللہ کی بندگی کی جائے اور اقتدار اعلیٰ میں اسکے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کیجائے۔

(۲) تمدن میں خاندان کی اہمیت ملحوظ رکھی جائے، اولاد والدین کی فرمانبردار و خدمت گذار ہو اور رشتہ دار ایک دوسرے کے ہمدرد و مددگار ہوں۔

(۳) سوسائیٹی میں جو لوگ غریب یا معذور ہوں یا اپنے وطن سے باہر مدد کے محتاج ہوں وہ بے وسیلہ نہ چھوڑ دیئے جائیں۔

(۴) دولت کو فضول ضائع نہ کیا جائے جو مالدار اپنے روپے کو برے طریقہ سے خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

(۵) لوگ اپنے خرچ کو اعتدال پر رکھیں، نہ بخل کرکے دولت کو روکیں اور نہ فضول خرچی کرکے اپنے لیے اور دوسرے کے لیے مشکلات پیدا کریں۔

(۶) رزق کی تقسیم کا قدرتی انتظام جو خدا نے کیا ہے انسان اُس میں اپنے مصنوعی طریقوں سے خلل نہ ڈالے، خدا اپنے انتظام کی مصلحتوں کو زیادہ بہتر جانتا ہے۔

(۷) معاشی مشکلات کے خوف سے لوگ اپنی نسل کی افزائش نہ روکیں۔ جس طرح موجودہ نسلوں کے رزق کا انتظام خدا نے کیا ہے آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہی انتظام کریگا۔

(۸) خواہش نفس کو پورا کرنے کے لیے زنا کا راستہ برا راستہ ہے لہذا نہ صرف زنا سے پرہیز کیا جائے بلکہ اسکے قریب جانے والے اسباب کا دروازہ بھی بند ہونا چاہیے۔

(۹) انسانی جان کی حرمت خدا نے قائم کی ہے لہذا خدا کے مقرر کردہ قانون کے سوا کسی دوسری بنیاد پر آدمی کا خون نہ بہایا جائے، نہ کوئی اپنی جان دے، نہ دوسرے کی جان لے۔

(۱۰) یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے، جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

(۱۱) عہد و پیمان کو پورا کیا جائے، انسان اپنے معاہدات کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

(۱۲) تجارتی معاملات میں ناپ تول ٹھیک ٹھیک راستی پر ہونی چاہیے، اوزان اور پیمانے صحیح رکھے جائیں۔

(۱۳) جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو، وہم اور گمان پر نہ چلو، کیونکہ آدمی کو اپنی تمام قوتوں کے متعلق خدا کے سامنے جواب دہی کرنی ہے کہ اس نے انہیں کس طرح استعمال کیا۔

(۱۴) نخوت اور تکبر کے ساتھ نہ چلو، غرور کی چال سے نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں سے اونچے ہو سکتے ہو۔

یہ ۱۴ اصول جو معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے تھے، انکی حیثیت صرف اخلاقی تعلیمات ہی کی نہ تھی، بلکہ یہ وہ پروگرام تھا جس پر آپ کو آئندہ سوسائیٹی کی تعمیر کرنی تھی۔ یہ ہدایات اُس وقت دی گئی تھیں جب آپکی تحریک عنقریب تبلیغ کے مرحلہ سے گذر کر حکومت اور سیاسی اقتدار کے مرحلے میں قدم رکھنے والی تھی، لہذا یہ گویا ایک مینی فسٹو تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ خدا کا پیغمبر ان اصولوں پر تمدن کا نظام قائم کریگا۔ اسی لیے معراج میں یہ ۱۴ نکات مقرر کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے تمام پیروانِ اسلام کے لیے پانچ وقت کی نماز فرض[۱] کی تاکہ جو لوگ اس پروگرام کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے اٹھیں ان میں اخلاقی انضباط پیدا ہو اور وہ خدا سے غافل نہ ہونے پائیں، ہر روز پانچ مرتبہ انکے ذہن میں یہ بات تازہ ہوتی رہے کہ وہ خود مختار نہیں ہیں بلکہ ان کا حاکم اعلیٰ خدا ہے جسکو انہیں اپنے کام کا حساب دینا ہے۔

---

[۱] اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشھودا (بنی اسرائیل - ۹)

بقیہ مضمون صہ ۱۴

تو دراصل وہ خدا کے مقابلہ میں بغاوت کرتا ہے اور علیٰ ہٰذا القیاس جو شخص اس شعبۂ زندگی میں کسی دوسرے کی حاکمیت و آمریت تسلیم کرتا ہے وہ بھی بغاوت ہی کا ارتکاب کرتا ہے۔ مومن کا کام اس بغاوت کو دنیا سے مٹانا اور خدا کی زمین پر خدا کے سوا ہر ایک کی خداوندی ختم کر دینا ہے۔ مومن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جس طرح خدا کا قانونِ تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اسی طرح خدا کا قانون شرعی بھی عالم انسانی میں نافذ ہو۔ مومن کی تمام مساعی کا ہدف مقصود یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا ہر ایک کی بندگی سے نکالے اور صرف خدا کا بندہ بنائے۔ یہ کام فی الاصل تو نصیحت، فہمائش، ترغیب اور تبلیغ ہی سے کرنے کا ہے۔ لیکن جو لوگ ملک خدا کے ناجائز مالک بن بیٹھے ہیں اور خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں وہ عموماً اپنی خداوندی سے محض نصیحتوں کی بنا پر دست بردار نہیں ہو جایا کرتے، اور نہ وہ اس کو گوارا کرتے ہیں کہ عامۃ الناس میں حقیقت کا علم پھیلے، کیونکہ اس سے ان کو خطرہ ہوتا ہے کہ اُن کی خداوندی خود بخود ختم ہو جائے گی، اس لئے مومن کو مجبوراً جنگ کرنی پڑتی ہے تاکہ حکومت الٰہیہ کے قیام میں جو چیز سدِ راہ ہو اسے راستہ سے ہٹا دے۔

نظام جماعت

۳۔ ہر وہ شخص (خواہ وہ عورت ہو یا مرد اور خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ کا باشندہ ہو) جو عقیدۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ کر شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے، وہ جماعت اسلامی کا رکن ہو سکتا ہے۔ اس شہادت کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لئے کوئی شرط نہیں ہے

تشریح: اس جماعت میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آ سکتا۔ اس دائرے

میں آنے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو اور وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا، اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں، اور یہ شہادت اس کے طرز خیال و طرز زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنے کی جرأت کرے صرف وہی جماعت اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سر نو ایمان لائے۔

۴۔ ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات لازماً ایک شخص کو اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:۔

(الف) فرائض کو ان کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے،

(ب) کبائر سے اجتناب کرے اور اگر نادانستہ کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے،

(ج) اگر وہ کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے مثلاً سود، شراب، زنا، رقص و سرود، شہادت زور، رشوت، خیانت، قمار، قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ، تو اس کو ترک کر دے بلا اس لحاظ کے کہ اس کے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو، اور اگر اس کی معاش میں ان وسائل کا کوئی حصہ ہو تو وہ اس حصہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے،

(د) اگر اس کے قبضہ میں ایسا مال (یا جائداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو، یا جس میں حقداروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دست بردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے،

(ہ) اگر وہ کسی ایسی حکومت کا صدر، یا رئیس، یا گورنر، یا وزیر یا جج ہے جو زمین کے کسی حصہ پر حاکمیت (Sovereignty) کی مدعی ہو تو اپنے اس منصب سے دست بردار ہو جائے،

(و) اگر وہ کسی مجلس قانون ساز کا رکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ قانون سازی صرف خدا کا منصب ہے، اور انسان کا قانون ساز بننا خدائی کے دعوے کو متضمن ہے،

(ز) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہو تو اس کو واپس کرے اور اُن وفاداریوں اور نیازمندیوں سے باز آئے جن کی بدولت اس نے خطاب پایا تھا یا جن کو اب خطاب کا فتنہ ہونے کی وجہ سے نباہنا پڑتا ہے۔

یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت میں نہ لیا جائے گا۔ یا لیا جا چکا ہو تو خارج کیا جائے گا۔

۵۔ ادائے شہادت کے بعد بتدریج جو تغیرات ہر شخص کو اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:۔

(الف) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت (غیر اسلام) کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت حاصل ہو جائے،

(ب) تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر، طرز خیال اور عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنا اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا، اور اپنی خودسری و نفس پرستی کے بت کو توڑ کر تابع امر رب بن جانا،

(ج) اُن تمام سوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف ہوں، اور اپنے ظاہر و باطن کو احکام شریعت کے مطابق بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا،

(د) تمام اُن تعصبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو، اور ان مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جن کی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو،

(ہ) فاسقین و فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا،

(و) ان تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جن کا مقصد حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات کے سوا کچھ اور ہو۔ (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و مواد عت کے معاملات کیے جا سکتے ہیں، مگر یہ افراد کا کام نہیں بلکہ جماعت کا کام ہے کوئی مسلمان انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جز نہیں بن سکتا)

(ف) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی، اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا،

(ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیام حکومت الٰہیہ کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی ضروریات زندگی کے سوا اُن تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں،

ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجہ پر ہوں، مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر جماعت اسلامی میں آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

۶۔ جو لوگ غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے میں آلہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں یا غیر الٰہی قانون کے اجرا میں مددگار بنتے ہیں اُن کی تین حیثیتیں ہیں:۔

اگر وہ اپنے اس کام پر خوش اور مطمئن ہیں اور اپنے اس کسب کو حلال و طیب سمجھتے ہیں اور اسی راہ میں ترقی درجات کے متمنی ہیں تو ان کے لئے اس دائرے میں کوئی جگہ نہیں۔

اگر وہ اس نظام کو غلط اور اپنے کسب کو حرام سمجھتے ہیں، مگر اعتراف گناہ کے باوجود اس کو محض ضعف ایمان کی وجہ سے ترک نہیں کر سکتے، تو وہ جماعت اسلامی کے طبقہ سوم میں (جس کی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں۔

اگر وہ محض اس مجبوری سے اس نظام میں منسلک ہیں کہ دُوسرا ذریعہ زندگی نہیں پاتے، اور نیک نیتی کے ساتھ اس بات کے لئے تیار ہوں کہ دُوسرا ذریعہ پاتے ہی اسے ترک کر دیں گے، تو وہ جماعت اسلامی کے درجہ دوم میں (جس کی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں۔

تشریح:۔ یہ واضح رہے کہ غیر الٰہی نظام اطاعت کے ایک جزو اور دوسرے جزو میں کوئی فرق نہیں اس کے جو اجزا بظاہر بالکل معصوم نظر آتے ہیں وہ بھی اسی قدر ناپاک ہیں جس قدر دوسرے غیر معصوم اجزاء

نیز جو غیر الٰہی نظام اطاعت مسلمانوں کی خداوندی میں چل رہا ہے وہ بھی اپنے تمام اجزا سمیت اسی حکم میں ہے۔ مسلمانوں کی خداوندی اس کو ہرگز کوئی سند طہارت عطا نہیں کرتی۔

۷۔ جہاں ایک شخص متذکرۂ صدر طریقہ پر ایمان لائے یا رکھتا ہو، اس کے لئے لازم ہے کہ ایک طرف اپنے حلقہ تعارف میں دوسرے مردوں اور عورتوں کو دعوتِ ایمان دے، اور دوسری طرف اپنی بستی میں ان لوگوں کو تلاش کرے جو اس کی طرح ایمان لائے ہوں۔ پھر جہاں ایسے دو آدمی بھی ملجائیں وہاں وہ عارضی طور پر جماعتی ہیئت بنالیں اور مرکز[1] کو اطلاع دے کر اس سے ہدایت حاصل کریں۔

۸۔ جو لوگ نظامِ جماعت میں شامل ہوں ان کو ان کے حالات کے لحاظ سے ابتداءً تین طبقوں میں تقسیم کیا جائے گا:۔

ایسے اشخاص جو تن من دھن سے جماعت میں شریک ہوں، جو اسلامی نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں ہر قربانی کے لئے تیار ہوں، جو اپنے آپ کو بلا کسی استحفاظ و استثناء کے اس طرح جماعت کے حوالہ کریں کہ جب ان کو پکارا جائے، لبیک کہیں، جو خدمت ان کے سپرد کی جائے انجام دیں، اور جان، مال، اولاد، عزیز، اقارب، دوست غرض کسی چیز کو بھی مقصد اسلامی سے زیادہ عزیز نہ رکھیں، وہ صف اوّل کے لوگ ہوں گے، جماعت کا اصل کارکن و کارفرما عنصر وہی ہوں گے، اور رہنمائی و سربراہ کاری انہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ ان لوگوں کے لئے احکام شرعیہ کی پابندی کے معاملہ میں کوئی رعایت نہ ہوگی۔ ان کو مسلمان کی زندگی کا پورا نمونہ پیش کرنا ہوگا اور ان کے لئے رخصت کے بجائے عزیمت کا طریقہ ہی قانون ہوگا۔ نیز ان کے لئے لازم ہوگا کہ کسی غیر الٰہی عدالت میں مستغیث یا مدعی کی حیثیت سے نہ جائیں، مدعیٰ علیہ یا مستغاث علیہ کی حیثیت سے خاص حالات میں جاسکتے ہیں جبکہ غیر معمولی نقصان کا خطرہ ہو، البتہ سردست گواہ کی حیثیت سے اگر ان کو طلب کیا جائے تو وہ جائیں۔

وہ لوگ جو اپنے آپ کو بالکلیہ وقف کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور نہ خطرات اور قربانیوں کا پورا

[1] دفتر ترجمان القرآن، اپنچھر روڈ، مبارک پارک، لاہور

پورا بار اُٹھا سکتے ہوں، مگر اپنے وقت، اپنے مال اور اپنی قوتوں کا ایک حصہ اپنی ذات کی خدمت سے بچا کر راہ خدا میں دینے کے لیے تیار ہوں وہ طبقہ دوم میں شمار ہوں گے بشرطیکہ اپنی شخصی زندگی کی حد تک احکام دین کی پوری اطاعت کریں، ان وسائل کسب رزق اور مشاغل سے مجتنب رہیں جو براہ راست دین حق کے خلاف ہیں، اور صدق دل سے جماعت اسلامی کے خیر خواہ و وفادار ہوں۔ جماعت کی طرف سے ان کے سپرد وہی خدمات کی جائیں گی جن کو وہ خود بخوشی قبول کریں۔ ذمہ داری کا کوئی منصب ان کے سپرد نہ کیا جائے گا۔ اور جماعتی مشوروں میں وہ شریک ہو سکیں گے۔

جو لوگ کلمۂ اسلام پر اصولی حیثیت سے ایمان لائیں اور شخصی زندگی کی حد تک احکام شرعی کی پابندی بھی قبول کریں، مگر غیر الٰہی نظام سے ان کے جو مفاد وابستہ ہیں، ان کا نقصان گوارا نہ کر سکیں وہ طبقۂ سوم میں داخل ہوں گے اور انکا شمار صرف ہمدردوں میں ہوگا۔ بشرطیکہ وہ دوسری وفاداریوں پر خدا کی وفاداری کو مقدم رکھیں، غیر الٰہی نظام میں ترقی درجات کیلئے کوشاں نہ ہوں، اور جماعت اسلامی کو ہر جائز امکانی طریقہ سے مدد دیں۔ جماعتی مشورہ میں وہ صرف اس حد تک شریک ہو سکتے ہیں جس حد تک جماعت کو ان کے خلوص پر اعتماد ہو۔

تشریح: طبقات کی یہ تقسیم تمام اشخاص کے حق میں دائمی و ابدی نہ ہوگی بلکہ شخصی حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ بدلتی رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی طبقہ سوم کے ایک شخص کی حالت بدل جائے اور وہ طبقۂ اوّل میں آجائے اور علیٰ ہذا القیاس اس کے برعکس۔

عورتوں کی حیثیت

۹۔ جو عورتیں جماعت اسلامی میں داخل ہوں ان پر دفعہ چہارم اور دفعہ پنجم کے تمام اُن اجزاء کا اطلاق ہوگا جو مخصوص طور پر مردوں سے متعلق نہیں ہیں، یعنی جو تمام اہل ایمان کے لئے عمومی نوعیت رکھتے ہیں۔

۱۰۔ رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے عورتوں کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

(الف) اپنے خاندان اور اپنے حلقۂ تعارف میں دوسری عورتوں کو تجدید ایمان یا قبول ایمان کی دعوت دیں۔

(ب) اپنے شوہروں، بھائیوں اور خاندان کے دوسرے مردوں پر دین کی تبلیغ کریں۔

(ج) اپنے بچوں کے دلوں میں نورِ ایمان اور اخلاق اسلامی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

(د) اگر ان کے شوہر یا بیٹے یا باپ اور بھائی جماعت اسلامی میں داخل ہوں تو اپنی صابرانہ رفاقت سے اُن کی ہمت افزائی کریں اور جماعت کے نصب العین کی خدمت میں حتی الامکان ان کا ہاتھ بٹائیں اور نزول مصائب کی صورت میں صبر و ثبات سے کام لیں۔

(ہ) اگر ان کے شوہر یا اولیاء جاہلیت میں مبتلا ہوں، حرام کماتے ہوں، یا معاصی کا ارتکاب کرتے ہوں تو صبر کے ساتھ ان کی اصلاح کے لئے ساعی رہیں، اُن کی حرام کمائی سے اور ان کی ضلالتوں سے محفوظ رہنے کی انتہائی کوشش کریں، اور ان کے ایسے احکام کو ماننے سے انکار کر دیں، جو معصیت خدا و رسول کے مترادف ہوں بلا اس لحاظ کے کہ اُن کی حکم عدولی کے نتائج کتنے ہی بُرے ہوں۔

امارت

۱۰۔ اس جماعت کا ایک امیر ہوگا جس کی حیثیت "امیر المومنین" (باصطلاح معروف) کی نہ ہوگی بلکہ صرف اس جماعت کے رہنما کی ہوگی۔ اس کی اطاعت فی المعروف جماعت کے کل افراد اپنے امیر (باصطلاح شرعی) کی حیثیت سے کریں گے۔ امیر کے انتخاب میں تقویٰ، علم دین میں بصیرت، اصابت رائے، اور عزم و حزم کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ جماعت کی دعوت اپنے عقیدہ اور نصب العین کی طرف ہوگی نہ کہ اپنے امیر کی شخصیت اور اس کی امارت کی طرف۔ جماعت کی نظر میں انتخاب کے وقت جو شخص بھی مذکورۂ بالا اوصاف کے لحاظ سے اہل تر ہوگا اس کو وہ اس منصب کے لئے منتخب کرے گی۔

امیر کی خدا ترسی و احساس ذمہ داری سے یہ توقع کی جائے گی کہ اپنے سے زیادہ اہل آدمی کے آجانے پر وہ خود اس کے لئے جگہ خالی کر دے گا۔ نیز ایسی صورت میں جبکہ جماعت اپنے نصب العین کے مفاد کے لئے ضرورت محسوس کرے، وہ امیر کو معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

ابتدائی لائحہ عمل

(۱۱) جماعت کا ابتدائی پروگرام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک طرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں، اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہوں (خواہ وہ قومی مسلمان ہوں یا غیر مسلم) ان کو بالعموم حاکمیت غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیت رب العالمین کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں۔ اس دعوت کی راہ میں جب تک کوئی قوت حائل نہ ہو، ان کو بھی چھیڑ چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی قوت حائل ہو، خواہ وہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنی ہوگی اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔

بعد کے مراحل کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسے حالات پیش آئیں گے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائے گا۔ البتہ لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک مضبوط جمے ہوئے اور زمین پر چھائے ہوئے دین (نظام اطاعت غیر اللہ) کو اکھاڑ کر دوسرے دین (نظام اطاعت الٰہی) کو قائم کرنا بہر حال آسان کام نہیں ہے۔ اس میں جان، مال اور ہر چیز کا زیاں ہے۔ لہٰذا وہی لوگ آگے بڑھیں جو تمام فائدوں اور آسائشوں کی قربانی اور تمام نقصانات کی برداشت کے لئے تیار ہوں۔

چند نایاب اسلامی کتب اور ان کی قیمتوں میں حیرت انگیز رعایت

(۱) تفسیر القرآن مکمل ۸ جلدوں میں (اردو) اصلی قیمت اکیس روپے رعایتی قیمت دس روپے

(۲) جواہر قرآنی (اردو) مصنفہ علامہ شیخ طنطاوی جوہری مصری اصلی قیمت ایک روپیہ رعایتی دس آنے۔

(۳) سیرت رسول (اردو) سیرت النبی معروف بہ سیرت ابن ہشام کا اردو ترجمہ رعایتی قیمت مکمل سٹ ایک روپیہ چار آنے

(۴) تاریخ اسلام (اردو) مصنفہ رائٹ آنریبل سید امیر علی رعایتی قیمت دو روپے۔

(۵) کلید خزائن قرآنی۔ کسی آیت کا ایک لفظ یا کلمہ یاد ہو تو اس کی مدد سے پوری آیت معہ نشان سورہ و تعداد آیت مل جاتا ہے۔ رعایتی قیمت چار روپے۔

محصول ڈاک ہر کتاب کا بذمہ خریدار ہوگا۔ مکمل فہرست کتب مفت طلب کریں۔

مینیجر "ایشیا" ڈاک خانہ وطن۔ لاہور

فہرست مضامین

ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ، جمادی الآخرہ ۱۳۶۰ھ مطابق جون، جولائی، اگست ۱۹۴۱ء جلد ۱۰ عدد ۴، ۵، ۶

اشارات	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۲۵۰
مقالات:-		
حقوق الزوجین	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۲۶۴
تدوین حدیث	مولانا مناظر احسن گیلانی	۳۷۶
جماعتِ اسلامی کا پہلا اجتماع	قمرالدین خاں ناظم شعبۂ تنظیم	۴۵۹

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ میں طبع ہو کر
دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ۔ مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جماعت اسلامی کی تشکیل کا استقبال مختلف حلقوں میں مختلف طور پر ہوا ہے۔ کچھ اللہ کے بندے تو ایسے ملتے ہیں جو اس چیز سے واقف ہوتے ہی اسے اس طرح قبول کرتے ہیں گویا کہ وہ پہلے ہی سے اس کے طالب تھے۔ کچھ دوسرے لوگ اس پر غور کرتے ہیں اور مختلف قسم کے شبہات پیش کر کے مزید توضیح چاہتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں کے دل نے گواہی دی ہے کہ مخالفت کے لائق اگر کوئی چیز ہو تو یہی ہے۔ اور ایک گروہ کثیر تربص و انتظار کی روش کو ترجیح دے رہا ہے۔ یہ سب مختلف قسم کے استقبال خلاف توقع نہیں ہیں، پہلے ہی ان کا اندازہ تھا۔ البتہ جو چیز ہمارے اندازے سے بڑھ کر نکلی وہ لبیک کہنے والوں کی تعداد اور ان کی کیفیت ہے۔ ہندوستان کے اس قبرستان میں مشکل ہی سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ اس طرز کے ایک نظام کو قبول کرنے اور اس پر کام کرنے کیلئے ڈیڑھ سو سے زیادہ آدمی ابتدا ہی میں اٹھ کھڑے ہونگے، اور یہ بات اور بھی کم متوقع تھی کہ اس چیز پر لبیک کہنے والے زیادہ تر وہ لوگ ہونگے جو روح و ضمیر کی ان قتل گاہوں سے سند موت لے کر نکلے تھے جن کو کالج اور یونیورسٹی کہتے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ بات بہت امید افزا ہے کہ جن لوگوں نے پیش قدمی کی ہے ان میں سے اکثر کے طرز اقدام سے کافی حزم و احتیاط اور احساس ذمہ داری کا اظہار ہو رہا ہے۔ وہ اس تحریک اور دوسری تحریکوں کے فرق کو سمجھتے ہوئے آئے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ وہ کھیل کے میدان میں نہیں اتر رہے ہیں بلکہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھ رہے ہیں۔ اسلئے وہ وضع احتیاط کے ساتھ اپنے نفس کا امتحان کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں کہ جو قدم بھی خدا کی راہ میں اٹھے پھر پیچھے نہ پڑے، وذالك فضل الله يوتيه من يشاء۔

راہ کے ساتھیوں سے تو آئندہ بہت کچھ کہنا ہے۔ بلکہ اب وہ تو باتیں انہی سے ہونگی۔ لہٰذا آجکی صحبت میں ان سے کوئی خطاب نہ ہوگا۔

مخالفت کرنے والے اصحاب سے ہم کو صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ہمارا دستور جماعت اور ہمارے اجتماعِ اول کی روداد، دونوں آپ کے سامنے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے انانیت اور ذاتی شکایات اور جماعتی تعصبات سے ذہن کو خالی کر کے انصاف کے ساتھ ان کو پڑھئے اور اپنے دل سے پوچھیے کہ اگر اصل اسلامی تحریک اور اصل اسلامی نظامِ جماعت کی تجدید کبھی کی جائے تو اس کی عملی صورت آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جو یہاں اختیار کی گئی ہے؟ اگر کوئی دوسری صورت آپ کے نزدیک زیادہ اوفق بالکتاب والسنہ ہو تو براہ کرم اسے پیش فرمائیے، آپ ہمارے دل کو قبولِ حق کے لئے کھلا ہوا پائیں گے۔ اور اگر آپ کا دل گواہی دے کہ فی الواقع اس کام کے لئے زیادہ سے زیادہ صحیح طریقہ یہی ہو سکتا تھا جو اختیار کیا گیا ہے تو پھر اس کی مخالفت کرنے سے پہلے ایک مرتبہ اچھی طرح سوچ لیجیے کہ خدا کی عدالت میں جو باز پرس ہو گی اس کا آپ کیا جواب دیں گے۔ ہاں، یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص تحریکِ اسلامی کی تجدید اور نظامِ جماعتِ اسلامی کے احیا ہی کو سرے سے غیر ضروری سمجھتا ہو۔ ایسے لوگ ہمارے نزدیک کسی التفات کے مستحق نہیں ہیں اور نہ انکی مخالفت کو ہم کوئی وزن دینے کے لئے تیار ہیں۔

رہے مسترسلین تو ان سے ہمیں ابھی کچھ کہنا نہیں ہے۔ جو لوگ گاڑی کو چلتے دیکھ کر ہی اس پر سوار ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ نہ انکو بلانے کا یہ وقت ہے اور نہ انکے آنے ہی کا وقت یہ ہے۔ اس وقت تو ضرورت ان کی ہے جو گاڑی بنانے اور پھر اس کے چلانے میں حصہ لینے کو تیار ہوں۔ جب گاڑی چلے گی تو چلتی گاڑی پر بیٹھنے والے خود آنے لگیں گے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ فی الحال وہ بھی انتظار کریں اور ہم بھی۔

اب صرف رہ جاتے ہیں وہ لوگ جو ہمارے دستور یا ہمارے طریق کار کے متعلق کچھ شبہات رکھتے ہیں اور توضیح کے طالب ہیں۔ آج ہمیں انہی سے کچھ عرض کرنا ہے اور ہماری غرض صرف یہ ہے کہ اس راہ پر آنے میں اگر لوگوں کے لئے کچھ ذہنی رکاوٹیں ہیں تو انہیں دور کیا جائے

شبہات پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات صاف کر دینی ضروری ہے۔ شبہات پیش کرنے کی ایک غرض تو یہ ہوا کرتی ہے کہ آدمی دل میں تو ایک چیز کے حق ہونے کا معترف ہو جاتا ہے مگر اس کو قبول کرنے اور اس کے لئے کچھ کام کرنے کی تکلیف سے بچنا چاہتا ہے، اسلئے چند شبہات اس ارادہ کے ساتھ سامنے لا کر رکھ دیتا ہے کہ ان کو کسی طرح رفع ہونے نہیں دینا ہے تا کہ حق کو قبول نہ

کرنے کیلئے ایک مستقل حیلہ موجود ہے۔ اور دوسری غرض یہ ہوتی ہے کہ آدمی فی الواقع قبول حق اور تائید حق کے لئے تیار ہوتا ہے بشرطیکہ اسکے شبہات رفع کر دیئے جائیں اور اسے مطمئن کر دیا جائے کہ یہ چیز واقعی حق ہے۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے ان بھائیوں کے شبہات دوسری نوعیت کے ہوں۔ اسی امید پر ہم ان کو جواب بھی دے رہے ہیں لیکن اگر کسی کے شبہات پہلی قسم کے ہوں تو اسکو خدا کی پناہ مانگنی چاہئے کہ یہ ایک بیماری ہے جو انسان کے ضمیر کو تدریج مسموم کرتے کرتے بالآخر حق برابر جان بھی ایمان باقی نہیں چھوڑتی۔

ایک صاحب نے دستور کی دفعہ سوم اور اسکی تشریح پر یہ اعتراض کیا ہے کہ شرعاً تو جماعت اسلامی میں شامل ہونے کیلئے صرف اقرار باللسان کافی ہے، تم نے اسکے ساتھ "سمجھ کر شہادت دینے" کی شرط کا اضافہ کہاں سے کر دیا؟ حالانکہ یہ چیز تکمیل کے درجہ میں مطلوب ہو تو ہو مگر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کیلئے شرط نہیں ہے۔ کیا کوئی شخص جو تمہارے سامنے توحید و رسالت کا زبانی اقرار کرے، اُس کو تم مسلمان تسلیم کرنے سے انکار کر دو گے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسکو جو حقوق حاصل ہوتے ہیں انہیں اس وقت تک روکے رکھو گے جب تک کہ اسکے ایمان کی تحقیق نہ کر لو؟ اور آخر تمہارے پاس ایمان کی تحقیق کرنے کے ذرائع کیا ہیں؟ کس طرح تم معلوم کرو گے کہ ایک شخص مجرد زبانی اقرار نہیں کر رہا ہے بلکہ فی الواقع ایمان لایا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اقرار لسانی بجائے خود دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا پروانہ نہیں ہے بلکہ اس کا جو کچھ بھی اعتبار ہے، اس حیثیت سے ہے کہ زبان آدمی کے مافی الضمیر کی ترجمان ہوتی ہے، اور جو شخص زبان سے کسی بات کا اقرار کرتا ہے اس کے متعلق ابتداءً یہی گمان کیا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہی اس کی مراد بھی ہے۔ ورنہ اصل مقصود عقیدہ، ایمان، تصدیق قلبی ہے نہ کہ مجرد زبانی اقرار۔ قرآن کو اوّل سے آخر تک دیکھ جائیے، ہر جگہ مطالبہ ایمان و اعتقاد کا ہے نہ کہ محض اقرار لسانی کا۔ جتنے دنیوی و اخروی نتائج ہیں، سب کے سب ایمان پر مترتب ہوتے ہیں نہ کہ زبانی دعوے پر۔ تکمیل مدارج کا کیا سوال ہے، ہدایت کا دروازہ آدمی پر کھلتا ہی ایمان کے ذریعہ سے ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ ..... وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ، أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ اگر کسی اقرار لسانی کی تہ میں تصدیق

قلبی نہ ہو تو اس کا صحیح شرعی نام "نفاق" ہے نہ کہ "اسلام"۔ اس پر لفظ اسلام کا اطلاق جہاں کہیں کیا گیا ہے۔ اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ لغوی معنی میں کیا گیا ہے۔

رہا قانونی حقوق کا سوال تو اقرار لسانی پر یہ حقوق اس وجہ سے حاصل نہیں ہوتے کہ کلمۂ طیبہ کے الفاظ کا مجرد تلفظ ان حقوق کا استحقاق پیدا کرتا ہے، بلکہ وہ اس لئے حاصل ہوتے ہیں کہ جو شخص زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرتا ہے اس کے متعلق بادی النظر میں یہ گمان کرنے کی کافی وجہ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقت میں اُس چیز پر ایمان لایا ہے جس کا وہ اقرار کر رہا ہے۔ تاوقتیکہ اُس کا اقرار جھوٹا ثابت نہ ہو جائے اسے مسلمان ہی سمجھ کر معاملہ کیا جائیگا۔ لیکن جب تحقیق ہو جائے کہ اس کا اقرار جھوٹا تھا تو وہ اُن حقوق سے محروم ہو جائے گا جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسکو حاصل ہوئے تھے، الّا یہ کہ مصالح دینی کی بنا پر اسے بعض حقوق سے متمتع ہونے کا موقع دے دیا جائے، جیسا کہ منافقین کے ساتھ کیا گیا۔ اس باب میں قرآن مجید کی یہ آیت صاف رہنمائی کرتی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم اللہ کی راہ میں جہاد
فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ	کے لئے نکلو تو تحقیق کرو اور کسی ایسے شخص کو جو تمہیں سلام کرے
أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (النساء ۱۳)	نہ کہدیا کرو کہ تو مومن نہیں ہے

آیت کی شان نزول یہ ہے کہ مسلمان جب جنگ کے لئے نکلتے تھے تو لڑائیوں کے موقع پر دشمن کے گروہ کا کوئی شخص اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرنے کے لئے السلام علیکم کہدیتا تھا، یا اور کوئی ایسی بات کہتا تھا جو علامتِ اسلام ہو سکتی تھی۔ بعض مواقع پر ایسا ہوا کہ مسلمانوں نے اس طرح کے اظہارِ اسلام کو محض جان بچانے کا بہانہ قرار دے کر ایسے لوگوں کو قتل کر دیا۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جو شخص تم پر اپنے اسلام کا اظہار کرے اسکے قول کو سرسری طور پر رد کر دینا صحیح نہیں ہے، تمہیں تحقیق کرنی چاہیئے کہ آیا واقعی وہ اسلام ہی لایا ہے یا محض جان بچانے

کیلئے بہانہ کر رہا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو عصمتِ جان و مال (جو تمام حقوق میں اولین حق ہے) اقرارِ لسانی پر صرف اسلئے حاصل ہوئی کہ ان کا زبانی اقرار حقیقی اسلام کی توقع قائم کرنے کے لئے جائز بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عصمت کا بقا اس امر پر موقوف تھا کہ اس اقرار کی تہ میں حقیقی اسلام کا سراغ ملے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان ناقابلِ تحقیق و تبیین چیز نہیں ہے جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح آیت وہ ہے جو سورۂ ممتحنہ میں نازل ہوئی ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ، اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ - فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ - لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ (رکوع ۲)	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جب ایمان لانے والی عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان کا امتحان لو۔ ان کے ایمان کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن تم کو امتحان کے بعد) اگر معلوم ہو جائے کہ وہ مومن عورتیں ہیں تو پھر اُن کو کفار کے پاس واپس نہ بھیجو۔ وہ کفار کے لئے حلال نہیں ہیں اور نہ کفار اُن کے لئے حلال ہیں۔

یہ آیت اُن عورتوں کے بارے میں آئی تھی جو اپنے کافر شوہروں کو دارالکفر میں چھوڑ کر دارالاسلام پہنچ جاتی تھیں اور اپنا مسلمان ہونا ظاہر کر کے مسلمانوں کے پاس رہنا چاہتی تھیں۔ اُن کے حق میں ارشاد ہوا کہ اُن کا امتحان لو۔ اگرچہ دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے اندر حقیقت میں ایمان ہے یا نہیں۔ لیکن تم کو امتحان لے کر اپنا اطمینان کر لینا چاہئے کہ یا واقعی انہوں نے اسلام اور کفر کے درمیان تمیز کر کے اسلام کو اختیار کیا ہے یا کسی اور وجہ سے اظہارِ اسلام کر رہی ہیں بغیر اس کے کہ وہ اس پر ایمان لائی ہوں۔ اگر تحقیق سے معلوم ہو جائے کہ حقیقت میں وہ ایمان لائی ہیں تب تو ان کو کافر شوہروں کے پاس واپس نہ کرو، کیونکہ اِس صورت میں وہ ان کے لئے حرام ہو چکی ہیں۔ ورنہ انہیں واپس کر دو، اس لئے

کہ غیر حقیقی اظہار اسلام سے ان کی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، اُس کے باوجود وہ کافر شوہروں کے لئے اور کافر شوہر اُن کے لئے بدستور حلال ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجرّد کلمہ گوئی کا نام اسلام نہیں ہے بلکہ کلمہ گوئی کی تہ میں ایمان مطلوب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قانونی حقوق بھی دراصل ایمان ہی پر قائم ہوتے ہیں نہ کہ اظہار اسلام پر (یا یوں سمجھئے کہ اظہار اسلام پر ان حقوق کا قیام حقیقت میں توقع ایمان کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ فی الاصل اِس اظہار پر)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض حالات میں قانونی حقوق اس وقت تک روک بھی دیئے جاتے ہیں جب تک ایمان کی تحقیق نہ ہو جائے (یہ صورت پہلی صورت کے برعکس ہے۔ وہاں عصمت جان و مال کا حق ایمان کی تحقیق ہونے تک کے لئے دے دیا گیا تھا، اور یہاں کافر کے عقد نکاح سے آزادی کا حق ایمان کی تحقیق ہونے تک روک رکھا گیا۔ دونوں صورتوں کے فرق کی بحث یہاں غیر متعلق ہے)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خارجی ذرائع سے ایمان کی تحقیق کی جا سکتی ہے اور اس تحقیق سے اگر کسی اقرار لسانی کی تہ میں ایمان کا سراغ نہ ملے اور اس بنا پر اُس اقرار کو ساقط الاعتبار قرار دے دیا جائے تو از روئے قرآن یہ بالکل ایک صحیح فعل ہوگا۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ سورۂ ممتحنہ کی اس آیت کے نزول کے بعد جب کوئی بیاہتا عورت مکہ سے مدینہ آتی تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق اُس سے حلفیہ دریافت کیا جاتا تھا:۔

ماخرجت من بغض زوج؟ — تو اس لئے تو نہیں نکلی ہے کہ شوہر سے نفرت کرتی تھی؟

وماخرجت رغبة من ارض الی ارض؟ — اور اسلئے تو نہیں نکلی ہے کہ محض ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا شوق چرایا تھا؟

وماخرجت التماس دنیا؟ — اور تیرے نکلنے کی وجہ دنیا کی طلب تو نہیں ہے؟

وماجاء بك عشق رجلٍ منّا؟ — اور تجھ کو ہمارے آدمیوں میں سے کسی کا عشق تو کھینچ نہیں لایا ہے؟

وماخرجت الا حبًّا للہ ورسولہ؟ — اور اللہ و رسول کی محبت کے سوا تیرے نکلنے کی کوئی اور غرض تو نہیں ہے؟

جب اس تفتیش سے یہ اطمینان ہو جاتا کہ عورت واقعی دین اسلام کی خاطر نکل کر آئی ہے تو اس کو رکھ لیا جاتا تھا، ورنہ مکہ واپس بھیج دیا جاتا۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر و ابن کثیر)

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان کی تحقیق کے معنی دل چیر کر دیکھنے کے نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کر رہا ہے اس کا امتحان لے کر اطمینان کر لیا جائے۔

بس یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔ ہم بھی کلمہ طیبہ کا زبانی اقرار کرنے والے کے سامنے کلمہ کا مفہوم پیش کریں گے اور اس سے دریافت کریں گے کہ کیا واقعی وہ اسی چیز کا اقرار کر رہا ہے؟ کیا فی الواقع وہ فلاں فلاں معنی میں غیر اللہ کی الٰہیت کا منکر اور صرف اللہ کی الٰہیت کا قائل ہے؟ کیا حقیقت میں وہ اعتقاد توحید و رسالت کے فلاں فلاں مقتضیات کو جانتا ہے اور پھر اس اعتقاد کو اختیار کرتا ہے؟ کیا درحقیقت اس نے اسلام اور غیر اسلام کے فرق کا شعور رکھتے ہوئے غیر اسلام کے راستہ کو چھوڑ کر اسلام کے راستہ کو اپنے لئے منتخب کیا ہے؟ اس امتحان سے جب ہمیں اطمینان ہو جائے گا کہ اس کا زبانی اقرار درحقیقت اُس کے قلب کا ترجمان ہے اور واقعی وہ جان بوجھ کر ایمان لایا ہے یا رکھتا ہے تب ہم اس کو جماعت میں لیں گے۔

اس معاملہ میں نہ صرف یہ کہ ہمارا طریقہ کتاب و سنت کے عین مطابق ہے، بلکہ فی الواقع ایک صحیح اسلامی جماعت بنانے کی اس کے سوا کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں اور اس کلمہ گو برادری کے تمام افراد کو بھرتی کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، تو اس برادری میں تو لکھوکھا افراد ایسے ہیں جو کلمہ تک سے نابلد ہیں، اور کروڑوں ایسے ہیں جو کلمہ گو تو ہیں مگر اس کے باوجود ہر قسم کی اعتقادی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا ہیں کیونکہ ان کی کلمہ گوئی کسی تمیز و شعور و اختیار کا نتیجہ نہیں بلکہ محض مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی بھیڑ بھاڑ کو جمع کر کے آخر کونسا صحیح کام کیا جا سکتا ہے؟ محض قومی مفاد کی خدمت مطلوب ہو تو بلاشبہ ان مختلف النوع عناصر کو اکٹھا کر لینا مفید ہو سکتا ہے، لیکن اگر اعلاء کلمۃ اللہ مقصود ہو تو جو لوگ کلمۃ اللہ کو خود نہ جانتے ہوں اور جو خود ہی اس کی روح

سے خالی ہوں وہ اس کا اعلان کیا خاک کریں گے۔

یہ ایسی سیدھی سی بات ہے جس کو ایک سیدھی ذہنیت رکھنے والا آدمی بغیر کسی دقت کے سمجھ لیتا ہے لیکن جن لوگوں کے ذہن میں ٹیڑھ ہے وہ اس کے اندر سے یہ عجیب معنی نکالتے ہیں کہ ہم کلمہ گوؤں کی تکفیر کر رہے ہیں جیسی کہ ایک صاحب نے تو راقم الحروف کو اسی بنیاد پر کفر تک کا لقب بھی عطا فرما دیا ہے حالانکہ دراصل ہم نے یہ حکمت عملی خود کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی رہنمائی سے ہی اختیار کی ہے، اور اس کا اصل مقصد اس کلمہ گو برادری کو غیر شعوری اسلام سے شعوری اسلام کی طرف کھینچنا ہے نہ کہ الٹا کفر کی طرف دھکیل دینا۔ ان میں سے جو لوگ اس وقت صحیح العقیدہ مومن ہیں پہلے ہم صرف ان کی تنظیم کر کے ایک جماعت بناتے ہیں، پھر انکے واسطہ سے ہم کوشش کریں گے کہ بے معنی کلمہ گوؤں کو بامعنی کلمہ گو بنائیں، پھر جو جو اللہ کے بندے ان میں سے بامعنی کلمہ گو بنتے جائیں گے ان کو ہم جماعت میں لیکر آگے اور زیادہ وسیع پیمانہ پر کوشش کرینگے کہ ان کے جو بھائی ابھی تک جاہلیت میں مبتلا ہیں ان کو یہ لوگ تاریکی سے نور کی طرف نکال کر لائیں۔ یہ وہ گناہ عظیم ہے جس کی پاداش میں ہم کو تکفیر مسلمین کا الزام دیا جا رہا ہے۔ جو شخص اصلاح کی غرض سے صالح اور فاسد اجزاء کے مخلوط مجموعہ میں سے صالح اجزاء کو الگ چھانٹنا ہو اور پھر ان کو منظم کر کے فاسد اجزاء کو ان کی طاقت سے صالح بنانا چاہتا ہو اسے مفسد قرار دینا ایک ایسا عجیب بہتان ہے جسے سن کر واقعی انسان مبہوت رہ جاتا ہے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

آخر کوئی اللہ کا بندہ یہ تو بتائے کہ اصلاح کی اس کے سوا اور کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟

دوسرا اہم اعتراض، جو متعدد حضرات کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، دستور کی دفعہ چہارم پر ہے، جس میں کلمہ شہادت کے علاوہ چند چیزوں کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جس شخص کی

زندگی میں یہ تغیرات فوراً رونما نہ ہوں گے اُس کے متعلق یہ سمجھا جائیگا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اسے جماعت سے خارج کر دیا جائیگا۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ خدا اور رسول نے مسلمان ہونے کے لئے صرف کلمۂ شہادت کو کافی قرار دیا ہے، اگر تم اس کو ناکافی سمجھ کر چند مزید شرطوں کا اضافہ کرتے ہو۔ یہ اگر تمہاری اپنی ایجاد ہے تو دین میں اس اضافہ کا حق تمہیں کہاں سے حاصل ہوگیا؟ اور اگر تمہاری ایجاد نہیں ہے تو ان شرطوں کا ماخذ کیا ہے؟ کہاں سے تم نے یہ بات نکالی کہ آدمی کی زندگی میں فلاں فلاں تغیرات کا رونما ہونا صدق ایمانی کی علامت ہے اور اگر وہ تغیرات رونما نہ ہوں تو تم ایک مسلمان کے اقرار لسانی کو جھوٹا قرار دے کر اسے جماعتِ اسلامی سے خارج کر دو گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن اس چیز کا ماخذ ہے۔ وہ قرآن ہی ہے جو مدعی ایمان کے طرزِ عمل کو اس کے صدق و کذب کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔ اُس نے زندگی کے بعض عملی مظاہر کو صدق ایمانی کی لازمی علامت ٹھیرایا ہے اور جس شخص کی زندگی میں وہ مظاہر نہ پائے جائیں اُس کو مومن تسلیم کرنے سے ایسے صریح الفاظ میں انکار کیا ہے جو تاویل کے متحمل بھی نہیں ہیں۔

ارشاد ہے:۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (الانفال-۱) اگر تم مومن ہو تو اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔

"اگر تم مومن ہو" کے الفاظ پر غور کیجئے۔ کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ جو اللہ اور رسول کی اطاعت نہ کرے وہ مومن نہیں ہے؟ پھر اگر یہ کہا جائے کہ اطاعت خدا و رسول شرط ایمان ہے اور خدا و رسول کی نافرمانی منافی ایمان، تو کلمۂ شہادت پر اس شرط کا اضافہ ہم کر رہے ہیں یا خود قرآن کر رہا ہے؟

بعض جاہلوں نے کہیں سے یہ سن لیا ہے کہ خوارج معصیت کبیرہ کو کفر قرار دیتے ہیں، اس لئے وہ اس بات کو سن کر بے تکلف پکار اُٹھتے ہیں کہ یہ خارجیت ہے۔ ان نادانوں کے نزدیک سنّیت یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی جتنی چاہو نافرمانی کرو اور تمام عمر کرتے رہو، ایمان پر بہرحال آنچ نہیں آتی۔ حالانکہ یہ چیز جس کو یہ لوگ مسلک

اہل سنت سمجھ رہے ہیں دراصل فرقۂ مرجیہ کا مسلک ہے جس نے خوارج سے بڑھ کر اسلام کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ نادانستگی میں کبیرہ کا مرتکب ہو جانا اور چیز ہے اور دانستہ کبائر کا ارتکاب کرنا اور کرتے رہنا اور اسی کو پیشہ اور معاش اور طرز زندگی بنا لینا اور اسی میں عمر بسر کر دینا بالکل ایک دوسری چیز۔ دونوں کی نوعیت جدا ہے، دونوں کے احکام جدا ہیں۔ مومن سے نادانستگی میں بشری کمزوری کی بنا پر بڑے سے بڑا گناہ سرزد ہو سکتا ہے اور وہ مستلزم کفر نہیں ہے، اگر مومن جب کبھی ایسا فعل کرتا ہے، شیطانی اثر کے عارضی غلبہ سے کرتا ہے، اور جونہی کہ وہ اثر زائل ہوتا ہے، ایمان کی تاثیر سے فوراً اس کو ندامت و شرمساری لاحق ہوتی ہے، خدا کے خوف سے وہ کانپ اٹھتا ہے اور استغفار کرتا ہے۔ بخلاف اس کے جس شخص کے دل میں ایمان نہیں ہوتا وہ سوچ سمجھ کر منصوبے گانٹھ کر گناہ کرتا ہے، اور اس کا ارتکاب کر کے نادم ہونے کے بجائے لذت اور سرور اور کامرانی محسوس کرتا ہے اور پھر اسی کے ارتکاب کی فکر میں لگا رہتا ہے اور اس کو زندگی کی گذران کا مشغلہ یا ذریعہ بنائے رکھتا ہے۔ خوارج کی غلطی یہ ہے کہ وہ پہلی حالت کو کفر کی حالت قرار دیتے ہیں۔ اور مرجیہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ دوسری حالت کو بھی ایمان کی حالت سمجھتے ہیں۔ مگر قرآن ان دونوں میں فرق کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۔ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ

توبہ تو اللہ کے ذمہ اُن لوگوں کے لئے ہے جو نادانی سے برا کام کر بیٹھتے ہیں پھر قریب ہی میں توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ معاف کر دے گا اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ مگر توبہ ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو بُرے کام کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے مرنے کا وقت قریب آجاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی۔ اور نہ توبہ ان کے لئے ہے جو حالتِ کفر ہی میں جان دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب

عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (النساء-۳۰) مہیا کر رکھا ہے۔

قرآن کی رُو سے مومن کی تعریف یہ ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۡ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (آل عمران-۱۴)

اور جو اگر کبھی کسی فعل قبیح کے مرتکب ہو جاتے ہیں یا اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھتے ہیں (یعنی گناہ کر لیتے ہیں) تو ان کو اللہ یاد آ جاتا ہے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں ۔ آخر اللہ کے سوا اور کون گناہ معاف کرنے والا ہو گا ۔ اور وہ اپنے فعل پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے۔

پس قرآن مجرد معصیت کبیرہ کے مرتکب کو غیر مومن نہیں کہتا، مگر ان لوگوں کو مومن تسلیم کرنے سے قطعی انکار کرتا ہے جو خدا اور رسول کے صریح احکام کی پیہم خلاف ورزی کرتے رہیں اور اسی خلاف ورزی کو اپنے لئے ذریعۂ معاش یا ذریعۂ لطف زندگانی بنائیں، اور خدا و رسول کے امتناعی احکام سے واقف ہو کر بھی اپنے اس طرز عمل سے باز نہ آئیں۔

اس کے بعد اور آگے چلیے۔ ارشاد ہے:۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ۔ (التوبہ-۲)

پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

توبہ سے مراد مشرکانہ یا ملحدانہ عقائد و اعمال اور جاہلیت کے طور طریقوں سے توبہ ہے اور اس کے معنی محض زبان سے توبہ توبہ کرنے کے نہیں ہیں بلکہ عملاً ان چیزوں کو چھوڑ کر اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔ قرآن اس توبہ کو اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کو جماعت اسلامی میں داخل ہونے کی شرط لازم قرار دیتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا، بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ:۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (التوبہ-۱) — پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کے ساتھ جنگ کرنے سے باز رہو۔

یہی وہ آیت ہے جس سے سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے لئے استدلال کیا تھا اور جسے سن کر تمام صحابہ نے تسلیم کر لیا تھا کہ فی الواقع منع زکوٰۃ ایک مدعی ایمان گروہ کے خلاف تلوار اٹھانے کے لئے کافی وجہ جواز ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی حکم نماز کا بھی ہوگا، بلکہ جب آیت میں نماز زکوٰۃ پر مقدم ہے تو نماز پر اس کا اطلاق بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ اب اگر کوئی کہے کہ ترک صلوٰۃ و زکوٰۃ منافی ایمان ہے، اور جو لوگ ان دونوں چیزوں کی پابندی سے آزاد ہیں ان کا دعوئے ایمان غلط ہے تو کیا اس کا یہ قول قرآن کے خلاف ہوگا؟

اور دیکھئے:۔

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ-۳۶) — اُس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کیلئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخر پر ایمان نہیں رکھتا۔

یہاں ریا کارانہ خرچ کرنے والے کے ایمان کا صاف انکار کیا جا رہا ہے کیونکہ اس کا یہ طرز عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی الٰہ پبلک ہے نہ کہ اللہ اور وہ دنیا کے صلہ کو صلہ سمجھتا ہے نہ کہ آخرت کے صلہ کو۔

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (اعراف-۱۱) — پورا ماپو اور پورا تولو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں نقصان نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ جبکہ اس کی اصلاح کی جا چکی ہے۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔

یہاں لین دین میں خیانت کرنے اور لوگوں کے حقوق مارنے اور بدمعاملگی سے نظام تمدن میں خرابی پھیلانے کو منافی ایمان قرار دیا جا رہا ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ - ۲۸)

اور (مطلقہ عورتوں کے لئے) جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو حمل پیدا کیا ہو اس کو وہ (زمانۂ عدت میں) چھپائیں اگر وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔

اور طلاق کے احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا:-

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ - ۳۲)

یہ ہدایت اُس کو کی جا رہی ہے جو تم میں سے اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو۔

یہاں اللہ تعالےٰ کے مقرر کردہ حدود و شرائع کی پابندی کو لازمۂ ایمان اور ان کی خلاف ورزی کو منافی ایمان بتایا جا رہا ہے۔

یہ سب آیات صریح طور پر انسان کے طرزِ عمل کو اس کے صدقِ ایمان کی کسوٹی قرار دے رہی ہیں اور طرزِ عمل ہی کی دلیل پر دعوائے ایمان کے صدق و کذب کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔

پھر ملاحظہ ہو:-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (النساء - ۹)

کیا تو نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس شریعت پر جو تیری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تجھ سے پہلے کے پیغمبروں کی طرف نازل کی گئی تھی اور پھر ارادہ یہ رکھتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ طاغوت سے کفر کریں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى

تو خدا کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اے نبی، تجھ کو

يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ (النساء - ۹)

اُس معاملہ میں فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں جو ان کے درمیان مایہ النزاع ہو

یہاں صریح الفاظ میں اس شخص کو مومن تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے جو قانون الٰہی کے بجائے غیر الٰہی قانون کی طرف اپنے معاملات میں رجوع کرے اور اُن عدالتوں سے فیصلہ چاہے جو خدا کے قانون کی اطاعت پر قائم نہ ہوں بلکہ غیر اللہ کا قانون نافذ کرتی ہوں۔ رہے اس قانون کو نافذ کرنے والے تو ان کا معاملہ سخت تر ہے کہ قرآن صریح الفاظ میں انہیں طاغوت (باغی اور حد بندگی سے گذرا ہوا) قرار دیتا ہے۔ اور اس سے شدید تر معاملہ اُن کا ہے جو اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر اُس کے بندوں کے لیے خود قوانین وضع کرتے ہیں، کیونکہ یہ تو اللہ کے ساتھ حاکمیت میں حصہ بٹانا ہے (اَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ)

اب ذرا ان آیات پر بھی نگاہ ڈال لیجئے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ (المائدہ - ۹)

اے ایمان لانے والو! اگر تم مومن ہو تو اُن اہل کتاب کو جو تمہارے دین کا مذاق اور کھیل بناتے ہیں اور کفار کو اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ (المجادلہ - ۲)

جو لوگ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں اُن کو تو تم ایسے لوگوں سے دوستی رکھنے والا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (التوبہ - ۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ہیں جنہوں نے اس کی راہ میں جانفشانی کی اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی سے اندرونی تعلق نہیں رکھا۔

یہاں صاف کہا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی سچی وفاداری شرط ایمان ہے، اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے باغی اور رسول کے مشن کی اشاعت و ترقی میں مانع و مزاحم ہوں ان سے دوستی، محبت اور وفاداری کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ اس قسم کا ہر تعلق ایمان کے منافی ہے۔

آخر میں ایک نظر ادھر بھی:۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ..... اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (الحجرات - ۲)

عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے ہیں، ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے ..... اصل میں مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک نہ کیا اور اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جد و جہد کی یہی لوگ سچے اہل ایمان ہیں۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ۔

جو لوگ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو تم سے کبھی درخواست نہ کریں گے کہ انہیں راہ خدا میں جانفشانی و صرف مال سے معاف رکھا جائے اللہ متقی لوگوں کو خوب جانتا ہے۔

(باقی بر صفحہ ۴۸۹)

حقوق الزوجین

ہر سوسائٹی کے تمدن کی شیرازہ بندی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا جامع قانون جو اس کے مخصوص طرزِ تمدن کے مزاج کی رعایت ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہو۔ دوسرے ایک ایسی ہیئت حاکمہ جو اس قانون کو ٹھیک ٹھیک اُسی اسپرٹ میں نافذ کرنے والی ہو جس میں وہ وضع کیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمان اس وقت ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔ بلاشبہ ان کے پاس کتابوں میں لکھا ہوا ایک قانون ضرور موجود ہے جو اسلامی تمدن و تہذیب کے مزاج سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہے اور تمدّن و معاشرت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، مگر یہ قانون اب عملاً منسوخ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا قانون ان کے تمدنی معاملات پر فرماں روائی کر رہا ہے جو تمدن و معاشرت کے اکثر و بیشتر معاملات میں کلیتہً غیر اسلامی ہے، اور بعض معاملات میں اگر اسلامی ہے بھی تو ادھورا۔ مسلمان اس وقت جس ہیئت حاکمہ کے تابع ہیں اس نے عملاً اُن کی تمدنی زندگی کو دو شعبوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ایک شعبہ وہ ہے جس میں اس نے ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی ایسے قوانین نافذ کر دیئے ہیں جو اسلامی تمدن کے مزاج سے کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتے۔ دوسرا شعبہ وہ ہے جس میں اس نے اصولاً مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جائے، مگر عملاً اس شعبہ میں بھی شرعِ اسلامی کا نفاذ صحیح طریق پر نہیں کیا جاتا۔ "محمڈن لا" کے نام سے جس قانون کو اس

شعبہ میں نافذ کیا گیا ہے وہ اپنی شکل اور روح دونوں میں اصل اسلامی شریعت سے بہت کچھ مختلف ہے اور اس کے نفاذ کو صحیح معنوں میں شرع اسلامی کا نفاذ نہیں کہا جا سکتا۔

اس افسوس ناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم ۷۵ فی صدی گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے، اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصہ کی زندگیاں تلخ بلکہ تباہ و برباد کر دی ہیں۔ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کا سنگ بنیاد ہے، اور کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس قانون کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا جو اس تعلق کو منضبط کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ کیونکہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک عمر کے ہر حصہ میں یہ قانون کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر وہ بچہ ہے تو ماں اور باپ کے تعلقات اس کی تربیت میں موثر ہوں گے۔ اگر جوان ہے تو خود اس کو ایک شریک زندگی سے واسطہ پڑے گا۔ اگر سن رسیدہ ہے تو اس کی اولاد ازدواجی تعلقات کی بندشوں میں بندھے گی اور اس کے قلب و روح کا سکون اور اس کی زندگی کا چین بڑی حد تک ان تعلقات کی بہتری پر منحصر ہوگا۔ غرض قانون ازدواج ایک ایسا قانون ہے جو قوانین تمدن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے۔ اسلام میں اس قانون کی حقیقی اہمیت کو ملحوظ رکھ کر اس کی تدوین نہایت صحیح اصولوں پر کی گئی تھی، اور مسلمانوں کو ازدواجی معاملات میں اپنے دین سے ایک ایسا صالح، جامع اور مکمل قانون ملا تھا جس کو دنیا کے قوانین ازدواج میں ہر حیثیت سے بہترین کہا جا سکتا ہے۔ مگر شومئی قسمت سے یہ قانون بھی "محمڈن لا" کی جھپیٹ میں آگیا اور اس بری طرح مسخ ہوا کہ اس میں اور اصل اسلامی قانون ازدواج میں ایک بہت ہی دور کی مشابہت باقی رہ گئی ہے۔ اب شرع اسلامی کے نام سے مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں جو قانون نافذ ہے وہ نہ صالح ہے، نہ جامع، نہ مکمل۔ اس کے نقائص نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی پر اتنا برا اثر ڈالا ہے کہ شاید کسی دوسرے قانون نے نہیں ڈالا۔ مشکل ہی سے ہندوستان میں کوئی ایسا خوش قسمت خاندان مل سکے گا

جس میں اس ناقص قانون کی بدولت کوئی زندگی تباہ نہ ہوئی ہو۔ زندگیوں کا تباہ ہونا تو پھر بھی ایک امر حقیر ہے۔ اس سے زیادہ بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس قانون کی خرابی نے بکثرت مسلمانوں کی عزت و ناموس کو تباہ کیا، ان کے اخلاق اور ایمان کو برباد کر ڈالا، اور جو گھر ان کے دین اور ان کی تہذیب کے محفوظ ترین قلعے تھے ان میں بھی فواحش اور ارتداد کے سیلاب کو پہنچا دیا۔

قانون اور اس کو نافذ کرنے والی مشین کے نقائص سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان پر مزید خرابیوں کا اضافہ دو وجوہ سے ہوا۔ ایک دینی تعلیم و تربیت کا فقدان، جس کی بدولت مسلمان اسلام کے قانون ازدواج سے اس حد تک بیگانہ ہو گئے کہ آج اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمی اس قانون کے معمولی مسائل تک سے ناواقف ہیں۔ تفصیلات تو درکنار، اس کے اصول تک کو جاننے اور سمجھنے والے مسلمان بہت کم ملیں گے، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو عدالت کی کرسیوں پر بیٹھ کر ان کے معاملاتِ نکاح و طلاق کا تصفیہ کرتے ہیں اسلامی قانون ازدواج کے مبادی تک سے ناواقف ہیں۔ اس عام جہالت نے مسلمانوں کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ وہ بطور خود اپنے ازدواجی تعلقات میں اسلامی قانون کا ٹھیک ٹھیک اتباع کر سکیں۔ رہی دوسری وجہ تو وہ غیر اسلامی تمدنوں کا اثر ہے جس کی بدولت مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات میں نہ صرف بہت سے ایسے رسمیات اور وہمیات داخل ہو گئے ہیں جو اسلامی قانون ازدواج کے اصول اور اس کی اسپرٹ کے خلاف ہیں، بلکہ سرے سے زوجیت کا اسلامی تصور ہی ان کی ایک بڑی اکثریت کے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ کہیں ہندو تصور غالب آ گیا ہے اور اس کا اثر یہ ہے کہ بیوی کو لونڈی اور شوہر کو آقا بلکہ دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ نکاح کی بندش اعتقاداً نہیں تو عملاً ناقابل فسخ ہے۔ طلاق اور خلع اس قدر معیوب ہو گئے ہیں کہ جہاں ان کی ضرورت ہے وہاں بھی ان سے محض اس بنا پر احتراز کیا جاتا ہے کہ کہیں ناک نہ کٹ جائے، خواہ در پردہ وہ سب کچھ کیا جائے جو درحقیقت طلاق اور خلع سے زیادہ بدتر ہے۔ طلاق کو روکنے کے لئے مہر کی مقدار اس قدر بڑھا دی گئی ہے کہ شوہر کبھی طلاق دینے کی جرأت نہ کر سکے، اور مفارقت کی صورت میں عورت کو معلق رکھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔

"شوہر پرستی" عورت کے مفاخر اور اخلاقی فرائض میں داخل ہوگئی ہے سخت سے سخت حالات میں بھی وہ محض سوسائٹی کی لعنت وملامت کے خوف سے طلاق یا خلع کا نام زبان پر نہیں لاسکتی حتی کہ اگر شوہر مرجائے تب بھی اس کا اخلاقی فرض یہ ہوگیا ہے کہ ہندو عورتوں کی طرح اس کے نام پر بیٹھی رہے۔ کیونکہ بیوہ کا نکاح ثانی ہونا نہ صرف اُس کے لئے بلکہ اس کے سارے خاندان کے لئے موجب ذلت ہے۔ دوسری طرف جو نئی نسلیں فرنگی تہذیب سے متاثر ہوئی ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ تو بڑے زور سے کہتے ہیں مگر لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ پر پہنچ کر دفعتہً ان کی آواز دب جاتی ہے اور جب اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ کا فقرہ ان کے سامنے آتا ہے تو ان کا بس نہیں چلتا کہ کس طرح اس آیۃ کو قرآن سے خارج کردیں عجیب عجیب طریقہ سے اس کی تاویلیں کرتے ہیں، اور تاویل کا انداز کہے دیتا ہے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر سخت شرمندہ ہیں کہ ان کے مذہب کی مقدس کتاب میں یہ آیت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فرنگی تہذیب نے عورت اور مرد کی مساوات کا جو صور پھونکا ہے اس سے وہ دہشت زدہ ہوگئے ہیں اور ان کے دماغوں میں ان ٹھوس اور مستحکم عقلی اصولوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے جن پر اسلام نے اپنے نظام معاشرت کو قائم کیا ہے۔

ان مختلف اسباب نے مل جل کر مسلمانوں کی حیات عائلی کو اتنا ہی بدتر کردیا ہے جتنی وہ کسی زمانہ میں بہتر تھی۔ جہالت اور اجنبی تمدنوں کے اثر سے ان کے ازدواجی معاملات میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کو سلجھانے سے موجودہ قانون اور اس قانون کو نافذ کرنے والی مشین سراسر قاصر ہے، بلکہ اس کے قصور نے ان پیچیدگیوں پر بہت سی مزید الجھنوں کا اضافہ کردیا ہے۔ ناواقفیت کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت یہ سمجھتی ہے کہ ان تمام خرابیوں کی وجہ اسلامی قانون کا نقص ہے۔ اسی لئے ایک نئے قانون کی تدوین پر زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام میں ایک ایسا مکمل ازدواجی قانون موجود ہے جس میں زوجین کے لئے انصاف کے ساتھ واضح حقوق متعین کیے گئے ہیں، ان حقوق کی حفاظت اور تعدی

کی صورت میں (خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے) دادرسی کا پورا انتظام کیا گیا ہے، اور کوئی ایسی پیچیدگی نہیں چھوڑی گئی ہے جس کو عدل کے ساتھ حل نہ کر دیا گیا ہو۔ لہٰذا مسلمانوں کو کسی نئے قانون کی ضرورت ہی نہیں۔ اصلی ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون ازدواج اپنی صحیح صورت میں پیش کیا جائے اور اس کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام کوئی بہت آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے علماء کا فرض ہے کہ تقلید جامد کو چھوڑ کر موجودہ زمانے کے حالات و ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام کے قانون ازدواج کو ایسی صورت میں پیش کریں کہ مسلمانوں کے ازدواجی مسائل کی موجودہ پیچیدگیوں کو پوری طرح حل کیا جا سکے۔ اس کے بعد عام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے نظام معاشرت کو ان جاہلانہ رسموں اور ان جاہلی تصورات سے پاک کر دیں جن کو انہوں نے غیر اسلامی تمدنوں سے اخذ کیا ہے، اور اسلامی قانون کے اصول اور اسپرٹ کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے معاملات انجام دیں۔ پھر ایک ایسا نظام عدالت درکار ہے جو خود اس قانون پر ایمان رکھتا ہو اور جس کے منصفوں کو علمی اور اخلاقی حیثیت سے وہ تربیت دی گئی ہو جو اس قانون کی تنفیذ کے لئے مطلوب ہے تاکہ وہ اسے کسی غیر اسلامی قانون کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ اس کی اپنی اسپرٹ میں نافذ کریں۔

یہ مضمون اسی ضرورت کو مدنظر رکھکر لکھا جا رہا ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں اسلامی قانون ازدواج کا ایک پورا خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں اس قانون کے مقاصد، اصول اور احکام، سب چیزیں اپنے اپنے موقع پر بیان کی جائیں گی۔ حسب ضرورت ہم تشریح کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے فیصلوں کی نظیریں اور ائمۂ سلف کی اجتہادی آراء بھی نقل کریں گے تاکہ ان سے جزئی مسائل مستنبط کرنے میں آسانی ہو۔ آخر میں چند ایسی تجویزیں پیش کی جائیں گی جن سے اصول شرع اسلامی کے مطابق مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی موجودہ الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔

قانون ازدواج کے مقاصد

قانون کی تفصیلات سے پہلے مقاصد قانون کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ قانون میں سب سے اہم چیز اس کا مقصد ہے۔ مقصد ہی کو پورا کرنے کے لئے اصول مقرر کئے جاتے ہیں، اور ان اصولوں کے ماتحت احکام دئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مقصد کو سمجھے بغیر احکام نافذ کریگا تو بہت ممکن ہے کہ کسی جزئی مسئلہ میں وہ ایسا حکم نافذ کر دے جس سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص قانون کے مقصد سے واقف نہ ہوگا وہ قانون کی صحیح اسپرٹ کے مطابق اس کا اتباع بھی نہ کر سکے گا۔ لہذا ہم پہلے ان مقاصد کی تشریح کریں گے جن کے لئے اسلام میں ازدواجی معاملات کے لئے قانون مقرر کیا گیا ہے۔

اخلاق وعفت کی صیانت اسلامی قانون ازدواج کا پہلا مقصد اخلاق کی حفاظت ہے۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے اور نوع انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطہ کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لئے قرآن مجید میں نکاح کو لفظ احصان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حصن قلعے کو کہتے ہیں، اور احصان کے معنی قلعہ بندی کے ہیں۔ جو مرد نکاح کرتا ہے وہ "محصن" ہے۔ گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس سے نکاح کیا جاتا ہے وہ محصنہ ہے یعنی وہ اس قلعہ کی حفاظت میں آگئی ہے جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس اور اس کے اخلاق کی حفاظت کیلئے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا اولین مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفظ ہے اور قانون ازدواج کا پہلا کام اس قلعہ کو مستحکم کرنا ہے جو نکاح کی صورت میں اس گراں قدر چیز کی حفاظت کیلئے تعمیر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ،

أُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (النساء-۴)

جو عورتیں تم پر حرام کی گئی ہیں ان کے سوا باقی سب عورتیں تم پر حلال کر دی گئیں بشرطیکہ شہوت رانی کے لئے نہیں بلکہ قید نکاح میں لانے کے لئے تم اپنے اموال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو۔

پھر عورتوں کے لئے کہتا ہے :-

فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ۔ (النساء ۔ ۴)

پس تم ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو اور مناسب طور پر ان کے مہر ادا کرو۔ تاکہ وہ محصنات بنیں نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے بدکاری کرنے والیاں

دوسری جگہ ارشاد ہے :-

الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ ..... وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ (المائدہ ۔ ۱)

آج تمہارے لئے تمام پاک چیزیں حلال کی گئیں ... اور باعفت عورتیں خواہ وہ مومن ہوں یا اہل کتاب میں سے، بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے قید نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے ناجائز تعلقات پیدا کرنے والے

ان آیات کے الفاظ اور معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق میں احصان، یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لئے ہر چیز کو قربان کیا جا سکتا ہے مگر کسی دوسری چیز کے لئے اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ زوجین کو نکاح کی قید میں اسی لئے مقید کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر اپنی فطرت کے داعیات کو پورا کریں۔ لیکن اگر کسی قید نکاح میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو، تو بجائے اس کے کہ نکاح کی ظاہری قید کو برقرار رکھنے کے لئے اللہ کی حدود کو قربان کیا جائے، بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اللہ کی حدود پر ایسی قید نکاح کو قربان کر دیا جائے۔ اسی لئے ایلاء کرنے والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ چار مہینہ سے زیادہ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں، اور اگر وہ چار مہینے کی مدت گذرنے پر بھی رجوع نہ کریں تو انہیں ایسی عورت کو قید نکاح میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے جس سے وہ ہم بستر نہیں ہونا چاہتے، کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت اپنے داعیات

فطرت کو پورا کرنے کے لئے حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو گی، جس کو اللہ کا قانون کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں کرتے ہیں ان کو سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ لَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ یعنی ایک عورت کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری عورت گویا معلق رہ جائے۔ اس حکم کا مقصد بھی یہی ہے کہ عورت کو ایسی حالت میں مبتلا نہ کیا جائے جس سے وہ حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو۔ ایسی حالت میں نکاح کی ظاہری قید برقرار رہنے سے بہتر ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے اور عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لئے آزاد ہو جائے۔ پھر عورت کو خلع کا حق بھی اسی مقصد کے تحت دیا گیا ہے۔ ایک عورت کا کسی ایسے شخص کے پاس رہنا جس سے وہ خوش نہ ہو، یا جس سے اس کے نفس کو اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو، اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دیتا ہے جن میں حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہے۔ اس لئے ایسی عورت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو اس کا مال (جو مہر کی صورت میں اسے ملا تھا) یا اس سے کم زیادہ دے کر قید نکاح سے رہائی حاصل کرے۔

قانون اسلامی کی ان دفعات کو آگے چل کر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ مگر یہاں ان مثالوں کے بیان کرنے سے اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی قانون نے اخلاق و عفت کی حفاظت کو سب چیزوں سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور اگرچہ وہ قید نکاح کو حتی الامکان ہر طریقہ سے مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جہاں اس قید کے برقرار رہنے سے اخلاق و عفت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہاں وہ اس متاع گراں مایہ کی خاطر نکاح کی گرہ کو کھول دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلامی قانون کی جو دفعات آئندہ بیان کی جائیں گی ان کو سمجھنے اور ان کو قانون کی حقیقی اسپرٹ کے مطابق نافذ کرنے کے لئے اس نکتہ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

مودت و رحمت: دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان ازدواج کا تعلق مودت و رحمت کی بنیاد پر ہو، تاکہ مناکحت سے تمدن و تہذیب کے جو مقاصد متعلق ہیں ان کو وہ

اپنے اشتراک عمل سے بدرجہ اتم پورا کر سکیں، اور ان کو اپنی خانگی زندگی میں وہ راحت و مسرت اور سکون و آرام حاصل ہو سکے جس کا حصول انہیں تمدن کے بالاتر مقاصد پورے کرنے کی قوت بہم پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اس مقصد کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں زوجیت کا تصور ہی مودت و رحمت ہے، اور زوجین بنائے ہی اس لئے گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۔ (الروم-۳)

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (اعراف-۲۴)

وہی ہے جس نے تم کو تن واحد سے پیدا کیا اور اس کے لئے خود اسی کی جنس سے ایک جوڑا بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

پھر ایک دوسرے پیرایہ میں زوجیت کے اس تصور کو یوں پیش کیا ہے:۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ-۲۳)

وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔

یہاں زوجین کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔ لباس وہ چیز ہے جو انسان کے جسم سے متصل رہتی ہے، اس کی ستر پوشی کرتی ہے، اور اس کو خارجی فضا کے مضر اثرات سے بچاتی ہے۔ اس لباس کے استعارہ کو زوجین کے لئے استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے درمیان مناکحت کا تعلق معنوی حیثیت سے ویسا ہی تعلق ہونا چاہیئے جیسا کہ جسم اور لباس کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے دل اور ان کی روحیں ایک دوسرے کے

ساتھ متصل ہوں، وہ ایک دوسرے کی ستر پوشی کریں، اور ایک دوسرے کو ان اثرات سے بچائیں جو ان کی عزت اور ان کے اخلاق پر حرف لانے والے ہوں یہی مقتضیٰ ہے مودت و رحمت کا اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ازدواجی تعلق کی اصل روح ہے۔ اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ روح نہیں ہے تو گویا وہ ایک لاشۂ بے جان ہے۔

اسلام میں ازدواجی تعلقات کے لئے جو قوانین مقرر کئے گئے ہیں ان سب میں اس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ زوجین اگر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں تو صلح و آشتی، محبت اور دلی یکجہتی کے ساتھ رہیں، ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں، اور آپس کے تعلقات میں فیاضانہ برتاؤ رکھیں۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو پھر ان کی یکجائی سے جدائی بہتر ہے، کیونکہ مودت و رحمت کی روح نکلنے کے بعد ازدواجی تعلق ایک مردہ جسم ہے جس کو اگر دفن نہ کر دیا جائے تو عفونت پیدا ہوگی اور اس سے خانگی زندگی کی ساری فضا زہر آلود ہو جائے گی۔ اسی لئے قرآن مجید کہتا ہے کہ:-

وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ۔ (النساء-۱۹)

اگر آپس میں موافقت سے رہو اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے بچو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر (یہ نہ ہو سکے اور) زوجین ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ اپنے وسیع خزانۂ غیب سے ہر ایک کی کفالت کرنے والا ہے۔

پھر جگہ جگہ احکام بیان کرنے کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ

فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (بقرہ-۲۹)

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھا جائے یا احسان (نیک برتاؤ) کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ۔ (الطلاق-۱)

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھو یا بھلے طریقہ سے ان سے جدا ہو جاؤ۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء-۳)

اپنی بیویوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (بقرہ-۲۹)

یا تو بھلے مانسوں کی طرح اُن کو رکھو یا بھلے مانسوں کی طرح رخصت کر دو محض ستانے کے لئے ان کو نہ روکے رکھو کہ ان کی حق تلفی کرنے لگو اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے نفس پر خود ظلم کرے گا (یعنی اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنائے گا)

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ (بقرہ-۳۱)

اور آپس کے تعلقات میں فضل کو نہ بھولو (یعنی فیاضی کا برتاؤ کرو)۔

طلاق رجعی کے احکام جہاں بیان کئے گئے ہیں وہاں رجوع کے لئے نیک نیتی کی شرط لگا دی گئی ہے یعنی دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق سے پہلے شوہر کو حق ہے کہ اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کی نیت صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کی ہو نہ کہ ستانے اور لٹکائے رکھنے کی وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (بقرہ-۲۸)

پھر ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جو اپنے مذہب اپنے خیالات اور تمدن و معاشرت میں مسلمانوں سے اتنی مختلف ہیں کہ مسلمان دلی محبت اور قلب و روح کی یک جہتی کے ساتھ ان سے میل نہیں کھا سکتے، کیونکہ ایسی صورت میں ازدواج کا رشتہ کوئی صحیح تمدنی رشتہ نہ ہوگا بلکہ محض ایک شہوانی رشتہ بن جائے گا، اور اس میں یا تو مودت و رحمت نہ ہوگی، یا اگر ہوگی تو وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے مفید ہونے کے بجائے مضر ہو جائے گی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ (بقرہ-۲۷)

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرکہ سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔ اور مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کی شادیاں نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔

اہل کتاب کے معاملہ میں اگرچہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ ان کی عورتوں سے نکاح کر لیا جائے کیونکہ تہذیب کے مبادی میں ایک حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے لیکن اس کو بھی اسلام میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ کعب بن مالک نے ایک کتابیہ سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرمایا، اور ممانعت کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ اِنَّهَا لَا تُحْصِنُكَ، وہ تجھے محصن نہیں بنا سکتی، کیونکہ اس صورت میں دونوں کے درمیان مودت و رحمت نہ ہوگی جو احصان کی اصلی روح ہے۔ حضرت حذیفہ نے ایک یہودیہ سے نکاح کرنا چاہا تو حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ اُسے چھوڑ دو۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے کتابیات سے نکاح کو بصراحت مکروہ فرمایا ہے اور حضرت علیؓ نے کراہیت کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی جو مومن ہے وہ ایسے لوگوں سے محبت نہیں کر سکتا جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہوں، اور جب زوجین میں محبت ہی نہ ہو تو ایسا نکاح کس کام کا۔

غرض مندرجۂ بالا مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ صیانت اخلاق و عفت کے بعد دوسری چیز جو اسلام کے قانون ازدواج میں مقصدی اہمیت رکھتی ہے وہ زوجین کے درمیان مودت و رحمت ہے۔ جب تک ان کے تعلقات میں اس چیز کے باقی رہنے کی امید ہو، اسلامی قانون ان کے رشتۂ مناکحت کی حفاظت پر اپنی پوری قوت صرف کرتا ہے، اور جب یہ مودت و رحمت باقی نہ رہے، اور اس کی جگہ بے دلی، سرد مہری، نفرت، اور بیزاری پیدا ہو جائے، تو قانون کا میلان، رشتۂ نکاح کی گرہ کھول دینے کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی اس قابل ہے کہ اس کو ذہن نشین کر لیا جائے، کیونکہ جو لوگ اس کو نظر انداز کر کے قانون اسلامی کے اصول کو جزئیات پر منطبق کرتے ہیں وہ قدم قدم پر ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے

اصول قانون

قانون کے مقاصد سمجھ لینے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اسلامی قانون ازدواج کی تدوین کن اصولوں پر کی گئی ہے، اس لئے کہ جب تک اصول ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہوں، جزئی مسائل میں قانون کے احکام کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنا مشکل ہے۔

اصل اوّل | اصول قانون میں پہلی اصل جس پر بہت سے احکام متفرع ہوتے ہیں، یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں مرد کو عورت سے ایک درجہ زائد دیا گیا ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ اس درجہ کی تشریح ہم کو اس آیت میں ملتی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء-۶)	مرد عورتوں پر قوّام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس بنا پر کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی اور ان کی غیر موجودگی میں بتوفیق الٰہی ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہیں۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ مرد کو عورت پر فضیلت کس بنا پر ہے اور اس کو قوّام[1] کیوں بنایا گیا ہے؟ یہ قانون کی نہیں فلسفۂ اجتماع کی بحث ہے۔ اپنے موضوع کے دائرے میں رہ کر ہم یہاں صرف اس امر کی صراحت کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ خانگی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لئے بہرحال زوجین میں سے ایک کا قوّام اور صاحب امر ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں بالکل مساوی درجہ اور مساوی اختیارات رکھنے

[1] قوّام protecter ، Sustainar ۲۹

والے ہوں تو بدنظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے، جیسی کہ فی الواقع ان قوموں میں رونما ہو رہی ہے جنہوں نے عملاً زوجین کے درمیان مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے اس لئے اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کر کے زوجین میں سے ایک کو قوّام اور صاحب امر اور دوسرے کو مطیع اور ماتحت بنانا ضروری سمجھا، اور قوامیت کے لئے اُس فریق کا انتخاب کیا جو فطرۃً یہی درجہ لے کر پیدا ہوا ہے۔

مرد کے فرائض پس اسلامی قانون کے ماتحت ازدواجی زندگی کا جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے، اس میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہے، اور اس حیثیت میں اس پر حسب ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

۱۔ مہر | وہ عورت کا مہر ادا کرے، کیونکہ اس کو عورت پر جو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں وہ اسی مہر کا معاوضہ ہیں۔ اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگرچہ اصل فطرت کے لحاظ سے مرد ہی قوامیت کا مستحق ہے، مگر بالفعل یہ مرتبہ اس کو اُس مال کے معاوضہ میں ملتا ہے جو وہ مہر کی صورت میں خرچ کرتا ہے۔ اس کی تشریح دوسری آیات میں بھی کی گئی ہے۔ مثلاً۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء-۱)

اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ..... فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء-۴)

محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئیں کہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو نکاح میں لاؤ..... پس ان سے تم نے جو تمتع کیا ہے اس کے بدلے میں قرار داد کے مطابق تم ان کے مہر ادا کرو

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (النساء-۴)

پس لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت پر نکاح کرو اور مناسب طور پر ان کے مہر ادا کر دو۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ

اور حلال کی گئیں تمہارے لئے عزت دار عورتیں مومنوں

مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (المائدہ-۱)

میں سے اور عزت دار عورتیں ان لوگوں میں سے جن کے پاس تم سے پہلے کتاب بھیجی جا چکی ہے جب کہ تم ان کے مہر ادا کر دو۔

پس نکاح کے وقت عورت اور مرد کے درمیان مہر کی جو قرارداد ہوئی ہو اس کو پورا کرنا مرد پر لازم ہے۔ اور اگر وہ اس قرارداد کو پورا کرنے سے انکار کرے تو عورت کو حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے روک لے۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے جس سے سبکدوش ہونے کی کوئی صورت مرد کے لئے بجز اس کے نہیں ہے کہ عورت یا تو اس کو مہلت دے[1] یا اس کی ناداری کا لحاظ کر کے بخوشی معاف کر دے، یا اس پر احسان کر کے برضا و رغبت اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا۔ (النساء-۱)

پھر اگر وہ خوش دلی کے ساتھ مہر میں سے کچھ معاف کر دیں تو اس کو مزے سے کھاؤ پیو۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ (النساء-۴)

اور اگر تم قرارداد کے بعد اس میں کم زیادہ پر باہمی رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں

۲۔ نفقہ | شوہر کا دوسرا فرض نفقہ ہے۔ قانون اسلام نے زوجین کے حدود عمل کی واضح طور پر تقسیم کر دی ہے۔ عورت کا کام گھر میں بیٹھنا اور خانگی زندگی کے فرائض انجام دینا ہے۔ (وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ) اور مرد کا کام کمانا اور اپنے اہل کے لئے ضروریات زندگی فراہم کرنا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے جس کی بنا پر شوہر کو اپنی بیوی پر فضیلت کا ایک درجہ دیا گیا ہے۔ اور یہ چیز قوامیت کے عین مفہوم میں داخل ہے۔ قوام کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو کسی شئے کی نگہبانی اور خبر گیری کرنے والا ہو اور اسی حیثیت سے اس شئے پر اقتدار

---

[1] اسی کو ہرجوٗل کہتے ہیں۔ مگر آج کل ہرجوٗل کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ وقت پر ہزاروں لاکھوں کی دستاویز بیچ کر رکھ دی جاتی ہے کہ کون لیتا ہے کون دیتا ہے؟ گویا ابتدا ہی سے ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی، حالانکہ اس نیت کے ساتھ جو نکاح کیا جائے وہ عند اللہ فاسد ہے۔

رکھتا ہو۔ قرآن مجید کی آیت اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ الخ میں وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ سے جس طرح مہر کا وجوب ثابت ہوتا ہے اُسی طرح نفقہ کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے اگر شوہر اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو قانون اس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اور بصورت انکار یا بصورت عدم استطاعت اس کا نکاح فسخ کر دے گا۔ لیکن نفقہ کی مقدار کا تعین عورت کی خواہشات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ مرد کی استطاعت پر ہے۔ قرآن مجید نے اس بارے میں ایک قاعدۂ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ۔ مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق۔ یہ نہیں کہ غریب آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے جو اُس کی حیثیت سے زیادہ ہو یا مالدار آدمی وہ نفقہ دے جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔

۴۔ ظلم سے اجتناب | مرد کا تیسرا فرض یہ ہے کہ اس کو عورت پر جو ترجیحی حقوق اور اختیارات دیئے گئے ہیں ان کو ظالمانہ طریقہ سے استعمال نہ کرے۔ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں، مثلاً:

ایلاء | عورت کے داعیات نفس کو پورا کرنے سے کسی عذر جائز[1] کے بغیر اعراض کرنا، جس کا مقصد محض اس کو سزا دینا اور تکلیف پہنچانا ہو۔ اس کے لئے قانون اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مدت رکھی ہے۔ اس مدت کے اندر مرد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلق زن و شو قائم کرلے، ورنہ انقضائے مدت کے بعد اس کو مجبور کیا جائے گا کہ عورت کو چھوڑ دے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ	جو لوگ اپنی عورتوں سے ایلا کرتے ہیں ان کے لئے
اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے
وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ	والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا عزم کرلیں تو اللہ سننے

[1] عذر جائز سے مراد مرد یا عورت کی بیماری، یا مرد کا حالت سفر میں ہونا، یا کوئی اور ایسی صورت پیش آجانا ہے، جس میں مرد اپنی بیوی کی طرف رغبت رکھتا ہو مگر اس کے پاس جانے پر قادر نہ ہو۔

عَلِیْمٌ۔ (البقرہ-۲۲۸) اور جاننے والا ہے۔

اس مسئلہ میں بعض فقہاء نے حلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد نے اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلاء ہوگا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ دس برس بھی اس سے علیحدہ رہے اس پر ایلاء کا اطلاق نہ ہوگا۔ لیکن یہ بات قانونِ اسلامی کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ کسی شخص کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاسکتی۔ اس قاعدۂ کلیہ کے ماتحت قرآن مجید میں عورت کی فطری قوتِ برداشت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر سزا کے طور پر عورت کو صحبت سے محروم کیا جائے تو یہ سزا صرف اتنی مدت کے لئے ہونی چاہیے جس کو وہ برداشت کر سکتی ہے۔ اس مدت سے زیادہ سزا دینے میں تکلیف مالایطاق ہے، اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے جس سے مرد و عورت کو محفوظ رکھنا اسلامی قانون کا اولین مقصد ہے۔ پس آیت مذکورۃ الصدر کا اصل مدعا محض یہ ہے کہ عورت کو ترکِ صحبت کی تکلیف چار مہینے سے زیادہ مدت کے لئے نہ دی جائے۔ رہا قسم کھانا یا نہ کھانا، تو یہ اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا۔ قسم نہ کھانے سے عورت کی تکلیف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اور قسم کھا لینے سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ صحابۂ کرام میں سے جو لوگ تفقہ فی الدین کا شرف رکھتے تھے (مثلاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر) ان کی رائے اس باب میں یہی تھی کہ ضرار کی نیت سے عورت کو چھوڑ دینا ایلاء ہے، خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو (احکام القرآن للجصاص الحنفی ج ۱-ص ۴۲۰)

فان عزموا الطلاق کی تفسیر میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ حضرات عثمان بن عفان، زید بن ثابت، ابن مسعود، اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ چار مہینہ کی مدت کا گذر جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، لہٰذا اس مدت کے ختم ہونے پر اس کو رجوع کا حق باقی

نہیں رہتا۔ حضرت علی و ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے مگر ایک دوسرا قول جو مؤخر الذکر دونوں بزرگوں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہنچا ہے، یہ ہے کہ ختم مدت پر شوہر کو نوٹس دیا جائے گا کہ یا اپنی بیوی سے رجوع کر و یا اس کو طلاق دے دو۔ لیکن جب ہم آیت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو پہلا قول ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے مُولی کو بالفاظ صریح صرف چار مہینہ کی مہلت دی ہے۔ اس کو رجوع کا حق اس مہلت کے اندر ہے، اور اس کے ختم ہو جانے پر دوسری صورت بجز عزیمت طلاق کے اور کوئی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص چار مہینہ کے بعد اس کو رجوع کا حق دیتا ہے، تو گویا وہ اس کی مہلت میں اضافہ کرتا ہے جو کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے صریح تجاوز ہے۔

ضرار اور تعدی | عورت سے رغبت نہ ہو، اس کو رکھنا نہ چاہے، مگر محض ستانے اور زیادتی کرنے کے لئے اس کو رکھ چھوڑے، بار بار طلاق دے اور دو طلاقوں کے بعد تیسرے طلاق سے پہلے رجوع کر لے۔ قرآن مجید میں اس کو نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا (البقرہ - ۲۹)

اور ان کو ستانے اور زیادتی کرنے کے لئے نہ روک رکھو، جو ایسا کرے گا وہ اپنے اُوپر آپ ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا مذاق نہ بنا لو۔

ضرار اور تعدی کے الفاظ نہایت وسیع ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ستانے اور زیادتی کرنے کی نیت سے کسی عورت کو روک رکھے گا وہ ہر طرح سے اس کو آزار پہنچائے گا، روحانی اور جسمانی تکلیفیں دے گا، ادنیٰ طبقہ کا ہوگا تو مار پیٹ اور گالم گلوچ کرے گا، اونچے طبقے کا ہوگا تو تذلیل اور ایذا رسانی کے دوسرے طریقے اختیار کرے گا۔ ضرار اور تعدی کے الفاظ ان سب پر حاوی ہیں، اور قرآن مجید کی رو سے یہ سب افعال ممنوع ہیں۔ جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرتا ہے وہ اپنی جائز

حد سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسی صورت میں عورت اس کی مستحق ہے کہ قانون کی مدد لے کر اس مرد سے چھٹکارا حاصل کرے۔

ازواج میں عدل نہ کرنا | متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں عدل نہ کرنا، اور کسی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق رکھ چھوڑنا یہ بھی قرآن کی رُو سے ممنوع ہے:

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ (النساء-۱۹)

کسی ایک کی طرف بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا معلق رکھ چھوڑو۔

قرآن میں تعدّد ازدواج کی اجازت عدل کی شرط سے مشروط ہے۔ اگر عدل نہ ہو تو اجازت آپ سے آپ منسوخ ہو جاتی ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔ خود اس آیت میں جہاں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے، یہ صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا (النساء-۱)

پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو یا لونڈی جو تمہارے قبضہ میں ہو۔ یہ زیادہ تر قرین مصلحت ہے تاکہ تم حق سے متجاوز نہ ہو جاؤ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ نے اَلَّا تَعُوْلُوْا کے معنی یہ کیے ہیں کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں جن کی پرورش کا بار تم پر پڑ جائے۔ لیکن یہ اصل لغت کے خلاف ہے۔ لغت میں عول کے معنی میل کے ہیں۔ ابو طالب کا شعر ہے:۔

بِمِيزَانِ صِدْقٍ لَا يُخِسُّ شَعِيرَةً وَوَزَّانُ قِسْطٍ وَزْنُهُ غَيْرُ عَائِلِ

یہاں عائل بمعنی مائل مستعمل ہوا ہے۔ اسی اصل سے عول کو جور اور طریق عدل سے ہٹ جانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، چنانچہ ابن عباس، حسن، مجاہد، شعبی عکرمہ اور قتادہ

وغیرہم نے لا تعولوا کے معنی لا تمیلوا عن الحق کیے ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید کی مذکورۂ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا، اور ایک کی طرف جھک کر دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ ظالم ہے، تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں۔ قانون ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرے گا۔ اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہوگا۔

عدل کے باب میں قرآن کریم نے تصریح کر دی ہے کہ دلی محبت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس میں مساوات برتنے پر نہ انسان قادر ہے، اور نہ اس کے لئے مکلّف ہے (وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ) البتہ اس کو تکلیف جس بات کی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نفقہ اور معاشرت اور تعلقات زن و شو میں ان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔

مرد کے نشوز کی یہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں قانون مداخلت کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ زوجین کے باہمی تعلقات میں بہت سے ایسے معاملات بھی پیش آسکتے ہیں اور آتے رہتے ہیں جو مودت و رحمت کے منافی ہیں مگر ان میں قانون کے لئے مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید نے ایسے معاملات کے لئے شوہروں کو عام اخلاقی ہدایات دی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ مرد کا برتاؤ فیاضانہ اور محبت آمیز ہونا چاہئے، رات دن کی تھکا فضیحتی کے ساتھ زندگی گذارنا حماقت ہے، اگر عورت کو رکھنا ہے تو سیدھی طرح سے رکھو، نہ بنے تو سیدھی طرح رخصت کر دو۔ قرآن کی ان ہدایات کو قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کیا جا سکتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ میاں بیوی کے ہر جھگڑے میں قانون مداخلت کیا کرے، لیکن اس سے قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عدل و انصاف اور رحمت و مودت کے برتاؤ کی ذمہ داری زیادہ تر مرد پر عائد کرتا ہے۔

مرد کے حقوق | مرد کو قوامیت کا مرتبہ جن ذمہ داریوں کے ساتھ دیا گیا ہے وہ اوپر بیان ہوئیں اب دیکھنا

چاہیئے کہ قوام ہونے کی حیثیت سے مرد کے حقوق کیا ہیں۔

حفظ للغیب | عورت پر مرد کا پہلا حق قرآن مجید نے ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جن کا بدل کسی دوسری زبان میں مہیا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتا ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ ..... حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ۔ (النساء-۶)

جو نیک عورتیں ہیں وہ غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے ماتحت

یہاں حفظ للغیب سے مراد ہر اُس چیز کی حفاظت کرنا ہے جو شوہر کی ہو اور اس کی غیر موجودگی میں بطور امانت عورت کے پاس ہے، اس میں اس کے نسب کی حفاظت، اس کے نطفہ کی حفاظت، اس کے مال کی حفاظت، اس کے رازوں کی حفاظت، غرض سب ہی کچھ آجاتا ہے۔ اگر عورت ان حقوق میں سے کسی حق کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو مرد کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

شوہر کی اطاعت | مرد کا دوسرا حق یہ ہے کہ عورت اس کی اطاعت کرے۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (النساء-۶) جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی ہیں۔ یہ ایک عام حکم ہے جس کی تشریح میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے متعدد چیزیں بیان فرمائی ہیں:۔ مثلاً

إِنَّ لَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُونَهُ۔

تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے ہاں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔

لَا تَصَدَّقَ بِشَيْءٍ مِنْ بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَإِنْ فَعَلَتْ كَانَ لَهُ الْأَجْرُ وَعَلَيْهَا الْوِزْرُ

وہ اس کے گھر میں سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرے۔ اگر ایسا کرے گی تو اجر شوہر کو ملے گا اور گناہ عورت پر ہوگا۔

وَلَا تَخْرُجَ مِنْ بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ۔

نیز وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے۔

لا تصوم المرأة يوماً وزوجها شاهد من غير رمضان الا باذنه۔

عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں رمضان کے سوا نفل روزہ اس کی اجازت کے بغیر ایک دن بھی نہیں رکھ سکتی۔

خير النساء امراة اذا نظرت اليها سرتك وإذا امرتها اطاعتك واذا غبت عنها حفظتك فى مالك ونفسها۔

بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو دیکھے تو تیرا دل خوش ہو جائے اور جب تو اس کو کوئی حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو اس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ تیرے مال اور اپنے نفس میں تیرے حق کی حفاظت کرے۔

اس عام حکم اطاعت میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت سے اس کا شوہر اللہ کی معصیت کا مطالبہ کرے تو وہ اس حکم کو ماننے سے انکار کر سکتی ہے، مثلاً وہ فرض نماز اور روزے سے منع کرے، یا شراب پینے کا حکم دے، یا پردہ شرعی ترک کرائے، یا فواحش کا ارتکاب اس سے کرانا چاہے تو عورت نہ صرف اس کی مجاز ہے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ شوہر کے ایسے حکم کو ٹھکرا دے، اس لئے کہ لا طاعة لمخلوق فى معصية الخالق۔ اس صورت خاص کے سوا باقی تمام صورتوں میں شوہر کی اطاعت عورت کا فرض ہے۔ اگر نہ کرے تو ناشزہ ہو گی اور شوہر کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہو گا جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

مرد کے اختیارات قانون اسلام نے چونکہ مرد کو قوام بنایا ہے، اور اس پر عورت کے مہر، نفقہ، اور نگہبانی و خبر گیری کی ذمہ داری عائد کی ہے، اس لئے وہ مرد کو عورت پر چند ایسے اختیارات عطا کرتا ہے جو خانگی زندگی کا نظم برقرار رکھنے، اور اپنے گھر کے اخلاق اور حسن معاشرت کی حفاظت کرنے، اور خود اپنے حقوق کو اتلاف سے بچانے کے لئے اس کو حاصل ہونے ضروری ہیں۔ قانون اسلام میں ان اختیارات کو بوضوح بیان کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ وہ حدود بھی متعین کر دی گئی ہیں جن کے اندر یہ اختیارات استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

نصیحت، تادیب اور تعزیر اگر عورت اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے، یا اس کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرے تو ایسی صورت میں مرد پر لازم ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کرے، نہ مانے تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے برتاؤ میں حسب ضرورت اس کے ساتھ سختی کرے، اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو وہ اس کو مار سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی اطاعت کرنے لگے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ[1] فَعِظُوْھُنَّ	اور جن عورتوں سے تم نشوز دیکھو ان کو نصیحت کرو،
وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ	اور بستروں پر ان کو چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ اگر وہ
فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا۔	تمہاری اطاعت کریں تو پھر ان پر سختی کرنے کا
(النساء-۶)	کوئی طریقہ نہ ڈھونڈو۔

اس آیت میں وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ (یعنی بستروں پر ان کو چھوڑ دو) سے سزا کے طور پر ترک مباشرت کی اجازت دی گئی ہے، مگر آیت ایلاء نے جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، اس کے لئے ایک فطری حد مقرر کر دی ہے۔ ہجر فی المضاجع کی حد چار مہینے کی ہے۔ جو عورت اتنی نافرمان اور شوریدہ سر ہو کہ شوہر ناراض ہو کر اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے، اور وہ جانتی ہو کہ چار مہینے تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد شوہر از روئے احکام الٰہی اس کو طلاق دے دے گا، اور پھر بھی وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے، وہ اسی قابل ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ چار مہینے کی مدت اس کو ادب سکھانے کے لئے کافی ہے۔ اس سے زیادہ مدت تک یہ سزا دینا غیر ضروری ہوگا، کیونکہ اتنے دن تک اس کا نشوز پر قائم رہنا یہ جانتے ہوئے کہ اس کا نتیجہ طلاق ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں ادب سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، یا وہ حسن معاشرت کے ساتھ کم از کم اس شوہر سے نباہ نہیں سکتی۔ نیز اس سے وہ مقاصد بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لئے ایک مرد کو ایک عورت کے ساتھ رشتہ مناکحت میں باندھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ.....

---

[1] نشوز کے معنی ارتفاع کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد ادائے حق سے اعراض ہے خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

ایسی حالت میں شوہر اپنی خواہشات نفس پوری کرنے کے لئے کسی ناجائز طریقہ کی طرف مائل ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا ہو جائے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ جہاں احد الزوجین اس قدر ضدی اور شوریدہ سر ہو وہاں زوجین میں مودت و رحمت قائم نہ ہو سکے گی۔

امام سفیان ثوری سے واھجروھن فی المضاجع کے معنی میں ایک دوسرا قول منقول ہے۔ وہ کلام عرب سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ ہجر کے معنی باندھنے کے ہیں۔ ھجر البعیر اذا ربطہ صاحبہ بالھجار۔ ہجار اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی پٹھے اور ٹانگوں کو ملا کر باندھی جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب وہ نصیحت نہ قبول کریں تو گھر میں ان کو باندھ کر ڈال دو۔

دوسری سزا جس کی اجازت زیادہ شدید حالات میں دی گئی ہے، مارنے کی سزا ہے۔ مگر اس کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ضرب غیر مبرح کی قید لگا دی ہے یعنی ضرب شدید نہ ہونی چاہیئے۔

اضربوھن اذا عصینکم فی المعروف ضربا غیر مبرح۔	اگر وہ تمہارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں تو ان کو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔
ولا یضرب الوجہ ولا یقبح۔	منہ پر نہ مارے اور گالم گلوچ نہ کرے۔

یہ دو سزائیں دینے کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، سزا اس نافرمانی پر دی جا سکتی ہے جو "معروف" میں ہو۔ یعنی ایسے احکام میں جو مرد کے جائز حقوق سے متعلق ہوں، نہ یہ کہ ہر جا و بے جا حکم کی اطاعت پر اصرار کیا جائے اور عورت نہ مانے تو اس کو سزا دی جائے۔ پھر تصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہونا چاہیئے۔ اسلامی قانون کے کلیات میں سے ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ۔ جو کوئی

تم پر زیادتی کرے اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے۔ زیادتی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس قصور پر نصیحت کافی ہے اس پر ترک کلام، اور جس پر ترک کلام کافی ہے اس پر ہجرفی المضاجع، اور جس پر ہجرفی المضاجع کافی ہے اس پر مارنا ظلم میں شمار ہوگا۔ مار ایک آخری سزا ہے جو صرف شدید اور ناقابل برداشت قصور پر دی جاسکتی ہے۔ اور اس میں بھی وہ حد ملحوظ رکھنی ضروری ہے جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کی صورت میں مرد کا نشوز ہوگا اور عورت کو حق ہو جائے گا کہ اس کے خلاف قانون سے استمداد کرے۔

طلاق | دوسرا اختیار مرد کو یہ دیا گیا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ نباہ نہ کر سکتا ہو اس کو طلاق دے دے۔ چونکہ مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے، اس لئے ان حقوق سے دست بردار ہونے کا اختیار بھی اُسی کو دیا گیا ہے۔ عورت کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ اگر وہ طلاق کی مختار ہوتی تو مرد کا حق ضائع کرنے پر دلیر ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا، اور صرف اُس وقت اسے چھوڑے گا جب اس کے لئے چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر مال صرف کرنے والا ایک ہو، اور ضائع کرنے کا اختیار دوسرے کو مل جائے تو اس دوسرے شخص سے یہ امید کم کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں اس شخص کے مفاد کا لحاظ کرے گا جس نے مال صرف کیا ہے۔ پس مرد کو طلاق کا اختیار دینا نہ صرف اس کے جائز حق کی حفاظت ہے، بلکہ اس میں یہ بھی مصلحت مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو۔

اصل دوم | اسلامی قانون ازدواج کی دوسری اصل یہ ہے کہ مناکحت کے تعلق کو امکانی حد تک مستحکم بنایا جائے، اور جو مرد و زن ایک مرتبہ اس رشتہ میں بندھ چکے ہوں ان کو باہم جمع رکھنے کی انتہائی کوشش کی جائے، مگر جب ان کے درمیان محبت اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے

اور رشتہ مناکحت میں ان کے بندھے رہنے سے قانون کے اصل مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو نفرت و کراہیت اور طبائع کی ناموافقت کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کے لئے علیحدگی کا راستہ کھول دیا جائے۔ اس معاملہ میں اسلامی قانون نے فطرت انسانی کی رعایت اور تمدنی مصالح کی حفاظت کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی قانون میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف وہ رشتۂ نکاح کو مستحکم بنانا چاہتا ہے مگر نہ اتنا مستحکم جتنا ہندو مذہب اور مسیحیت میں ہے کہ زوجین کے لئے مناکحت کی زندگی خواہ کتنی ہی شدید مصیبت بن جائے بہرحال وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہو سکیں۔ دوسری طرف وہ علیحدگی کے راستے کھولتا ہے مگر نہ اتنے آسان جتنے روس، امریکہ اور مغرب کے اکثر ممالک میں ہیں کہ ازدواجی تعلق میں سرے سے کوئی پائیداری ہی باقی نہ رہے اور رشتۂ ازدواج کی کمزوری سے عائلی زندگی کا سارا نظم درہم برہم ہو جائے۔

اس اصل کے ماتحت علیحدگی کی جو صورتیں رکھی گئی ہیں وہ تین ہیں۔ طلاق۔ خلع، اور قضائے قاضی۔

طلاق اور اس کی شرائط اصطلاح شرع میں طلاق سے مراد وہ علیحدگی ہے جس کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے۔ مرد اپنے اس اختیار میں آزاد ہے۔ وہ جب چاہے اپنے اُن حقوق زوجیت سے دست بردار ہو سکتا ہے جن کو اس نے مہر کے معاوضہ میں حاصل کیا تھا۔ مگر شریعت اسلامی طلاق کو پسند نہیں کرتی۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض الحلال الی اللہ تعالیٰ الطلاق (اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے) اور تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات (شادیاں کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا) اس لئے مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے جن کے ماتحت وہ اس اختیار کو محض ایک آخری چارہ کار کے طور پر ہی استعمال کر سکتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر عورت تم کو ناپسند بھی ہو تو جہاں تک ہو سکے اس کے ساتھ نباہنے کی کوشش کرو۔ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ ان کے ساتھ اچھے سلوک سے رہو۔ اگر وہ تم کو ناپسند

فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء-۳)

بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔

لیکن اگر نباہ نہ کر سکتے ہو تو تم کو حق ہے کہ اس کو طلاق دے دو، مگر یک لخت چھوڑ دینا درست نہیں ہے۔ ایک ایک مہینہ کے فاصلہ سے ایک ایک طلاق دو۔ تیسرے مہینے کے اختتام تک تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع حاصل رہے گا۔ ممکن ہے کہ اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے، یا عورت کے رویہ میں کوئی خوش آیند تغیر ہو، یا خود تمہارا ہی دل بدل جائے۔ البتہ اگر اس مہلت میں سوچنے اور سمجھنے کے باوجود تمہارا فیصلہ یہی ہو کہ اس عورت کو چھوڑ دینا چاہیے تو پھر تیسرے مہینے کے ختم پر آخری طلاق دے دو جو تم کو عورت سے قطعی طور پر جدا کر دے گی۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرہ-۲۹)

طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو بھلے طریقہ سے روک لیا جائے یا پھر شریفانہ طریقہ سے چھوڑ دیا جائے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ..... وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (بقرہ-۲۸)

مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک انتظار میں رکھیں ..... اگر ان کے شوہر اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو اس مدت میں وہ ان کو پھیر لینے کے زیادہ حقدار ہیں

اس کے ساتھ حکم یہ ہے کہ تین مہینوں کی اس مدت میں عورت کو اپنے گھر سے بھیج نہ دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو ممکن ہے کہ ساتھ رہنے بسنے سے دل ملنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ

جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا زمانہ گنتے رہو اور اللہ سے ڈرو اور ان کو گھروں سے نکال نہ دو اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی

حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق - ۱)

بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ تجھ کو کیا خبر کہ اللہ اس کے بعد کوئی (اصلاح کی) صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ مدت مقررہ کے اختتام کو پہنچنے لگیں تو یا ان کو نیکی کے ساتھ روک لو یا انہیں تو نیکی کے ساتھ جدائی اختیار کر لو (یعنی آخری طلاق دے دو جو بائن ہوگی)۔

پھر حالت حیض میں بھی طلاق دینے سے منع کیا گیا، اور حکم دیا گیا کہ طلاق دینا ہو تو طہر کی حالت میں دو کیونکہ حیض کی حالت میں مرد اپنی بیوی سے رکا ہوا ہوتا ہے، اگر یہ رکاوٹ نہ رہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ جذبات لطیف شاید اس کو بیوی کی طرف راغب کر دیں اور طلاق کا ارادہ بدل جائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ سن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دو کہ رجوع کرے اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمر کو اس فعل پر تو بیخ فرمائی اور طلاق کے طریقے کی تعلیم اس طرح دی:۔

"ابن عمر تم نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کرو پھر ایک ایک طہر پر ایک ایک طلاق دو، پھر جب وہ (تیسری مرتبہ) طاہر ہو تو اس وقت یا طلاق دے دو یا اس کو روک لو۔"

حضرت ابن عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ ارأیت لو کنت طلقتها ثلاثا اکان لی ان اراجعها؟ "اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق باقی رہتا"؟ حضور نے فرمایا

لا، کانت تبین و تکون معصیۃ ۔ نہیں وہ جدا ہو جاتی اور یہ گناہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینا گناہ ہے، شرع اسلامی کی اہم مصلحتوں کے خلاف ہے، اور اس سے اللہ کی حدود ٹوٹتی ہیں جن کے احترام کا سورۂ طلاق میں سخت تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ حضرت عمر ابن خطابؓ کا قول ہے کہ جو شخص مجلس واحد میں تین طلاق دینے والا اُن کے پاس آتا، وہ اس کو مارتے تھے اور اس کے بعد زوجین کو جدا کر دیتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا انّہٗ قد عصیٰ ربّہٗ وبانت امرأتہٗ ۔ اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی، اور اس کی عورت اس سے جدا ہو گئی۔ حضرت علی فرماتے ہیں لو انّ النّاس اصابوا حدّ الطلاق ما ندم احد علیٰ امرأتہٖ۔ اگر لوگ طلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود کا لحاظ کرتے تو کسی شخص کو اپنی بیوی کے جدا ہونے پر نادم نہ ہونا پڑتا۔

طلاق میں اتنی رکاوٹیں ڈالنے کے بعد آخری اور سخت رکاوٹ یہ ڈالی گئی کہ جو شخص کسی عورت کو طلاق بائن دے چکا ہو وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ عورت ایک دوسرے شخص سے نکاح نہ کرلے اور وہ دوسرا مرد اس سے لطف اندوز ہو چکنے کے بعد برضا و رغبت اُسے طلاق نہ دے۔

فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ (بقرہ-۲۹)

پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ عورت ایک دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔

یہ ایسی کڑی شرط ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا اور اس وقت تک طلاق نہ دے گا جب تک وہ اس امر کا قطعی فیصلہ نہ کرلے گا کہ اسے اس عورت کے ساتھ نباہ کرنا نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس شرط سے بچنے کے لئے یہ حیلہ نکالا ہے کہ جس عورت

کو طلاق دینے کے بعد کوئی شخص نادم ہو اور اس سے پھر نکاح کرنا چاہے تو وہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کرادے اور پھر کچھ دے دلا کر اس کو خلوت سے پہلے طلاق دلوا دے۔ لیکن نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے صاف تصریح فرمادی ہے کہ تحلیل کے لئے نکاح تزویج کافی نہیں بلکہ عورت اس وقت تک پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے لطف صحبت نہ حاصل کرلے۔ لا تحل لزوجها الاول حتی یذوق الاخر عسیلتها و تذوق عسیلته۔ پھر جو شخص اپنی مطلقہ عورت کو اپنے لئے حلال کرنے کی خاطر کسی سے اس کا نکاح کرائے، اور جو اس غرض سے نکاح کرے، ان دونوں پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المحلل والمحلل له۔ (ترمذی)

خلع

شرع اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ کسی طرح نباہ نہیں سکتا اسے طلاق دے دے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گذر بسر نہ کر سکتی ہو اس سے خلع حاصل کرلے۔

اس باب میں احکام شریعت کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اخلاقی ہے اور دوسرا قانونی۔ اخلاقی پہلو تو یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کو طلاق یا خلع کا اختیار صرف ایک آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہیے نہ یہ کہ محض خواہشات کی تسکین کے لئے طلاق اور خلع کو کھیل بنا لیا جائے۔ چنانچہ احادیث میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات منقول ہیں کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الذَّوَاقِیْنَ وَالذَّوَاقَات۔ (اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا)

لعن اللہ کل ذوّاق مطلاق (ہر طالب لذت بکثرت طلاق دینے والے پر اللہ نے لعنت کی ہے)۔

ایما امرأۃ اختلعت من زوجھا بغیر نشوز فعلیھا لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین (جس کسی عورت نے اپنے شوہر سے نشوز کے بغیر خلع لیا اس پر اللہ اور ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت)

المختلعات ھن المنافقات (خلع کو کھیل بنا لینے والی عورتیں منافق ہیں)

لیکن قانون جس کا کام اشخاص کے حقوق متعین کرنا ہے اس پہلو سے بحث نہیں کرتا۔ وہ جس طرح مرد کو شوہر ہونے کی حیثیت سے طلاق کا حق دیتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے خلع کا

حق دیتا ہے تاکہ دونوں کے لئے بوقت ضرورت عقد نکاح سے آزادی حاصل کرنا ممکن ہو، اور کوئی فریق بھی ایسی حالت میں مبتلا نہ کر دیا جائے کہ دل میں نفرت ہے، مقاصد نکاح پورے نہیں ہوتے، رشتہ ازدواج ایک مصیبت بن گیا ہے، مگر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ محض اس لئے بندھے ہوئے ہیں کہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ رہا یہ سوال کہ دونوں میں سے کوئی فریق اپنے حق کو بے جا طور پر استعمال کرے گا، تو اس بارے میں قانون جہاں تک ممکن اور معقول ہے، پابندیاں عائد کر دیتا ہے، مگر حق کو بجا یا بیجا استعمال کرنے کا انحصار بڑی حد تک خود استعمال کرنے والے کے اختیار تمیزی اور اس کی دیانت اور خدا ترسی پر ہے۔ اس کے اور خدا کے سوا کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ محض طالب لذت ہے یا فی الواقع اس حق کے استعمال کی جائز حاجت رکھتا ہے۔ قانون اس کا فطری حق اسے دینے کے بعد اس کو بیجا استعمال سے روکنے کے لئے صرف ضروری پابندیاں اس پر عائد کر سکتا ہے۔ چنانچہ طلاق کی بحث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مرد کو عورت سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق دینے کے ساتھ اس پر متعدد قیود لگا دی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ جو مہر اس نے عورت کو دیا تھا اس کا نقصان گوارا کرے، زمانہ حیض میں طلاق نہ دے، تین طہروں میں ایک ایک طلاق دے، عورت کو زمانہ عدت میں اپنے ساتھ رکھے، اور جب تین طلاقیں دے چکے تو پھر وہ عورت تحلیل کے بغیر دوبارہ اس کے نکاح میں نہ آ سکے۔ اسی طرح عورت کو بھی خلع کا حق دینے کے ساتھ چند قیود عائد کر دی گئی ہیں جن کو قرآن مجید کی اس مختصر سی آیت میں تمام و کمال بیان کر دیا گیا ہے۔

خلع کی شرائط | وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَن يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (بقرہ-۲۹)

تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو وہ واپس لے لو الا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے، تو ایسی صورت میں جب کہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے

کچھ مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر (عقد نکاح سے آزادی حاصل کرلے)۔

اس آیت سے حسب ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں:-

۱۔ خلع ایسی حالت میں ہونا چاہیئے جبکہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو۔ فلاجناح علیھما کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ اگرچہ خلع ایک بری چیز ہے جس طرح کہ طلاق بُرا ہے لیکن جب یہ خوف ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو خلع لینے میں کوئی بُرائی نہیں۔

۲۔ جب عورت عقدۂ نکاح سے آزاد ہونا چاہے تو وہ بھی اسی طرح مال کی قربانی گوارا کرے جس طرح مرد کو اپنی خواہش سے طلاق دینے کی صورت میں گوارا کرنی پڑتی ہے۔ مرد اگر خود طلاق دے تو وہ اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا جو اس نے عورت کو دیا تھا، اور اگر عورت جدائی کی خواہش کرے تو وہ اس مال کا ایک حصہ یا پورا مال واپس کرکے جدا ہو سکتی ہے جو اس نے شوہر سے لیا تھا۔

۳۔ افتدار (یعنی معاوضہ دے کر رہائی حاصل کرنے) کے لئے محض فدیہ دینے والی کی خواہش کافی نہیں بلکہ اس معاملہ کا اتمام اس وقت ہوتا ہے جب کہ فدیہ لینے والا بھی راضی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ عورت محض ایک مقدار مال پیش کرکے آپ سے آپ علیحدہ نہیں ہو سکتی، بلکہ علیحدگی کے لئے ضروری ہے کہ جو مال وہ پیش کر رہی ہے، اس کو شوہر قبول کرلے۔

۴۔ خلع کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ عورت اپنا پورا مہر یا اس کا ایک حصہ پیش کرکے علیحدگی کا مطالبہ کرے اور مرد اس کو قبول کرکے طلاق دے دے۔ فلاجناح علیھما فیما افتدت بہ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ خلع کا فعل تراضی طرفین سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو خلع کے لئے قضائے قاضی کو شرط قرار دیتے ہیں۔

۵۔ اگر عورت فدیہ پیش کرے اور مرد قبول نہ کرے تو اس صورت میں اُن کی طرف رجوع کیا جائے گا جو خِفْتُمْ کے مخاطب ہیں، یعنی مسلمانوں کے اولی الامر اور چونکہ اولی الامر کا اولین فرض حدود اللہ کی

حفاظت ہے، اس لئے ان پر لازم ہوگا کہ جب حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف متحقق ہو جائے تو عورت کو اس کا وہ حق دلوا دیں جو انہی حدود کے تحفظ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا ہے۔

یہ مجمل احکام ہیں جن میں اس امر کی تصریح نہیں کہ "حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف" کن صورتوں میں متحقق ہوگا؛ فدیہ کی مقدار متعین کرنے میں انصاف کیا ہے؛ اور اگر عورت افتدا پر آمادہ ہو لیکن مرد قبول نہ کرے تو ایسی صورت میں قاضی کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؛ ان مسائل کی تفصیلات ہم کو خلع کے ان مقدمات کی روداد میں ملتی ہیں جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے سامنے پیش ہوئے تھے۔

صدر اول کے نظائر خلع کا سب سے زیادہ مشہور مقدمہ وہ ہے جس میں ثابت بن قیس سے ان کی بیوی نے خلع حاصل کیا ہے۔ اس مقدمہ کی روداد کے مختلف ٹکڑے مختلف احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن کو ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت سے ان کی دو بیویوں نے خلع حاصل کیا تھا۔ ایک بیوی جمیلہ بنت اُبی بن سلول (عبداللہ ابن اُبی کی بہن[1]) کا قصہ یہ ہے کہ انہیں ثابت کی صورت ناپسند تھی سانہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خلع کے لئے مرافعہ کیا، اور ان الفاظ میں اپنی شکایت بیان کی۔

یارسول اللہ لا یجمع راسی ورأسہ شیئ ابدًا انی رفعت جانب الخباء فرأیتہ اقبل فی عدۃ فاذا ھو اشدھم سوادًا واقصرھم قامۃ واقبحھم وجھًا۔ (ابن جریر)	یارسول اللہ میرے اور اس کے سر کو کوئی چیز کبھی جمع نہیں کر سکتی میں نے اپنا گھونگھٹ جو اٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کے ساتھ آرہا تھا میں نے دیکھا کہ وہ ان میں سب سے زیادہ کالا اور سب سے پستہ قد اور سب سے زیادہ بدشکل تھا۔
واللہ ما کرھت منہ دینًا ولا خلقًا الا انی کرھت دمامتہ (ابن جریر)	خدا کی قسم میں دین یا اخلاق کی کسی خرابی کے سبب اس کو ناپسند نہیں کرتی بلکہ مجھے اس کی بدصورتی ناپسند ہے

[1] بعض نے زینب بنت عبداللہ بن ابی کہا ہے مگر مشہور یہی ہے کہ ان کا نام جمیلہ تھا اور عبداللہ بن ابی کی بیٹی نہیں بلکہ بہن تھیں۔

واللہ لولا مخافۃ اللہ اذا دخل علی لبصقت فی وجھہ (ابن ماجہ)	خدا کی قسم اگر خوف خدا نہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آیا تھا اس وقت میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔
یا رسول اللہ بی من الجمال ما ترین وثابت رجل دمیم (عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری)	یا رسول اللہ میں جیسی خوبصورت ہوں آپ دیکھتے ہیں اور ثابت ایک بدصورت شخص ہے۔
وما اعتب علیہ فی خلق ولا دین ولکنی اکرہ الکفر فی الاسلام[1] (بخاری)	میں اس کے دین اور اخلاق پر کوئی حرف نہیں رکھتی مگر مجھے اسلام میں کفر کا خوف ہے۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ شکایت سنی اور فرمایا کہ اتردین علیہ حدیقتہ التی اعطاک جو باغ تجھ کو اس نے دیا تھا وہ تو واپس کر دے گی؟ انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ بلکہ وہ زیادہ چاہے تو زیادہ بھی دوں گی۔ حضور نے فرمایا اما الزیادۃ فلا ولکن حدیقتہ۔ زیادہ تو نہیں مگر تو اس کا باغ واپس کر دے۔ پھر ثابت کو حکم دیا کہ اقبل الحدیقۃ وطلقھا تطلیقۃ۔ باغ قبول کر لے اور اس کو ایک طلاق دے دے۔

ثابت کی ایک اور بیوی حبیبہ بنت سہل الانصاریہ تھیں جن کا واقعہ امام مالک اور ابو داؤد نے اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک روز صبح سویرے حضور کاشانۂ نبوی سے برآمد ہوئے تو حبیبہ کو کھڑا پایا۔ دریافت فرمایا کہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ لا انا ولا ثابت بن قیس (میری اور ثابت کی نہیں نبھ سکتی۔ جب ثابت حاضر ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ یہ حبیبہ بنت سہل ہے۔ اس نے بیان کیا جو کچھ اللہ نے چاہا کہ بیان کرے۔ حبیبہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جو کچھ ثابت نے مجھے دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے حضور نے ثابت کو حکم دیا کہ وہ لے لے اور اس کو چھوڑ دے۔ بعض روایتوں میں خل سبیلھا کے الفاظ ہیں اور بعض میں فارقھا۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ابو داؤد اور ابن جریر نے حضرت عائشہ سے

---

[1] اسلام میں کفر کے خوف سے مراد یہ ہے کہ کراہت و نفرت کے باوجود اگر میں اس کے ساتھ رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں ان احکام کی پابند نہ رہ سکوں گی جو شوہر کی اطاعت اور اس کی وفاداری اور عصمت و عفت کے تحفظ کے لیے اللہ اور رسول نے دیئے ہیں۔

اس واقعہ کو اس طرح روایت کیا ہے کہ ثابت نے حبیبہ کو اتنا مارا تھا کہ ان کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی حبیبہ نے آکر حضور سے شکایت کی آپ نے ثابت کو حکم دیا کہ خذ بعض مالها وفارقها، اس کے مال کا ایک حصہ لے لے اور جدا ہو جا۔ مگر ابن ماجہ نے حبیبہ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیبہ کو ثابت کے خلاف جو شکایت تھی وہ مار پیٹ کی نہ تھی بلکہ بدصورتی کی تھی چنانچہ انہوں نے وہی الفاظ کہے جو دوسری احادیث میں جمیلہ سے منقول ہیں۔ یعنی اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا تو میں ثابت کے منہ پر تھوک دیتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت اور مرد کا مقدمہ پیش ہوا۔ آپ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عورت نے قبول نہ کیا۔ اس پر آپ نے اُسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ تین دن قید رکھنے کے بعد آپ نے اُسے نکالا اور پوچھا کہ تیرا کیا حال رہا۔ اس نے کہا خدا کی قسم مجھ کو انہی تین راتوں میں راحت نصیب ہوئی ہے یہ سن کر حضرت عمر نے اس کے شوہر کو حکم دیا کہ اخلعها ولو من قرطها۔ اس کو خلع دے دے خواہ وہ اس کے کان کی بالیوں کے عوض ہی میں ہو (کشف الغمہ ج ۲)

ربیع بنت معوذ بن عفراء نے اپنے شوہر سے اپنی تمام املاک کے معاوضہ میں خلع حاصل کرنا چاہا۔ شوہر نے نہ مانا۔ حضرت عثمان کے پاس مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عثمان نے اس کو حکم دیا کہ اس کی چوٹی کا موباف تک لے لے اور اس کو خلع دے دے فَاَجَازَهٗ وَاَمَرَهٗ بِاَخْذِ عِقَاصِ رَأْسِهَا فَمَادُوْنَهٗ۔ (عبدالرزاق)۔

احکام خلع | ان روایات سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:۔

(۱) فان خِفْتُم الا یقیما حدود اللّٰہِ کی تفسیر وہ شکایات ہیں جو ثابت بن قیس کی بیویوں سے منقول ہیں۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کی اس شکایت کو خلع کے لئے کافی سمجھا کہ ان کا شوہر بدصورت ہے اور وہ ان کو پسند نہیں۔ آپ نے ان کو خوبصورتی اور بدصورتی کے فلسفہ پر کوئی لکچر نہیں دیا۔

کیونکہ آپ کی نظر شریعت کے مقاصد پر تھی۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا کہ ان عورتوں کے دل میں شوہر کی طرف سے نفرت و کراہیت بیٹھ چکی ہے تو آپ نے ان کی درخواست کو قبول فرمالیا، کیونکہ نفرت و کراہیت کے ساتھ ایک عورت اور مرد کو جبراً ایک دوسرے سے باندھ رکھنے کے نتائج، دین اور اخلاق اور تمدن کے لئے طلاق و خلع سے زیادہ خراب ہیں اور ان سے مقاصد شریعت فوت ہونے کا خوف ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ خلع کا حکم نافذ کرنے کے لئے محض اس بات کا محقق ہو جانا کافی ہے کہ عورت اپنے شوہر کو ناپسند کرتی ہے اور اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

۲۔ حضرت عمر کے فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ نفرت و کراہیت کی تحقیق کے لئے قاضی شرع کوئی مناسب تدبیر اختیار کر سکتا ہے تاکہ کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے اور بالیقین معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں میں اب نباہ ہونا متوقع نہیں ہے۔

۳۔ حضرت عمر کے فعل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نفرت و کراہیت کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری نہیں، اور یہ ایک معقول بات ہے، عورت کو اپنے شوہر سے بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر نفرت ہو سکتی ہے جن کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے اسباب بھی نفرت کے ہو سکتے ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو سننے والا نفرت کے لئے کافی نہ سمجھے گا، لیکن جس کو ان اسباب سے رات دن سابقہ پیش آتا ہے اس کے دل میں نفرت پیدا کرنے کے لئے وہ کافی ہوتے ہیں۔ لہٰذا قاضی کا کام صرف اس واقعہ کی تحقیق کرنا ہے کہ عورت کے دل میں شوہر سے نفرت پیدا ہو چکی ہے۔

۴۔ قاضی عورت کو وعظ و پند کر کے شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے راضی کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے، مگر اس کی خواہش کے خلاف اسے مجبور نہیں کر سکتا، کیونکہ خلع اس کا حق ہے جو خدا نے اس کو دیا ہے، اور اگر وہ اس امر کا اندیشہ ظاہر کرتی ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے میں وہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکے گی تو کسی کو اس سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ تو چاہے حدود اللہ کو توڑ دے مگر اس خاص مرد کے

ساتھ بہرحال تجھ کو رہنا پڑے گا۔

۵۔ خلع کے مسئلہ میں دراصل یہ سوال قاضی شرع کے لئے تنقیح طلب ہی نہیں ہے کہ عورت آیا جائز ضرورت کی بنا پر طالب خلع ہے یا محض نفسانی خواہشات کے لئے علیحدگی چاہتی ہے۔ اسی لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے قاضی کی حیثیت سے جب مقدمات خلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظرانداز کر دیا کیونکہ اوّل تو اس سوال کی کما حقہٗ تحقیق کرنا کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دوسرے خلع کا حق عورت کے لئے اُس حق کے مقابلہ میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے۔ ذوالقیت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے مگر مرد کے حق طلاق کو قانون میں اس قید کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذوالقیت کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ پس جہاں تک قانونی حق کا تعلق ہے، عورت کے حق خلع کو بھی کسی اخلاقی قید سے مقید نہ ہونا چاہیئے۔ رہی تیسری بات یہ ہے کہ کوئی طالب خلع عورت دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ یا وہ فی الحقیقت خلع کی جائز ضرورت رکھتی ہوگی یا محض ذوالقیت ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اس کے مطالبہ کو رد کرنا ظلم ہوگا۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو اس کو خلع نہ دلوانے سے شریعت کے اہم مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ جو عورت طبعاً ذوالقیت ہے وہ تو اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر کر کے رہے گی۔ اگر آپ اس کو جائز طریقے سے ایسا نہ کرنے دیں گے تو وہ ناجائز طریقوں سے اپنی فطرت کے داعیات کو پورا کرے گی اور یہ زیادہ برا ہوگا۔ ایک عورت کا پچاس شوہروں کو یکے بعد دیگرے بدلنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے قید نکاح میں رہتے ہوئے ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے۔

۶۔ اگر عورت خلع مانگے اور شوہر اس پر راضی نہ ہو تو قاضی اس کو حکم دے گا کہ اسے چھوڑ دے۔ تمام روایات میں یہی آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے ایسی صورتوں میں مال قبول کر کے عورت کو چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے اور قاضی کا حکم بہرحال یہی معنے رکھتا ہے کہ محکوم علیہ اس کے امتثال کا پابند ہے، حتّٰی کہ اگر وہ امتثال نہ کرے تو قاضی اس کو حبس کر سکتا ہے۔ شریعت میں قاضی

کی حیثیت صرف ایک مشیر کی نہیں ہے کہ اس کا حکم محض مشورہ کے درجہ میں ہو اور محکوم علیہ کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہو۔

۷۔ خلع کا حکم نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے مطابق ایک طلاق بائن کا ہے، یعنی اس کے بعد زمانہ عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہوگا۔ کیونکہ حق رجوع باقی رہنے سے خلع کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے نیز چونکہ عورت نے جو مال اس کو دیا ہے وہ عقد نکاح سے اپنی رہائی کے معاوضہ میں دیا ہے، اس لئے اگر شوہر معاوضہ لے لے اور اس کو رہائی نہ دے تو یہ فریب اور دغا ہوگی جس کو شریعت جائز نہیں رکھ سکتی۔ ہاں اگر عورت دوبارہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ اس قسم کی طلاق ہے جسکے بعد دوبارہ نکاح کرنے کے لئے تحلیل شرط نہیں ہے۔

۸۔ خلع کے معاوضہ کی تعیین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ جتنے معاوضہ پر بھی زوجین راضی ہو جائیں، اس پر خلع ہو سکتا ہے۔ لیکن نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہ فرمایا کہ شوہر خلع کے معاوضہ میں اپنے دیئے ہوئے مہر سے زیادہ مال لے۔ آپ کا ارشاد ہے لا یاخذ الرجل من المختلعۃ اکثر مما اعطاھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی بالفاظ صریح اس کو مکروہ فرمایا ہے۔ ائمہ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے بلکہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم کی وجہ سے خلع کا مطالبہ کرے تو شوہر کے لئے سرے سے مال ہی لینا مکروہ ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے وان کان النشوز من قبلہ یکرہ لہ ان یاخذ منھا عوضاً۔ اس باب میں اصول شرع کے ماتحت یہ ضابطہ بنایا جا سکتا ہے کہ اگر خلع مانگنے والی عورت اپنے شوہر کا نشوز ثابت کر دے، یا خلع کے لئے ایسے وجوہ ظاہر کرے جو قاضی کے نزدیک معقول ہوں تو اس کو مہر کے ایک قلیل جز یا نصف کی واپسی پر خلع دلایا جائے اور اگر وہ نہ شوہر کا نشوز ثابت کرے، نہ کوئی معقول وجہ ظاہر کرے تو اس کے لئے پورا مہر یا اس کا ایک بڑا حصہ واپس کرنا ضروری قرار دیا جائے۔ اگر اس کے رویے میں قاضی کو ذوالقعدیت کے آثار نظر آئیں تو قاضی سزا کے طور پر اس کو مہر سے بھی کچھ

زیادہ دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔

مسئلہ خلع میں ایک بنیادی غلطی | خلع کی اس بحث سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ قانون اسلامی میں عورت اور مرد کے حقوق کے درمیان کس قدر صحیح توازن قائم کیا گیا تھا۔ اب یہ ہماری اپنی غلطی ہے کہ ہم نے اپنی عورتوں سے خلع کے حق کو عملاً سلب کر لیا، اور اصول شرع کے خلاف، عقدۂ نکاح کو کلیتہً مردوں کی خواہش پر منحصر ٹھیرا دیا۔ اس سے عورتوں کی جو حق تلفیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں ان کی ذمہ داری خدا اور رسول کے قانون پر قطعاً نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اس قانون کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر اب بھی عورتوں کے اس حق کا استقرار ہو جائے تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی جو ہمارے ازدواجی معاملات میں پیدا ہو گئی ہیں، بلکہ گتھیوں کا پیدا ہونا ہی بند ہو جائے گا۔

عورت سے خلع کے حق کو جس چیز نے عملاً بالکل سلب کر لیا ہے وہ یہ غلط خیال ہے کہ شارع نے خلع کا معاملہ کلیتہً زن و شوہر کے درمیان رکھا ہے اور اس میں مداخلت کرنا قاضی کے حدود اختیار سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خلع دینا یا نہ دینا بالکل مرد کی مرضی پر موقوف ہو گیا ہے۔ اگر عورت خلع حاصل کرنا چاہے اور مرد اپنی شرارت یا خود غرضی سے نہ دینا چاہے تو عورت کے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ لیکن یہ بات شارع کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ شارع کا یہ منشاء ہرگز نہ تھا کہ معاملۂ نکاح کے ایک فریق کو بالکل بے بس کر کے دوسرے فریق کے ہاتھ میں دے دے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بلند اخلاقی و تمدنی مقاصد فوت ہو جاتے جو اس نے مناکحت کے ساتھ وابستہ کئے ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے اسلامی شریعت میں قانون ازدواج کی بنا ہی اس اصل پر رکھی گئی ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق جب تک پاکیزگی اخلاق اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہ سکتا ہو اس کا استحکام مستحسن اور ضروری ہے اور اس کو توڑنا یا تڑوانے کی کوشش کرنا سخت نامحمود ہے، اور جب یہ تعلق دونوں کے لئے یا دونوں میں سے کسی ایک

کے لئے اخلاق کی خرابی کا سبب بن جائے، یا اس میں مودت و رحمت کی جگہ نفرت و کراہیت داخل ہو جائے تو پھر اس کا توڑ دینا ضروری ہے، اور اس کا باقی رہنا اغراض شریعت کے خلاف ہے۔ اس اصل کے ماتحت شریعت نے معاملۂ نکاح کے دونوں فریقوں کو ایک ایک قانونی آلہ ایسا دیا ہے جس سے وہ عقدۂ نکاح کے ناقابل برداشت ہو جانے کی صورت میں حلِّ عقد کا کام لے سکتے ہیں۔ مرد کے قانونی آلہ کا نام طلاق ہے جس کے استعمال میں اُسے آزادانہ اختیار دیا گیا ہے۔ اور اس کے بالمقابل عورت کے قانونی آلہ کا نام خلع ہے جس کے استعمال کی صورت یہ رکھی گئی ہے کہ جب وہ عقدۂ نکاح کو توڑنا چاہے تو پہلے مرد سے اس کا مطالبہ کرے، اور اگر مرد اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کر دے تو پھر قاضی سے مدد لے۔ زوجین کے حقوق میں توازن اسی طرح قائم رہ سکتا تھا، اور خدا و رسول نے درحقیقت یہی توازن قائم کیا تھا۔ مگر قاضی کے اختیار سماعت کو درمیان سے خارج کر کے یہ توازن بگاڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ قانونی آلہ جو عورت کو دیا گیا تھا قطعاً بے کار ہو گیا، اور عملاً قانون کی صورت بگڑ کر یہ ہو گئی کہ اگر مرد کو ازدواجی تعلق میں حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو یا یہ تعلق اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے تو وہ اسے قطع کر سکتا ہے، لیکن اگر یہی خوف عورت کو ہو یا ازدواجی تعلق اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے تو اس کے پاس اس تعلق کو قطع کرانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تاوقتیکہ مرد ہی اس کو آزاد نہ کر دے وہ مجبور ہے کہ بہرحال اس تعلق میں بندھی رہے، خواہ حدود اللہ پر قائم رہنا اس کے لئے محال ہی کیوں نہ ہو جائے اور مناکحت کے شرعی مقاصد بالکل ہی کیوں نہ فوت ہو جائیں۔ کیا کسی میں اتنی جسارت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت پر اتنی کھلی ہوئی بے انصافی کا الزام عائد کر سکے؟

مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات قرآن مجید کی جس آیت میں خلع کا قانون بیان کیا گیا ہے اس کو پھر بڑھیے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ اگر تم کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۔ تو ان دونوں پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ (یعنی عورت) کچھ فدیہ دے کر (علیحدگی حاصل کرلے)۔

اس آیت میں زوجین کا ذکر تو غائب کے صیغوں سے کیا گیا ہے، لہذا لفظ خِفْتُمْ کے مخاطب وہ نہیں ہو سکتے۔ اب لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اور حکم الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اگر خلع پر زوجین میں تراضی حاصل نہ ہو تو اولی الامر کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کی تصدیق اُن احادیث سے ہوتی ہے جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے پاس خلع کے دعوے لے کر عورتوں کا آنا اور آپ کا ان کی سماعت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ جب زوجین میں تراضی حاصل نہ ہو تو عورت کو قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اب اگر فی الواقع قاضی کا فیصلہ اس معاملہ میں بے اثر ہو اور مرد کے راضی نہ ہونے کی صورت میں قاضی اس سے اپنا فیصلہ منوانے کا اقتدار نہ رکھتا ہو تو قاضی کو مرجع قرار دینا سرے سے فضول ہی ہوگا، کیونکہ اس کے پاس جانے کا نتیجہ بھی وہی ہے جو نہ جانے کا ہے۔ لیکن کیا احادیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قاضی اس معاملہ میں بے اختیار ہے؟ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جتنے فیصلے اوپر منقول ہوئے ہیں ان سب میں یا تو صیغۂ امر آیا ہے جیسے طَلِّقْهَا اور فَارِقْهَا اور خَلِّ سَبِيلَهَا۔ یا یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے مرد کو حکم دیا کہ ایسا کرے۔ ابن جریر نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ تو یہ ہیں کہ فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا (پھر آپ نے ان کو جدا کر دیا) اور یہی الفاظ اس روایت میں بھی ہیں جو خود جمیلہ بنت اُبی بن سلول سے منقول ہے۔ اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ قاضی خلع کے معاملہ میں حکم دینے کا مجاز نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اگر شوہر اس حکم کو محض مشورہ سمجھ کر ماننے سے انکار کر دے تو کیا قاضی اس سے جبراً اپنا حکم منوا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عہد میں ایسی تو کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی کہ آپ نے کوئی فیصلہ صادر کیا ہو اور کسی نے اس سے

سرتابی کی جرأت کی ہو، لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اُس فیصلہ پر ہم قیاس کر سکتے ہیں جس میں آپ نے ایک ہیکڑ شوہر سے فرمایا تھا کہ لَسْتَ بِبارِحٍ حتّٰی ترضیٰ بِمثل ما رضیتْ بِہٖ۔ یعنی تجھے نہ چھوڑا جائے گا جب تک تو بھی اُسی طرح حکمین کا فیصلہ قبول کرنے پر راضی نہ ہو جس طرح عورت راضی ہوئی ہے۔ اگر قاضی ایک شوہر کو حکمین کے فیصلہ پر سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کرنے پر حراست میں رکھ سکتا ہے تو وہ خود اپنا فیصلہ منوانے کے لئے تو بدرجہ اولیٰ قوت استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے تمام معاملات میں سے صرف خلع ہی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہو جسے قاضی کے اس حق سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ فقہ کی کتابوں میں متعدد جزئیات ایسے ملتے ہیں جن میں قاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر شوہر اس کے حکم سے طلاق نہ دے تو قاضی خود تفریق کرا دے۔ پھر کیوں نہ خلع کے مسئلہ میں بھی قاضی کو یہ اختیار حاصل ہو؟

آگے چل کر جو مباحث بیان ہوں گے ان سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جائے گی کہ عنین اور مجبوب اور خصی اور جذامی اور مبرص اور مجنون شوہروں کے مسئلہ میں فقہائے کرام نے جو ضوابط بیان کئے ہیں، اور اسی طرح خیار بلوغ اور بعض دوسرے مسائل میں جو اجتہادی قوانین مقرر کئے گئے ہیں ان کی موجودگی میں تو نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ عورتوں کو خلع دلانے کے پورے اختیارات عدالتوں کو حاصل ہوں، ورنہ جو عورتیں ایسے حالات میں گرفتار ہو جائیں ان کے لئے بجز اس کے اور کوئی صورت ہی نہیں کہ یا تو وہ تمام عمر مصیبت کی زندگی بسر کریں، یا اپنے داعیات نفس سے مجبور ہو کر فواحش میں مبتلا ہو جائیں، یا مجبوراً مرتد ہو کر قید نکاح سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ توضیح مدعا کے لئے ہم یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

عنین کے معاملہ میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی۔ اگر علاج کے بعد وہ ایک مرتبہ بھی ہمبستری پر قادر ہو گیا حتیٰ کہ اگر ایک مرتبہ اس نے ادھوری مباشرت

بھی کرلی[1] تو عورت کو فسخ نکاح کا حق نہیں بلکہ یہ حق ہمیشہ کے لئے باطل ہوگیا۔ اگر عورت کو نکاح سے پہلے یہ معلوم تھا کہ وہ عنین ہے تو اس کو سرے سے قاضی کے پاس دعوے لے جانے کا حق ہی نہیں[2] بالکل اس نے نکاح کے بعد ایک مرتبہ مباشرت کی اور پھر عنین ہوگیا تب بھی عورت کو دعوے کا حق نہیں[3]۔ اگر عورت نے شوہر کے عنین ہونے کا علم حاصل ہونے کے بعد اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تب بھی وہ ہمیشہ کے لئے خیار فسخ سے محروم ہوگئی[4]۔ ان صورتوں میں عورت کا خیار فسخ تو یوں باطل ہو ہوگیا اس کے بعد ایسے ناکارہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خلع حاصل کرے۔ مگر وہ اس کو مل نہیں سکتا کیونکہ شوہر سے مطالبہ کرتی ہے تو وہ اس کا پورا مہر بلکہ مہر سے کچھ زائد لے کر بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا اور عدالت سے رجوع کرتی ہے تو وہ اس کو مجبور کرکے طلاق دلوانے یا تفریق کرنے سے انکار کردیتی ہے۔ اب غور کیجئے کہ اس غریب عورت کا حشر کیا ہوگا؟ بس یہی نا کہ یا تو وہ عیسائی راہبات کی طرح نفس کشی کی زندگی بسر کرے اور اپنے نفس پر روح فرسا تکلیفیں برداشت کرے، یا قید نکاح میں رہ کر اخلاقی فواحش میں مبتلا ہو، یا پھر سرے سے دین اسلام ہی کو خیرباد کہہ دے۔ مگر کیا اسلامی قانون کا منشا بھی یہی ہے کہ کوئی عورت ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو؟ کیا ایسے ازدواجی تعلق سے شریعت کے وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کے لئے قانون ازدواج بنایا گیا ہے؟ کیا ایسے زوجین میں مودت و رحمت ہوگی؟ کیا وہ باہم مل کر تمدن

---

[1] فی درر المختار عن المعراج اذا اولج الحشفة فقط فلیس بعنین وان کان مقطوعها فالابد من جرثقیلة (ایلاء الذکر)

[2] فی العالمگیریه ان علمت المرأة وقت النکاح انه عنین لا یصل الی النساء لا یکون لها حق الخصومة

[3] فی الدر المختار فلو وجب بعد وصوله الیها مرة او صار عنینا بعده ای الوصول لا یفرق لحصول حقها بالوطی مرة۔

[4] قال الشامی قوله لم یبطل ای ما لم تقل رضیت بالمقام معه۔

کی کوئی مفید خدمت کر سکیں گے ؟ کیا ان کے گھر میں خوشی اور راحت کے فرشتے کبھی داخل ہو سکیں گے ؟ کیا یہ قید نکاح کسی حیثیت سے بھی احصان کی تعریف میں آسکے گی، اور اس سے دین اور اخلاق اور عفت کا تحفظ ہو گا ؟ اگر نہیں تو بتایا جائے کہ ایک بے گناہ عورت کی زندگی برباد ہونے یا مجبوراً اس کے فواحش میں مبتلا ہو جانے، یا دائرۂ دین سے نکل جانے کا وبال کس کے سر ہو گا ؟ خدا اور رسول تو یقیناً بری الذمہ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے قانون میں کوئی نقص نہیں چھوڑا ہے۔

قضاءِ شرعی

طلاق اور خلع کی بحث میں قانون اسلامی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ قانون اس قاعدۂ کلیہ پر وضع کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق اگر قائم رہے تو حدود اللہ کی حفاظت اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہے جس کو قرآن میں امساک بالمعروف کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اگر اس طرح ان کا باہم مل کر رہنا ممکن نہ ہو تو تسریح باحسان ہونا چاہیے؛ یعنی جو میاں بیوی سیدھی طرح مل کر نہ رہ سکتے ہوں وہ سیدھی طرح الگ ہو جائیں اور ایسی صورتیں پیدا نہ ہونے پائیں کہ ان کے اختلاف سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی تلخ ہو بلکہ خاندانوں میں فتنے برپا ہوں سوسائٹی میں گندگی پھیلے، اخلاقی مفاسد کی اشاعت ہو اور آئندہ نسلوں تک ان کے برے اثرات متعدی ہو جائیں۔ انہی خرابیوں کا سدباب کرنے کے لیے شریعت نے مرد کو طلاق اور عورت کو خلع کا حق دیا ہے تاکہ اگر وہ چاہیں تو خود تسریح باحسان کے اصول پر عمل کر سکیں۔ لیکن بہت سی ایسی جھگڑالو طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جو نہ امساک بالمعروف پر عمل کر سکتی ہیں اور نہ تسریح باحسان پر آمادہ ہوتی ہیں، نیز ازدواجی معاشرت میں ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں جن میں زوجین کے درمیان یا تو حقوق کے باب میں اختلاف واقع ہوتا ہے یا امساک بالمعروف اور تسریح باحسان دونوں پر عمل کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے شریعت نے طلاق اور خلع کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی حقوق کے تصفیہ اور حدود کی حفاظت کے لیے مقرر کر دیا ہے جس کا نام قضاءِ شرعی ہے۔

قبل اس کے کہ ان مسائل کو بیان کیا جائے جو قضائے شرعی سے تعلق رکھتے ہیں چند اصولی مباحث کی تو ضیح ضروری ہے۔

قضاء کے لئے اولین شرط | قضاء شرعی کی جو شرائط تفصیل کے ساتھ کتب فقہ میں مذکور ہیں، ان میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ قاضی لازماً مسلمان ہونا چاہیئے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جس کو فقہانے تصریح بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اصول شرع کے تحت شرعی معاملات میں مسلمانوں پر غیر مسلم حاکم کا حکم خواہ ظاہراً نافذ ہو جائے مگر باطناً نافذ نہیں ہو سکتا، مثلاً اگر ایک غیر مسلم حاکم ایک مسلمان کا نکاح فسخ کرے تو خواہ اس کا یہ حکم، احکام شرع کے مطابق ہی کیوں نہ ہو اور زوجین میں عملاً تفریق ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن درحقیقت نہ اس کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہوگا اور نہ شرعاً عورت کے لئے دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ اگر وہ نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہوگا اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں اس کی اولاد ناجائز ہوگی ۔ قرآن غیر اسلامی عدالت اور غیر مسلم حاکم کے فیصلہ کو اوّل تو اصولاً ہی تسلیم نہیں کرتا ۔ پھر مسلمانوں کے معاملہ میں خصوصاً اُس کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ اُن پر غیر مسلم کا حکم اللہ کے نزدیک مسلّم نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی پوری توضیح میں اپنے مضمون "ایک نہایت اہم استفتاء" میں کر چکا ہوں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جن مسائل کا تصفیہ قاضی کے فیصلہ پر چھوڑا گیا ہے ان کے لئے اگرچہ شریعت میں مفصل قوانین موجود ہیں لیکن شخصی معاملات میں ہر مقدمہ کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر ان قوانین کی صحیح تعبیر، تنفیذ اور اصول قانون سے حسب موقع جزئیات کا استنباط، اور روح قانون کے مطابق فصل خصومات کے جملہ شرائط کا لحاظ، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ قاضی میں قوت اجتہاد اور اس کے ساتھ اعتقاداً اس قانون کا احترام بھی موجود ہو جس کو نافذ کرنے کے لئے وہ منصب قضاء پر مامور ہوا ہے، اور یہ دونوں باتیں اُسی شخص میں متحقق ہو سکتی ہیں جو مذہباً مسلمان ہو، اسلامی قانون کے اصول و فروع پر حاوی ہو، اس کی سپرٹ کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ اس کے اصل مآخذ پر دست رس رکھتا ہو، اور مسلم سوسائٹی کے نظام ترکیبی سے اندرونی طور پر بھی واقف ہو۔ ایک غیر مسلم جج میں ان صفات کا پایا جانا کسی طرح ممکن نہیں اور اس وجہ سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ مسلمانوں کے شرعی معاملات کا صحیح فیصلہ کر سکے گا۔

ہندوستان میں قضاء شرعی نہ ہونے کے نقصانات

ہندوستان[1] میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۴ء تک مسلمانوں کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے جن کا انتخاب علماء کے گروہ میں سے کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد منصب قضاء منسوخ کر دیا گیا، اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزی عدالتوں کے حدود اختیار میں داخل کر دیئے گئے۔ اس کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اصول شریعت کے مطابق جس چیز پر قضائے شرعی کا اطلاق ہوتا ہے وہ قریب قریب بالکلیہ مفقود ہو گئی، اور مسلمانوں کے لئے اپنے شرعی معاملات میں ان عدالتوں سے ایسا فیصلہ حاصل کرنا غیر ممکن ہو گیا جو ان کے مذہب کی رو سے جائز شرعی فیصلہ کہا جا سکتا ہو۔ دوسرا نقصان (جو اہمیت میں پہلے نقصان سے کسی طرح کم نہیں) یہ ہے کہ ان عدالتوں کے پاس نہ وہ ذرائع ہیں جن سے وہ قانون اسلامی کے اصول و فروع پر اتنی وسیع نظر بہم پہنچا سکتے ہوں کہ ان میں صحیح قوت اجتہاد پیدا ہو جائے۔ اور نہ ان کے دل میں اس قانون کا اتنا احترام موجود ہوتا ہے کہ اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو تامل ہو۔ ان کے علم کا مدار جن کتابوں پر ہے وہ ایسے مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جو عربی سے ناواقف تھے قانون کے اصلی ماخذ سے بے بہرہ تھے اور اصطلاحات قانون تک کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے، مثلاً ہملٹن (Hamilton) جس نے ایک فارسی شرح کی مدد سے ہدایہ کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ وہ غریب ہدایہ کو سمجھنے کی قابلیت ہی نہ رکھتا تھا، اور فقہ کی معمولی اصطلاحات میں بھی اس نے اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ اکثر مقامات پر اصل ہدایہ کی طرف رجوع کئے بغیر اس کی عبارت سمجھ میں نہیں آسکتی اور بیلی (Baillie) جس کا (Digest of Mohammadan Law) فتاوی عالمگیری کے اقتباسات کے ترجمہ سے ماخوذ ہے۔ اور میکناٹن (Macnaghton) جس کی کتاب (Principles of Mohammadan Law) ناقص معلومات اور اس پر ناقص فہم و تعبیر کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ انگریزی عدالتیں خود اپنے دائرہ معلومات کی اس تنگی کا اعتراف کرتی ہیں، چنانچہ

---

[1] یہاں اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ میں اصولاً اُس قضاء شرعی کی صحت کا معتقد نہیں ہوں جو غیر اسلامی حکومت کے اذن سے قائم ہو۔ مگر یہاں بر سبیل تنزل وہ صورت بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے اسلامی حکومت قائم ہونے تک (باقی بر صفحہ ۳۱۳)

جسٹس مارکبی[1] ایک مقدمہ کے فیصلہ میں لکھتا ہے :-

"شرع اسلام کو معلوم کرنے کے جو ذرائع عدالت کو حاصل ہیں وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں .... کہ میں اس سے تعلق رکھنے والے مسائل کے تصفیہ سے بچنے کے ہر طریقہ کو اختیار کرنے پر بخوشی آمادہ ہوں۔"

مگر ایسی محدود معلومات کے ساتھ یہ عدالتیں اسلامی قانون میں اجتہاد کرنے کی جرأت کرتی ہیں اور اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا کیونکہ نہ اس قانون کا احترام ان کے عقائد میں داخل ہے، اور نہ حکومت مستطہ کے نظام عدلیہ کی طرف سے ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قانون کے حدود سے تجاوز نہ کر سکیں۔ ایک مقدمہ[2] کے فیصلہ میں چیف جسٹس گارتھ نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ ان عدالتوں کی صحیح پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں :

"قانون اسلام جس کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے اور جو قدیم کتابوں میں مندرج ہے اب سے صدیوں پہلے بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک میں جاری ہوا تھا جن کے قانونی اور تمدنی حالات ہندوستان کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اگرچہ ہم ایسے مقدمات میں جو مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں، حتی الامکان احکام شرع اسلامی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اصل تو یہی معلوم کرنا مشکل ہے کہ دراصل وہ احکام کیا تھے، پھر ان اختلافات میں توفیق دینا بھی مشکل ہے جو اکابر مجتہدین یعنی امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے درمیان بکثرت پیش آئے ہیں۔ اس لئے امکانی حد تک ہمیں اس صحیح اصول کو دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس پر کوئی حکم مبنی ہو، اور پھر قواعد انصاف، نیک نیتی اور دوسرے ملکی قوانین اور تمدنی حالات کو پیش نظر رکھ کر اسے نافذ کرنا چاہیے۔"

---

[1] خواجہ حسین بنام شہزادی ہزاری بیگم۔ [2] ملک عبدالغفور بنام ملیکا۔

(بقیہ صفحہ ۵۲) ہندوستانی مسلمانوں کے شرعی معاملات بدرجہ آخر درست ہو سکتے ہیں۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک حاکم عدالت جو اسلامی قوانین سے اپنی ناواقفیت کا معترف ہے اور اختلافات ائمہ میں توفیق دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، وہ اسلامی قوانین میں اس ناقص علم کے ساتھ اجتہاد سے کام لینے کو علانیہ جائز ٹھیراتا ہے، اور اُسے ایک عدالتی فیصلہ میں یہ بات ظاہر کرتے ہوئے کوئی تامل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں پر اسلامی قانون کو نافذ کرنے میں صرف اسلامی قانون ہی کے حدود کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسرے قوانین ملکی اور تمدنی حالات، اور قواعد انصاف کے متعلق خود اپنے نظریات کا لحاظ کرنا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ یہ اسی اجتہاد بلا ایمان و علم کا نتیجہ ہے کہ جواد حسین کا ناقص قانون محمڈن لا کے نام سے ہمارے ملک کی عدالتوں میں متداول ہے اس کا بھی ٹھیک ٹھیک نفاذ ہمارے شرعی معاملات میں نہیں ہوتا اور عدالتی فیصلوں سے اُس کی صورت روز بروز مسخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اصلاح کی راہ میں پہلا قدم | پس معاملات نکاح و طلاق اور دوسرے شرعی معاملات میں صحیح فیصلے حاصل کرنے کی کم سے کم اگر کوئی صورت ہے تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ملک میں تہذیبی خود اختیاری (Cultural autonomy) حاصل ہو جس کے ماتحت مسلمان اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے خود اپنے محاکم شرعیہ قائم کرنے کے مجاز ہوں، اور ان محکموں میں ایسے متقی علماء قاضی کی حیثیت سے مقرر کئے جائیں جو قانون شریعت میں فقیہانہ بصیرت رکھتے ہوں۔ یہ ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر حقیقت میں مسلمانوں کے لئے مسلمان رہنے کی حیثیت سے یہاں زندگی بسر کرنا محال ہے۔ اور اگر یہ چیز بھی انہیں حاصل نہ ہو تو بہ سبیل تنزل اتنا ہی (اور یہ انتہائی مجبوری کی حالت میں آخری صورت ہے) کہ مذہب مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچائت مقرر کی جائے جس کے ارکان پر عموماً اس ضلع کے مسلمانوں کو اعتماد ہو اور جن میں سے کم از کم ایک رکن مستند عالم دین ہو۔ پھر حکومت متسلطہ پر دباؤ ڈال کر اُس سے اس پنچایتی نظام کو تسلیم کرایا جائے اور اس سے یہ منوا لیا جائے کہ مسلمانوں کے معاملات نکاح و طلاق وغیرہ میں پنچائت کے فیصلوں کی حیثیت عدالتی فیصلوں کی سی ہوگی، اور انگریزی عدالتوں میں اُن کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی

اور خود انگریزی عدالتوں میں جو مقدمات نکاح وطلاق وغیرہ پیش ہوں گے، اُن کو بھی پنچایتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔ برٹش انڈیا کے علاوہ غیر مسلم ریاستوں، اور ان مسلمان ریاستوں میں بھی جنہوں نے انگریزی حکومت کی تقلید میں قضائے شرعی کو موقوف کر کے شرعی معاملات کو عام دیوانی عدالتوں کے دائرہ سماعت میں داخل کر دیا ہے، اصلاح معاملات کے لئے سب سے پہلے یہی کوشش ہونی چاہئے کہ یا تو قضائے شرعی کا بندوبست کیا جائے، یا پھر پنچایتی سسٹم قائم کر کے اس کو ان ریاستوں سے تسلیم کرایا جائے۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو مجالس وضع قوانین میں کسی مسودۂ قانون کو پیش اور پاس کر لینا اسلامی اغراض کے لئے ہرگز سودمند نہ ہوگا۔

ایک جدید مجموعہ قوانین کی ضرورت انتظام قضا شرعی کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے، اور وہ ایک ایسے کتابچہ کی تدوین ہے جس میں مسلمانوں کے شرعی معاملات کے متعلق فقہی احکام کو دفعات کی شکل میں تشریحات سمیت مرتب کر دیا جائے، تاکہ محاکم شرعیہ یا پنچایتوں میں موجودہ انگریزی ممڈن لا کی جگہ اس کو رواج دیا جا سکے۔ مصر میں جب (Mixed tribunals) قائم کئے گئے تھے تو وہاں بھی ایسے ایک مجموعہ قوانین (Code) کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جس میں نہایت مستند ماخذ سے تمام ضروری قوانین یکجا مرتب کر دیئے گئے ہوں، چنانچہ حکومت مصر کے ایما سے قدری پاشا کی صدارت میں علماء ازہر کی مجلس نے اس کام کو انجام دیا، اور اس مجلس کے مرتب کئے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے عدالتوں میں رائج کیا گیا[2]۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جس میں ہر گروہ کے

---

[1] حنفیہ کے نزدیک پنچایت کا فیصلہ قضاء قاضی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہ پنچایتیں اپنے فیصلے نافذ کرنے کا اقتدار رکھتی ہوں اور ان کے اختیارات سماعت محض ثالثانہ نہیں بلکہ حاکمانہ نوعیت کے ہوں۔ تو مذہب حنفی کے مطابق بھی ان کے فیصلے قضاء شرعی کے حکم میں ہوں گے۔

[2] اس مجموعہ کا ترجمہ فرنچ زبان میں (Droit Mussulman) کے نام سے شائع ہوا ہے اور مصر کے علاوہ دوسرے مسلم ممالک کی عدالتوں میں بھی اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

چیدہ علماء چند ماہر بن قانون کے ساتھ مل کر ایک مفصل ضابطہ، ضروری تشریحات کے ساتھ مرتب کریں، اس ضابطہ کو ابتداءً ایک مسودہ کی شکل میں شائع کر کے مختلف جماعتوں کے علماء کی رائے دریافت کی جائے پھر ان آراء اور تنقیدات کا مناسب لحاظ کر کے اس پر نظر ثانی کی جائے اور جب یہ ضابطہ اپنی آخری صورت میں مرتب ہو جائے تو اسے احکام شرعیہ کا مستند مجموعہ قرار دے کر یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے شرعی معاملات کے لئے اسی مجموعہ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور انگریزی عدالتوں کے نظائر اور غیر اہل علم و ایمان ججوں کی تشریحات سے جو محمڈن لا تباہ ہوا ہے وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب ہماری کتب فقہ میں تمام مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں تو ایک نیا مجموعہ مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اعتراض صرف ممکن ہی نہیں بلکہ ایک گروہ کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ اس تجویز کی ضرور مخالفت کی جائے گی، اس لئے ہم اختصار کے ساتھ وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ کام ضروری ہے۔

یہ بات تو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل منتشر ہیں، قدیم طرز بیان و انداز ترتیب پر لکھے گئے ہیں اور ایسی زبان میں ہیں جس کی اصطلاحی باریکیوں کو اب عموماً وہ لوگ بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے جو ان کتابوں کا درس دیتے ہیں۔ آج کل قانون کی کتابوں میں جس طرح احکام کو دفعہ وار بیان کیا جاتا ہے اور پھر ہر دفعہ کے نیچے اس کے خاص خاص الفاظ کی تشریح، اس کے مقصد کی توضیح، اس کے تحت آنے والے اور اس کے تحت نہ آنے والے جزئیات کی تفصیل دی جاتی ہے اور معتبر حکام کے نظائر اور مختلف ماہرین کی تعبیرات جس طرح منقح صورت میں بیان کی جاتی ہیں اور فہرستوں اور انڈکسوں سے مسائل کے تلاش کرنے میں جو آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں، ان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار نہ کرے گا کہ انسانی کوششوں سے تدوین و ترتیب کے فن میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے کتب فقہیہ کی تدوین جدید میں ضرور کام لیا جانا چاہیئے۔ آخر قدیم طرز تدوین کوئی منصوص و

مشروع طرز تو نہ تھا کہ اس کی پابندی لازم اور اس سے تجاوز گناہ ہو۔

لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہی کتابوں میں جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر عام انسانی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان احکام کو لفظ بلفظ لے کر ہر جگہ ہر معاملہ پر بے تکلف جاری کر دینا اصلاً غلط ہے۔ ان کی صحیح تنفیذ موقوف ہے اس پر کہ :-

اولاً جس اسلامی جماعت میں ان کو نافذ کیا جا رہا ہے اس کی اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالت کو پیش نظر رکھا جائے، یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کے اجتماعی عادات و خصائل اور رسم و رواج کس قسم کے ہیں۔ وہ کس ماحول میں رہتے ہیں۔ اس ماحول کے ان پر کیا اثرات ہیں۔ ان کی سیرت اور ان کے معاملات میں اسلام کا اثر کس قدر قوی یا ضعیف ہے، بیرونی اثرات سے ان کے اسلامی خصائص میں کس قدر فرق واقع ہوا ہے اور عام تمدنی حالات سے معاملات کی فقہی حیثیت میں کیا تغیرات رونما ہوئے ہیں۔

ثانیاً ہر مقدمہ کے مخصوص انفرادی حالات پر نظر رکھی جائے۔ فریقین کی سیرت، عمر، تعلیم، جسمانی حالات، معاشی و تمدنی حیثیت، گذشتہ تاریخ، خاندانی روایات اور ان کے طبقہ کی عام حالت سب پر نگاہ ڈال کر رائے قائم کی جائے کہ ایک خاص جزئی معاملہ میں ان پر قانون کا نفاذ کس طریقہ سے کیا جائے جس سے قانون کا مقصد بھی ٹھیک ٹھیک پورا ہو جائے، اور اصول قانون سے انحراف بھی نہ ہونے پائے۔

ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص فقہ کی کسی پرانی کتاب میں سے ایک جزئیہ نکالے اور آنکھیں بند کر کے اس کو ہر اس مقدمہ میں جو اس جزئیہ سے تعلق رکھتا ہو چسپاں کرتا چلا جائے تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہوگی جو بقراط اور جالینوس کے نسخے لے کر بیٹھ جائے، اور ملک کی آب و ہوا، موسم، مریضوں کے مزاج، اور امراض کی جداگانہ کیفیتوں سے آنکھیں بند کر کے ان نسخوں کو برتنا شروع کر دے۔ حکمائے قدیم کے مرتب کئے ہوئے نسخے اپنی جگہ نہایت صحیح اور حکیمانہ سہی مگر وہ اس لئے کب مرتب کئے گئے تھے کہ جاہل عطار ان کو برتیں؟ انہیں استعمال کرنے کے لئے بھی علم، تجربہ،

حکمت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح ائمۂ مجتہدین نے شریعت کے قواعد اور اساسی احکام سے جو جزئی مسائل مستنبط کیے ہیں وہ اپنی جگہ نہایت درست سہی لیکن یہ بات تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگی کہ ان اجتہادی احکام کو تفقہ اور تدبر کے بغیر اس طرح استعمال کیا جائے گا جیسے ڈاک خانہ کی مہر کو ایک جاہل چپڑاسی ہر لفافہ پر لگاتا چلا جاتا ہے۔

قانون اسلام ایسے حکیمانہ اصول پر بنایا گیا تھا کہ اس کے ماتحت کسی مرد یا عورت کا مجبوراً اخلاقی میں مبتلا ہونا، یا سوسائٹی میں موجب فتنہ و فساد بن جانا قریب قریب محال تھا، اور یہ تو بالکل ہی ناممکن تھا کہ اس قانون کی کسی سختی سے مجبور ہو کر کوئی مسلمان عورت یا مرد دائرۂ اسلام سے نکل جائے۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف بے شمار خاندانی جھگڑے بلکہ سخت اخلاقی مفاسد حتیٰ کہ ارتداد تک کے واقعات محض اس وجہ سے رونما ہو رہے ہیں کہ اکثر معاملات میں قانون اسلام کے تحت لوگوں کے لئے صحیح اور عادلانہ فیصلہ حاصل کرنا محال ہو گیا ہے۔ تفقہ اور تدبر نہ مفتیوں میں ہے نہ حکام عدالت میں، ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں دیکھتا کہ ہم ایک عام حکم کو جس ملک جس سوسائٹی اور جس خاص مقدمہ میں نافذ کر رہے ہیں اس کی کون کونسی خصوصیات کو ملحوظ رکھکر اس حکم کے عموم میں اصول شریعت کے ماتحت تخصیص کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ شریعت کے مقاصد میں سے کوئی مقصد فوت نہ ہونے پائے اور اصول میں کسی اصل کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔ جہاں تک حکام عدالت کا تعلق ہے ان کی معذوری تو ظاہر ہے، رہے علماء تو ان میں سے بعض تو اس سے زیادہ کی استعداد ہی نہیں رکھتے کہ قدیم کتب فقہ میں جو جزئیات جس عبارت کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک اسی عبارت کے ساتھ نکال کر پیش کر دیا کریں، اور بعض کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے وسعت نظر اور تفقہ فی الدین سے سرفراز کیا ہے لیکن فرداً فرداً ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ کسی مسئلہ میں تفقہ سے کام لے کر کسی قدیم

جزئیہ کی عبارت سے یک سرمو بھی انحراف کر جائیں، کیونکہ ایک طرف خود انہیں اپنے مبتلائے غلط ہونے کا خوف اس جرأت سے باز رکھتا ہے اور دوسری طرف یہ خوف دامنگیر ہوتا ہے کہ دوسرے علماء کی طرف سے ان پر غیر مقلدیت کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہر صوبہ کے جلیل القدر اور با اثر علماء کی ایک جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اجتماعی قوت و اثر سے کام لے کر شرعی معاملات کے لئے ایسا ضابطہ مرتب کرے جو مسلمانان ہند کی موجودہ اخلاقی تمدنی اور معاشی حالت سے مناسبت رکھتا ہو اور جس میں اتنی لچک بھی ہو کہ مخصوص انفرادی حالات میں اصول کے تحت جزئی احکام کے اندر مناسب تغیر کیا جا سکے۔

اگر کوئی شخص اس طریقہ کو "غیر مقلدیت" قرار دیتا ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے، وہ نہیں سمجھتا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید اور انبیاء کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ وہ نہیں جانتا کہ جاہل کی تقلید اور عالم محقق کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ اسے اتنا وقوف بھی نہیں کہ کسی مذہب فقہی کا اتباع کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اس نے تقلید کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ اپنے مذہب فقہی کو بمنزلہ دین، اور اس مذہب کے امام کو بمنزلہ نبی، اور اس کے مسائل کو نصوص کتاب اللہ کی طرح اٹل سمجھا جائے، اور یہ بات عقیدہ کے طور پر دل میں بٹھا لی جائے کہ اس مذہب کے کسی مسئلہ میں اصلاح ترمیم اور اضافہ تو درکنار اس پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈالنا بھی گناہ عظیم ہے اور کسی مسئلہ میں اس مذہب کے کسی جزئیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب فقہی سے کوئی جزئیہ اخذ کرنا زمانۂ اجتہاد یعنی چوتھی صدی ہجری تک تو حلال تھا مگر اس کے بعد حرام ہو گیا۔ لیکن اس طرح کی تقلید علماء سلف میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں، اور نہ اس کے لئے کوئی شرعی ثبوت کہیں سے مل سکتا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ کے تلامذہ نے سینکڑوں مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کیا اور اس کے باوجود وہ حنفیت سے خارج نہ ہوئے۔ علماء احناف نے امام اعظم اور ان کے تلامذہ کے اختلافات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو ترک کر کے بعض کو مفتیٰ بہ قرار دیا مگر اس تحقیق و تنقید کے باوجود کوئی ان کو

غیر مقلد نہیں کہہ سکتا۔ چوتھی صدی ہجری سے لیکر آٹھویں اور نویں صدی تک کے علمائے احناف متقدمین کے اجتہادی مسائل میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کرتے رہے اور حسب ضرورت دوسرے ائمہ مجتہدین کے دوسرے مذاہب سے مسائل اخذ کرکے ان کے مطابق فتوے دیتے رہے مگر کسی نے اس اجتہاد پر غیر مقلدیت کا حکم نہیں لگایا۔ کسی میں یہ جرأت نہیں کہ ابو اللیث سمرقندی شمس الائمہ سرخسی صاحب ہدایہ، قاضی خاں، صاحب کنز، علامہ شامی اور ایسے ہی دوسرے علماء کو محض اس بنا پر غیر مقلد کہدے کہ انہوں نے مذہب حنفی کے مسائل میں اپنے زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے لچک پیدا کی اور جن معاملات میں اس مذہب کے بعض احکام کو موجب ضرر یا عام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابل عمل پایا ان میں دوسرے مذاہب فقہیہ کے مطابق فتویٰ دیا، اور اس بات کو مذہب حنفی کے اصول میں داخل کرلیا کہ بوقت ضرورت مذہب غیر پر حکم اور فتوی دینا جائز ہے بشرطیکہ اس میں اتباع ھوا نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اگر لوگ بطور خود اپنی ضرورتوں کے مواقع پر دوسرے مذاہب کے مطابق عمل کرنے یا خود اپنے مذہب کی رخصتوں سے فائدہ اٹھانے میں آزادی برتیں تو اندیشہ ہے کہ اس سے اتباع ہوا اور تلفیق خارق اجماع اور تتبع رخص مذاہب اور تلاعب بالدین کا دروازہ کھل جائے گا اور معاملات میں سخت ابتری پیدا ہوگی لیکن اگر علمائے دین تقویٰ اور نیک نیتی کے ساتھ باہم مشورہ کرکے مسلمانوں کی ضروریات اور حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا کریں، تو اس میں کسی دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ اگر کسی مسئلہ میں نادانستہ ان سے غلطی بھی ہو تو نصوص صریحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حق تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا، اور ان کی نیک نیتی کا ان کو اجر دے گا۔ اس راستہ کو اختیار کرنے میں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی خطرہ ہے کہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر کمربستہ ہوگی اور ان کے متبعین میں سے بھی ایک گروہ ان سے بدظن ہوجائے گا۔ لیکن اس سے بڑا خطرہ اس راستہ کو

اختیار نہ کرنے میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی ضرورتوں سے تنگ آکر قانون اسلامی کے بجائے ہوائے نفس کا اتباع کریں گے اور ان میں تلاعب بالدین اور حدود اللہ کی خلاف ورزی اور دین و اخلاق کی خرابی، اور کفر و معصیت کی وبائیں پھیلیں گی اور عیسائی قوموں کی طرح وہ بھی اپنے مذہب کے قانون کو چھوڑ کر انسانی قوانین کو اختیار کرلیں گے تو قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اسی لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسی لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو یسر بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے عسر بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس بازپرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔ البتہ جہلاء کو یہ جواب دہی کرنے کا موقع ضرور مل جائے گا کہ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا۔

یہ ضمنی بحثیں چونکہ ضروری اور اہم تھیں اور ان کا تفصیلی بیان ناگزیر تھا اس لئے ان کو اتنی جگہ دینی پڑی اس کے بعد ہم اپنے اصل مبحث کی طرف رجوع کریں گے۔

اصولی ہدایات | قرآن مجید چونکہ ایک اصولی کتاب ہے اس لئے ان جزئی مسائل کو جو ازدواجی معاملات کی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں اس میں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے لیکن چند ایسے وسیع اصول بیان کردیئے گئے ہیں جو تقریباً تمام جزئیات پر حاوی ہیں اور جزئیات کی تخریج میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ پس قانون کی تفصیلات

پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے قواعد اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے:

(۱) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (۲-۲۲۱) وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا (۲-۲۲۱) وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (۵-۱)

ان آیات میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے نہیں ہو سکتا، البتہ اہل کتاب کی عورتیں اس کے لئے حلال ہیں۔ مگر مسلمان عورت نہ مشرک کے نکاح میں آسکتی ہے نہ اہل کتاب کے۔

(۲) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ ..... وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ (۲-۲۲۱) وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (۲۴-۳۲) فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ (۴-۴)

ان آیات سے یہ قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو خود اپنا نکاح کرنے کا کلی اختیار حاصل ہے، اور اس میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں لیکن عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء اور عزیز و قریب مردوں کی رائے کا دخل بھی ہے یعنی وہ اپنے نکاح کے معاملہ میں بالکل آزاد نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث الایم احق بنفسھا من ولیھا اور لا تنکح البکر حتی تستاذن کی رو سے نکاح کے لئے عورت کی رضامندی ضروری ہے، اور کسی کو اس پر جبر کرنے کا حق حاصل نہیں، مگر چونکہ عورت کے نکاح کا مسئلہ خاندان کے مفاد سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے قرآن مجید نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ شادی کے معاملہ میں تنہا عورت کی خواہش کافی نہیں بلکہ اس کے رشتہ دار مردوں کی رائے کو بھی اس میں دخل ہے۔

(۳) فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (۴-۴) وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (۴-۳) فَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ ..... فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (۲-۳۱)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اس تمتع کا عوض ہے جو مرد اپنی بیوی کی مقاربت سے حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا مقاربت کے بعد ہی پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور کسی صورت میں وہ ساقط نہیں ہو سکتا، الا یہ کہ عورت

یا تو اپنی خوشی سے معاف کر دے (فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا) یا خلع کے معاوضہ میں چھوڑ دے (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ)

(۴) وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا (النساء-۳)

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت میں مہر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ لہٰذا قانون کے ذریعہ سے اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ (النساء-۶)

اس آیت کی رو سے نفقہ مرد پر عورت کا واجبی حق ہے اور یہ اُن حقوق زوجیت کا معاوضہ ہے جو رشتہ نکاح سے مرد کو عورت پر حاصل ہوتے ہیں۔ عورت کا یہ حق کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ وہ خود اس سے دست بردار ہو جائے، یا نشوز کی مرتکب ہو۔

(۶) وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ (بقرہ-۲۱)

یہاں نفقہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی تعیین میں مرد کی استطاعت کا لحاظ کیا جائے گا۔ مالدار مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور غریب مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق۔

(۷) وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا (النساء-۶)

اس آیت کی رُو سے مرد کو سزا دینے کا اختیار صرف اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ عورت نشوز اور عدم اطاعت کی روش اختیار کرے۔ اور اس صورت میں بھی سزا کی صرف دو شکلیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ایک ہجر فی المضاجع یعنی ترک صحبت۔ دوسرے ضرب غیر مبرح یعنی ہلکی مار جو صرف انتہا درجہ کے نشوز میں جائز ہے۔ اس حد سے تجاوز کرنا، یعنی بغیر نشوز کے سزا دینا، یا کم درجہ کے نشوز پر انتہائی سزا

دینا، یا انتہائی نشوز پر ضرب غیر مبرح کی حد سے گذر جانا ظلم میں داخل ہے۔

(۸) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا (النساء-۶)

اس آیت میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور خود آپس میں صلح کر لینے کی کوئی صورت نہ پیدا ہو تو ایک شخص مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک شخص عورت کے رشتہ داروں میں سے بطور حکم مقرر کیا جائے، اور دونوں حکم مل کر ان کے جھگڑے کا تصفیہ کریں۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اور فَابْعَثُوْا کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں، اس لئے حکم مقرر کرنا انہی کا کام ہے، اور اگر حکمین کوئی تصفیہ نہ کر سکیں تو آخر میں تصفیہ کا اختیار انہی کو حاصل ہے۔

(۹) فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ (البقرہ-۲۹)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زوجین کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت قاضی کو سب سے زیادہ جس امر کا لحاظ کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آیا وہ دونوں اپنے ازدواجی تعلق میں حدود اللہ پر قائم رہ سکیں گے یا نہیں؟ اگر ظن غالب اس امر کا ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو پھر کوئی چیز اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کی خاطر زوجین کے درمیان جمع کا فیصلہ کرنا جائز ہو۔ سب سے اہم شئے اللہ تعالیٰ کی حدود کا تحفظ ہے۔ اور اس کے لئے اگر ضروری ہو تو ہر چیز قربان کر دی جا سکتی ہے۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ-۲۹)

(۱۰) وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا (البقرہ-۲۹)

اس آیت میں قانون اسلامی کے ایک دوسرے اہم قاعدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کے بندِ نکاح میں اس طرح نہ روکی جائے کہ اس کے لئے موجب ضرر اور وجہ حق تلفی ہو۔ معاشرت ہو تو بالمعروف ہو (وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ) اگر رکھا جائے تو معروف کے

ساتھ رہ کا جائے (فَاَمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ)۔ جہاں اس کی کوئی اُمید نہ ہو، اور اس کے برعکس ضرار اور حق تلفی کا خوف ہو وہاں تسریح باحسان پر عمل کرنا ضروری ہے، کیونکہ حسب ارشاد نبوی اسلام کے قانون میں نہ کوئی چیز ضرر پہنچانے والی ہے اور نہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے۔ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ۔

(۱۱) فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (النساء-۱۹)

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع کے لئے نازل ہوئی ہے مگر اس کے آخری ٹکڑے میں ایک عام قاعدہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ یہ کہ کسی عورت کو ایسی حالت میں نہ چھوڑا جائے کہ وہ ایک شخص کے رشتہ نکاح میں بندھ کر معلق ہو جائے، یعنی نہ تو اس کو شوہر کی معیت اور معاشرت ہی نصیب ہو اور نہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لینے کی آزادی حاصل ہو۔

(۱۲) لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ (بقرہ-۲۸)

اس آیت میں عورتوں کی اوسط قوت برداشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی چار مہینہ تک وہ ضرر اور حدود اللہ سے تجاوز کے بغیر شوہر کی صحبت سے محروم رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کسی ایک چیز کا خوف ہے۔ اس آیت کا بھی ایک خاص محل ہے، مگر یہ اپنے محل کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی رہنمائی کرتی ہے۔

(۱۳) وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ (النور-۱۰)

اس آیت میں لعان کا قانون بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور گواہی نہ پیش کر سکے تو اس سے چار مرتبہ قسم لی جائے گی کہ جو الزام اُس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے، اور پانچویں بار یہ کہلوایا جائے گا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔ اس کے بعد عورت زنا کی سزا سے صرف اس طرح بچ سکتی ہے کہ وہ بھی چار مرتبہ یہ قسم کھائے کہ اس کے شوہر کا الزام

جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر اس کے شوہر کی بات سچی ہو تو اُس پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اس طرح حب ملاعنت کی تکمیل ہو جائے تو زوجین کے درمیان تفریق کرادی جائے۔

(۱۴) اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ (البقرہ۔ ۳۱)

اس آیت کے آخری فقرہ میں اس قاعدہ کی تصریح کی گئی ہے کہ عقدۂ نکاح مرد کے ہاتھ میں ہے، اور وہی اسے باندھنے اور کھولنے کا اختیار رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں طلاق کا ذکر آیا ہے مذکر کے صیغوں میں آیا ہے، اور اس فعل کو مرد ہی کی طرف نسبت دی گئی ہے مثلاً وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ۔ فَاِنْ طَلَّقَھَا۔ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر بحیثیت شوہر ہونے کے طلاق دینے یا نہ دینے کا کلی اختیار رکھتا ہے، اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو اس کا یہ حق سلب کرتا ہو۔

لیکن اسلام میں تمام حقوق اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ان کے استعمال میں ظلم اور حدود اللہ سے تجاوز نہ ہو۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ (الطلاق۔۱) جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اس کا حق سلب کر لیا جائے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (البقرہ۔ ۲۷۹) نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمہارا نقصان کیا جائے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے، جو اسلامی قانون کے ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں جاری ہوتا ہے، اور مرد کا حق طلاق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پس جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے ظلم و ضرر کی شکایت ہو تو بقاعدہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اس کی شکایت اللہ اور رسول کے قانون پر پیش کی جائے گی اور اگر اس قانون کی نگاہ میں اس کی شکایت جائز ثابت ہو گی تو قانون کو نافذ کرنے والوں، یعنی اولی الامر کو حق ہو گا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کر کے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطلیق کے جو اختیارات شرع میں دیے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہاء کی ایک جماعت نے

بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں، اور اس قاعدہ میں کوئی استثنا نہیں، اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں کہ اس کے اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے۔ لیکن قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔

(۱۵) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ - (۲-۲۹)

اس آیت میں طلاق کا نصاب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق رجعی ہے اور تیسری مرتبہ کی بائن۔

مسائل جزئیہ | ان اصولی احکام کو جس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اب اسی ترتیب کے ساتھ ہم ان جزئی مسائل کو بیان کریں گے جو ان میں سے ایک ایک اصل کے تحت آتے ہیں۔ یہاں ہم تمام مسائل جزئیہ کا استقصاء کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان خاص مسائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن میں ضرورتاً وحالاً زمانہ کے لحاظ سے از سر نو احکام فقہی کی تفریع و توضیح ضروری ہے۔

ارتداد احد الزوجین | موجودہ زمانہ میں ارتداد کے مسئلہ نے خاص اہمیت اختیار کر لی ہے۔ جہاں تک مرد کے ارتداد کا تعلق ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں، کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ لیکن عورت کے ارتداد کے مسئلہ میں پیچیدگی واقع ہو گئی ہے۔ بکثرت عورتیں صرف اس غرض کے لئے مرتد ہو گئی ہیں اور ہو رہی ہیں کہ انہیں ایسے شوہروں سے رستگاری حاصل ہو جو ظالم ہیں یا انہیں ناپسند ہیں۔ اس مسئلہ میں انگریزی عدالتیں اس ظاہر الروایہ پر عمل کرتی ہیں جو ہدایہ وغیرہ میں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، یعنی اذا ارتد احد الزوجین وقعت الفرقۃ بغیر طلاق (جب زوجین میں سے کوئی مرتد ہو جائے تو فرقت بغیر طلاق[1] واقع ہوتی ہے) لیکن علماء ہند اس قسم کے ارتداد کی رد کو رد کرنے کے لئے شائخ بلخ و سمرقند اور بعض مشائخ بخارا کے فتوے پر عمل کرانا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ

[1] مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے مسلمان شوہر پر حرام ہو جاتی ہے مگر اس فرقت سے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوسرا نکاح کر سکے۔

یہ ہے کہ ارتداد سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے نکاح میں بدستور رہتی ہے۔ اس فتوے کی بنا اس امر پر ہے کہ ایسی عورت چونکہ محض بندِ نکاح سے رہائی حاصل کرنے کے لئے مرتد بن جاتی ہے، اس لئے اس حیلہ کو رد کرنے کی یہی صورت ہے کہ نکاح پر اس کے ارتداد کا کوئی اثر تسلیم نہ کیا جائے۔ مگر اس فتوے کو قبول کرنے میں چند مشکلات ہیں جن پر شاید ان علماء کرام کی نظر ابھی تک نہیں پہنچی:۔

اولاً، اسلام اور کفر کے معاملہ میں ملک کا قانون اور اسلامی شریعت دونوں صرف اقرارِ لسانی کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ ایک عورت دل سے مرتد نہیں ہوئی بلکہ صرف اس نیت سے مرتد ہوئی ہے کہ اپنے شوہر سے جدا ہو جائے۔

ثانیاً، جو عورت کتابی مذاہب میں سے کسی مذہب میں چلی جائے اس کے حق میں تو بدرجۂ آخر وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے فائدہ اٹھا کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے، مگر جو عورت ہندو یا مجوسی ہو جائے یا کسی اور غیر کتابی مذہب میں چلی جائے، اس کو مسلمان مرد کے نکاح میں رکھنا تو قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

ثالثاً، جو عورت اسلام کے دائرہ سے نکل کر دوسرے مذہب میں چلی گئی ہے، اس پر اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟ ہم ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہیں۔ اور اس حکومت کی نگاہ میں مسلمان، ہندو سکھ سب یکساں ہیں۔ ہم اس سے کس طرح یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو جو مثلاً سکھوں یا آریوں کی جماعت میں شامل ہو چکی ہے اس کی مرضی کے خلاف اُسی نکاح پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرے گی جو اس سے بحالتِ اسلام، اسلامی قانون کے ماتحت کیا گیا تھا؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک ارتداد کے مسئلہ میں مشائخ بلخ و سمرقند کے فتوے سے مسلمان علما کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ درحقیقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عورتیں مرتد کیوں ہوتی ہیں؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے دو چار ہی فی صدی ایسی ہوں گی جن کے عقیدہ میں فی الواقع تغیّر ہوتا ہے۔ درحقیقت

جو چیز ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ظلم و ضرر کی بہت سی حالتوں میں رائج الوقت قانون کے تحت عورتوں کے لئے دادرسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ شوہر سخت سے سخت مظالم کرتا ہے مگر بیوی اس سے خلع حاصل نہیں کر سکتی۔ شوہر ناکارہ ہے، مجنون ہے، خطرناک یا قابل نفرت امراض میں یا سخت بیہودہ عادات میں مبتلا ہے، بیوی اس کے نام تک سے نفرت کرتی ہے، باہمی تعلقات منقطع ہیں، مگر بندِ نکاح سے آزادی کی کوئی سبیل نہیں۔ شوہر مفقود الخبر ہے، سالہا سال سے اس کا پتہ نہیں، عورت پر زندگی اجیرن ہو گئی ہے، مگر اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی قسم کے حالات درحقیقت عورتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے نکل کر کفر کے دامن میں پناہ لیں۔ اس کی روک تھام کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ ادھر اُدھر سے فقہی جزئیات نکال کر ان قسمت کی ماری ہوئی عورتوں کے لئے کفر کے دامن میں بھی کوئی جائے پناہ نہ رہنے دی جائے، اور ان کو ارتداد کے بجائے خودکشی پر مجبور کیا جائے، بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنے قانون پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں اور ان اجتہادی احکام میں ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ترمیم و اصلاح کریں جن کی سختیوں کی وجہ سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اسلام کی آغوش سے نکل کر کفر کی گود میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں تک اللہ اور رسول کے منصوص احکام کا تعلق ہے ان میں قطعاً کوئی ایسی تنگی نہیں جو کسی کے لئے موجب ضرر ہو کجا کہ موجب ارتداد۔ یہ صفت صرف بعض اجتہادی احکام میں پائی جاتی ہے اور ان احکام کو بعض دوسرے اجتہادی احکام سے بدل کر ارتداد سلمات کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کیا جا سکتا ہے۔

خیار بلوغ قرآن مجید میں اگرچہ یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہئے، لیکن نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس قاعدہ کی جو تعبیر فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کی رائے کا دخل ہونے کے معنی یہ نہیں کہ عورت اپنی زندگی کے اس اہم معاملہ میں بے اختیار ہے۔ بخلاف اس کے حضور نے ایجاباً عورت کو یہ حق دیا ہے کہ نکاح

کے معاملہ میں اس کی رضامندی حاصل کی جائے، چنانچہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ابن عباس سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ میرے باپ نے میری مرضی کے خلاف میری شادی کردی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تجھ کو رد و قبول کا اختیار ہے۔ نسائی میں خنساء بنت خذام کی روایت ہے کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کر دیا تھا حضور نے ان کو بھی یہی اختیار دیا۔ دارقطنی میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ ایسے ہی ایک مقدمہ میں حضور نے محض اس بنا پر زوجین میں تفریق کرادی کہ نکاح لڑکی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے بھتیجے سے اس کا نکاح کر دیا ہے۔ حضور نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کرے چاہے رد کر دے۔ اس پر اس نے عرض کیا:

یارسول اللہ اجرت ما صنع ابی و انما اردت ان اعلم النساء ان لیس الی الا باء من الامر شیء۔	یا رسول اللہ میرے باپ نے جو کچھ کیا اسے میں نے منظور کر لیا میرا مقصد تو صرف عورتوں کو یہ بتانا تھا کہ ان کے باپ اس معاملہ میں مختار نہیں ہیں۔

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور موطا میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہے:۔

الایم احق بنفسھا من ولیھا والبکر تستأذن فی نفسھا۔	بن بیاہی عورت اپنے ولی سے بڑھ کر اپنے نفس کے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے معاملہ میں اذن لیا جائے۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا:

لا تنکح الایم حتی تستامر ولا تنکح البکر	شوہر دیدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے

لہ لغت میں ایم ہر اس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر والی نہ ہو، خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ۔

حق تستاذن۔ اجازت نہ لے لی جائے۔ اور باکرہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس کا اذن نہ لے لیا جائے۔

ولایت اجبار | یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اصول شرع سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ نکاح کے لئے عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا باپ یا کوئی ولی کر دے تو کیا کسی حال میں اس کا یہ حق کہ اس کے نفس کے معاملہ میں اس کی مرضی کا دخل ہو، ساقط ہو سکتا ہے؟ اس مسئلہ میں ہمارے فقہاء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر نابالغہ کا نکاح اس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو تو لڑکی کو حق ہوگا کہ بالغ ہونے پر اسے چاہے قبول کرلے، چاہے رد کر دے۔ لیکن اگر باپ یا دادا نے کیا ہو تو اسے یہ حق نہ ہوگا، اِلّا یہ کہ باپ یا دادا کا سیّئ الاختیار ہونا ثابت ہو جائے، مثلاً وہ فاسق ہو یا بے حیا ہو، یا اپنے معاملات میں سوء تدبیر اور ناعاقبت اندیشی کے لئے مشہور ہو۔

یہ مسئلہ کہ باپ اور دادا کو نابالغہ پر ولایت اجبار حاصل ہے، اور ان کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیار بلوغ استعمال کرنے کا حق نہیں ہے، قرآن مجید کی کسی آیت، یا نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ محض فقہاء کے اس قیاس پر مبنی ہے کہ باپ اور دادا چونکہ لڑکی کے بدخواہ نہیں ہو سکتے اس لئے لڑکی کے لئے ان کا کیا ہوا نکاح لازم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ فلا خیار لھما بعد البلوغ لانھما کاملا الرای وافر الشفقۃ فیلزم العقد بمباشرتھما کما اذا باشراہ برضاھما بعد البلوغ۔ لیکن یہ محض ایک قیاسی رائے ہے جو خدا و رسول کے احکام کی طرح نہ محکم ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ نقلاً و عقلاً اس پر متعدد حیثیات سے اعتراض وارد ہوتا ہے:۔

اوّلاً، حدیث صحیح ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی صاحبزادی کا نکاح کسنی میں عمر بن ابی سلمہ سے کر دیا اور فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد اسے رد یا قبول کرنے کا اختیار ہے۔ اس حدیث سے نابالغہ کے لئے خیار بلوغ مطلقاً ثابت ہوتا ہے، کیونکہ حضور نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ میں چونکہ لڑکی

کا باپ نہیں بلکہ ابن عم ہوں اس لئے میرا کیا ہوا نکاح اس کے لئے لازم نہیں ہے۔

ثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہو تو باپ یا دادا کے مقابلہ میں اسے اپنی رائے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو لیکن وہی لڑکی اگر نابالغ ہو تو اس کا یہ حق کلیتہً سلب کر لیا جائے، حالانکہ معاملہ نکاح کے ساتھ عورت کے تعلق کی جس اہمیت کو ملحوظ رکھ کر شارع نے اس کو یہ حق دیا ہے وہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے۔ اگر کسی کے کامل الرائے اور وافر الشفقت ہونے کی بنا پر اس کو ولایت اجبار حاصل ہو سکتی ہے، تو وہ بلوغ کی حالت میں بھی اسی طرح حاصل ہونی چاہیئے جس طرح عدم بلوغ کی حالت میں اس کے لئے ثابت کی جاتی ہے لیکن جب بالغ لڑکی پر کسی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے، تو نابالغ لڑکی پر کیوں حاصل ہو؟

ثالثاً، باپ دادا کا وافر الشفقت اور کامل الرائے ہونا کوئی یقینی اور ثابت شدہ امر نہیں ہے محض کثرت کو دیکھ کر ایک قیاس قائم کیا گیا ہے۔ مگر اس قیاس کے خلاف بھی کثیر واقعات دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جاتے ہیں جن سے وفور شفقت کا ثبوت کم اور کمال رائے کا ثبوت کم تر ملتا ہے۔

رابعاً، اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ باپ دادا نیک نیتی کے ساتھ وفور شفقت اور کمال رائے رکھتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکی کا نکاح ایک کم سن لڑکے سے کر دیں، اور لڑکا جوان ہو کر ان کی توقعات کے خلاف نالائق نکلے۔ خصوصاً موجودہ زمانہ میں جبکہ اسلامی تربیت کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے، تعلیم و تربیت کی خرابیوں سے نہایت بری سیرتیں پیدا ہو رہی ہیں، اور مسلمانوں کے گرد و پیش ایسا خراب ماحول پایا جاتا ہے جس کے بہت برے اثرات لڑکوں کے اخلاق و عادات پر مترتب ہو رہے ہیں، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم نہ قرار دیا جائے۔ کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بداخلاقیوں اور بری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس وقت باپ دادا کی ولایت اجبار خود ان کے لئے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔

خامساً، اگر باپ دادا سیئ الاختیار ہوں تو ایک لڑکی کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں خیار بلوغ استعمال کر سکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کو اپنے باپ یا دادا کے خلاف بدنیتی، فسق و فجور، بے حیائی، سوء تدبیر یا حماقت و بلادت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا، اور یہ نہ صرف اس کے لئے مشکل ہے، بلکہ سخت معیوب بھی ہے۔

ان وجوہ سے فقہ کے اس جزئیہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اور مصالح کا اقتضا ہے کہ اس خالص اجتہادی مسئلے میں ترمیم کر کے صغیر و صغیرہ کو ہر حال میں خیار بلوغ دیا جائے۔

خیار بلوغ کی شرائط | اس سلسلہ میں فقہاء کا ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ بھی محل نظر ہے۔ باپ دادا کے سوا دوسرے اولیاء کے باب میں فتویٰ یہ ہے کہ اگر انہوں نے صغیرۂ باکرہ کا نکاح کر دیا ہو تو وہ خیار بلوغ استعمال کر سکتی ہے، اگر شرط یہ ہے کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی بلا تاخیر وہ اپنی نارضامندی کا اظہار کر دے۔ اگر اس نے فوراً اس کا اعلان نہ کیا تو اس کا خیار باطل ہو جائے گا۔ یہ شرط صرف باکرہ کے لئے رکھی گئی ہے۔ ثیبہ اور نابالغ لڑکے کے لئے یہ حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جب تک وہ اپنی رضا کی تصریح نہ کریں، ان کو خیار فسخ حاصل رہے گا۔

یہ شرط جو صغیرۂ نابالغہ کے لئے رکھی گئی ہے اس کا کوئی ثبوت ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے۔ خیار فسخ کو بلوغ کے ساتھ مشروط کرنے کی علت اس کے سوا کوئی نہیں کہ سن بلوغ کو پہنچ کر انسان میں بُرے اور بھلے کی تمیز پیدا ہوتی ہے، اور وہ عقل رسا سے کام لے کر اپنے معاملات میں ذمہ دارانہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی اس کے اندر کوئی بڑا انقلاب رونما ہو، اور آناً فاناً وہ ناقص الرائے سے کامل الرائے ہو جائے۔ اور بالفرض اگر ایسا ہوتا بھی ہو تو ثیبہ اور نابالغ لڑکے کا حال باکرہ کے حال سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ پس جب ان دونوں کے خیار بلوغ کو اس وقت

تک کے لئے ممتد کیا گیا ہے جب تک کہ وہ قولاً یا فعلاً اپنی رضا کی تصریح نہ کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ باکرہ کو بھی سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لئے کافی وقت نہ دیا جائے۔ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ بہ نسبت ایک ثیبہ اور ایک نوجوان مرد کے اس کی زیادہ مستحق ہے، کیونکہ وہ غریب تو ان دونوں سے زیادہ ناتجربہ کار ہوتی ہے۔

مہر | مہر کے مسئلہ میں یہ امر مسلم ہے کہ اللہ اور رسول کے قانون میں اس کے لئے کوئی آخری حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کے لئے چالیس اوقیہ کی انتہائی حد مقرر کرنی چاہی تھی، مگر ایک عورت نے ان کو ٹوک کر کہا کہ آیت وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا کی رو سے آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں اس دلیل کو سن کر حضرت عمر نے فرمایا امراۃ اصابت ورجل اخطاء پس جہاں تک مہر کی تحدید کا تعلق ہے قانون میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مہر کی زیادتی میں مبالغہ کرنا اور مرد کی قوت برداشت سے زیادہ مہر باندھنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے حضورؐ نے فرمایا:-

الزموا النساء الرجال ولا تغالوا فی المهور عورتوں کو مردوں کے پلے باندھنے کی کوشش کرو اور مہروں میں حد سے نہ بڑھو۔

ابو عمرو الاسلمی نے ایک عورت سے دو سو درہم مہر پر نکاح کیا تو آپ نے فرمایا لو کنتم تغرفون الدراهم من اودیتکم ما زدتم (اگر تم کو ندی نالوں میں درہم بہتے ہوئے ملتے تب بھی شائد تم اس سے زیادہ مہر نہ باندھتے)

حضرت انس نے ایک عورت سے چار اوقیہ (۱۷۰ درہم) پر نکاح کیا تو حضورؐ نے فرمایا کانما تنحتون الفضة من عرض هذا الجبل۔ (گویا کہ تم اس پہاڑ میں سے چاندی کھود کھود کر نکال رہے ہو)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "عورت کے مہر مقرر کرنے میں حد سے نہ بڑھو۔ اگر یہ دنیا میں

کوئی قابل عزت اور آخرت میں تقویٰ کی بات ہوتی تو تم سے زیادہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار کرتے مگر آپ کی ازواج اور صاحبزادیوں میں سے تو کسی کا مہر (۱۲) اوقیہ سے زیادہ نہ تھا۔"

یہ تو محض زیادتی مہر کے متعلق ہے لیکن ہمارے ملک میں جو رواج عام ہو گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں روپیہ کی دستاویزیں مہر مؤجل کے طور پر لکھی جاتی ہیں۔ مگر نہ اتنی بڑی بڑی رقموں کا ادا کرنا ان کے لکھنے والوں کی قدرت میں ہوتا ہے، اور نہ لکھتے وقت وہ اس نیت سے لکھتے ہیں کہ کبھی ان کو مہر ادا کرنا ہے۔ یہ چیز کراہت کی حد سے گذر کر نکاح کے لئے موجب فساد ہے، کیونکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بتصریح فرمایا ہے کہ

من تزوج امرأۃ بصداق ینوی ان لا یؤدیہ فھو زان ومن ادان دینا ینوی ان لا یقضیہ فھو سارق۔	جس نے ایک مال مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہ کرے گا وہ دراصل زانی ہے، اور جس نے قرض لیا اور نیت یہ رکھی کہ اس قرض کو ادا کرنا نہیں ہے وہ دراصل چور ہے۔

یہ اس قسم کے مہروں کی باطنی قباحت ہے۔ رہی ظاہری قباحت تو وہ بھی کچھ کم شدید نہیں۔ اس قسم کے مہر باندھنے کا حقیقی مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ شوہر طلاق نہ دے سکے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافقت ہو جائے اور دونوں مل کر نہ رہ سکیں تو یہی زیادتی مہر عورت کے لئے بلائے جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی نالش کے خوف سے اس کو طلاق نہیں دیتا، اور سالہا سال بلکہ ساری عمر کے لئے غریب عورت معلق پڑی رہتی ہے۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو عام طور پر مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے ان میں سے ایک اہم چیز یہی مہر کی زیادتی ہے۔ اگر اس میں اعتدال برتا جائے تو قریب قریب ۷۵ فی صدی مشکلات رونما ہونے سے پہلے ہی حل ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک اس کی اصلاح کے لئے اصول شرع کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے یہ صورت

اختیار کی جاسکتی ہے کہ مہر اگر معجل ہو تو فریقین مختار ہیں کہ بلا کسی حدّ و انتہا کے جتنا چاہیں مقرر کرلیں۔ لیکن اگر وہ موجل ہو تو لازم قرار دیا جائے کہ اس کی دستاویز باقاعدہ اسٹامپ پر لکھی جائے اور زر مہر پر پچاس فی صدی قیمت کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا ۵۰ فی صدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویز مہر قابل ادخال دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے تو مہر موجل کا یہ سرتاپا عیب سے بھرا ہوا طریقہ بآسانی مسدود ہو جائے گا۔ اُس وقت لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنی استطاعت کے مطابق مہر مقرر کریں اور فضولیات میں روپیہ صرف کرنے کے بجائے نقد یا مال و جائداد کی صورت میں نکاح کے وقت ہی مہر ادا کردیں۔

نفقہ | اس باب میں نزاع کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی استطاعت رکھتا ہو مگر نہ دے اور دوسری شکل یہ کہ اس میں استطاعت ہی نہ ہو۔

پہلی صورت میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ قاضی اس کو نفقہ ادا کرنے پر ہر ممکن طریقہ سے مجبور کرسکتا ہے۔ لیکن اگر وہ قاضی کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اس میں اختلاف ہے کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ عورت بطور خود اپنے نفقہ کا انتظام کرے خواہ شوہر کے نام پر قرض لے کر، خواہ محنت مزدوری کرکے، خواہ اپنے کسی عزیز سے مدد لے کر۔ بخلاف اس کے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں قاضی کو بطور خود طلاق واقع کردینے کا حق ہے۔ بعض علماء احناف نے مالکیہ کے اس فتوے کو اختیار کرنا پسند کیا ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت خود نفقہ کا انتظام نہ کرسکتی ہو، یا اگر کرسکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہو۔ لیکن یہ شرط کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ قرآن مجید کی رو سے نفقہ عورت کا حق ہے جس کے معاوضہ میں اس پر شوہر کو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص قصداً اس حق کو ادا کرنے سے انکار کر رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو زبردستی اس کے عقد نکاح میں بندھے رہنے پر مجبور کیا جائے۔ جب

تک وہ کسی شخص کے نکاح میں ہے اس کی پرورش کا ذمہ دار اس کا شوہر ہے۔ ایسی حالت میں اس کو خود روزی کمانے یا اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے یا ایک ظالم شوہر کے نام سے حصول قرض کی غیر ممکن الحصول کوشش کرنے کی تکلیف میں ڈالنا خلاف عدل معلوم ہوتا ہے۔

دوسری صورت میں پھر حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت کو صبر و احتساب کی تلقین کی جائے گی۔ اور اس سے کہا جائے گا کہ قرض لے کر یا کسی عزیز سے مدد لے کر گزر کرے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عورت کا نفقہ ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر اس کی پرورش کا بار پڑتا اگر وہ بن بیاہی ہوتی۔ لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکتی ہو اور تفریق کا دعویٰ کرے تو تفریق کرا دی جائے گی۔ امام مالک کی رائے میں شوہر کو مہینہ دو مہینہ یا کسی مناسب مدت تک مہلت دی جائے گی۔ امام شافعی صرف تین دن کی مہلت دیتے ہیں، اور امام احمد حنبل کا فتویٰ یہ ہے کہ بلا تاخیر زوجین میں تفریق کرا دی جائے۔

اس باب میں نہ صرف قرآن مجید کا وہ قاعدہ جو وبما انفقوا من اموالھم میں بیان کیا گیا ہے، ائمہ ثلاثہ کی تائید کرتا ہے، بلکہ احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دار قطنی اور بیہقی میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ منقول ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔ حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ تابعین میں سے سعید بن المسیب کا بھی یہی فتویٰ ہے، اور حضرت عمر ابن عبد العزیز نے بھی تحقیق کے بعد اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔ بخلاف اس کے حنفیہ کا استدلال اس آیت سے ہے کہ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا (الطلاق-۱) لیکن اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لئے شرعاً کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، بلکہ نفقہ دینے والے کی حیثیت پر منحصر ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو وہاں عورت کو بلا نفقہ گذر

کرنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ بلاشبہ یہ عزیمت کا مقام ہے کہ ایک عورت مصیبت اور فاقہ کشی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اسلام ایسی ہی عزیمت کی تعلیم دیتا ہے، اور ایک شریف خاتون کو ایسا ہی ہونا چاہئے، لیکن اخلاقی تعلیم اور چیز ہے، اور شرعی حق دوسری چیز۔ نفقہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر وہ برضا و رغبت اس کو چھوڑ دے اور اس کے بغیر ہی شوہر کی رفاقت کرنا پسند کرے تو نہایت قابل تعریف ہے۔ لیکن اگر وہ اس کو نہ چھوڑنا چاہے یا نہ چھوڑ سکے تو قانون اسلامی کے عدل و انصاف میں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ عزیمت کے مقام بلند پر ٹھیرانے کی کوشش کی جائے۔

پس ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں تمام مذاہب میں سے احسن مذہب امام مالک کا ہے جو شوہر کو مناسب مدت تک مہلت دینے کے بعد تفریق کا حکم دیتے ہیں۔

ستم ناروا | آیۂ کریمہ وَاللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ ..... فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (النساء-۶) کی رو سے شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ بلا کسی جائز سبب کے اپنی بیوی پر کسی قسم کی سختی کرے خواہ وہ آزار جسمانی ہو یا آزار لسانی۔ اگر وہ ایسا کرے تو عورت کو قانون کی پناہ لینے کا حق ہے۔ اس باب میں کوئی تفصیلی حکم ہم کو نہیں مل سکا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قانون اسلامی کے اصول میں اس کی گنجائش ہے کہ قاضی کو ایسے مظالم سے عورت کی حفاظت، اور ناقابل برداشت صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا جا سکتا ہے۔ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقوں میں عورتوں کے ساتھ ناروا برتاؤ کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے، اور شوہریت کے معنی یہ سمجھے جا رہے ہیں کہ وہ ظلم و جور کا غیر محدود لائسنس ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ قانون میں اس کے متعلق مناسب احکام کا اضافہ کیا جائے۔

تحکیم | اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو طریق کار اختیار فرمایا ہے وہ ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ کشف الغمہ میں ہے کہ آپ کے پاس ایک مرد اور اس کی بیوی کا مقدمہ آیا۔ آپ نے قرآن مجید

کے فرمان فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا کے مطابق حکم دیا کہ دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حکم تجویز کریں۔ پھر دونوں حکموں کو مخاطب کر کے فرمایا: تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کو ملانا مناسب سمجھو تو ملا دو اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کر دو۔ پھر عورت سے دریافت فرمایا، کیا تو ان دونوں پنچوں کے فیصلہ پر راضی ہے۔ اس نے عرض کیا ہاں میں راضی ہوں۔ اس کے بعد مرد سے یہی سوال کیا۔ اس نے کہا اگر وہ ملا دیں تو مجھے ان کا فیصلہ قبول ہے اور اگر تفریق کریں تو مجھے قبول نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: لیس ذٰلك لكَ، لست ببارح حتّٰی ترضٰی بمثل ما رضیتْ به۔ تجھے اس کا حق نہیں، تو یہاں سے نہیں جا سکتا جب تک کہ اُسی طرح تو بھی اپنی رضامندی کا اقرار نہ کرے جس طرح اس عورت نے کیا ہے۔"

میاں بیوی کے ایسے خانگی جھگڑوں میں جن کا تعلق بڑے اور اہم قانونی مسائل سے نہ ہو، تحکیم کے اس طریقے کو اختیار کرنا انسب ہے، اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق قانون میں چند ایسی دفعات کا اضافہ کیا جائے جن میں تحکیم کے طریقہ، اور حکمین کے اختیارات اور ان کے متفقہ فیصلہ کے طریق نفاذ، اور اختلاف رائے کی صورت میں عدالت کے طریق کار کی صراحت کر دی جائے۔

عیوب میں خیار فسخ

عیوب زوجین کے مسئلہ میں فقہاء کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے ہیں ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ عورت اور مرد کے کسی عیب کی بنا پر دوسرے فریق کو خیار فسخ نہیں ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے وَلَا یتخیر اَحَدُ الزَّوجَیْن بعیب الاخر ولو فاحشًا کجنون وجذام وبرص ورَتَقٍ وقَرَنٍ (یعنی میاں اور بیوی میں سے کسی کو بھی دوسرے کے کسی عیب پر فسخ نکاح کا اختیار نہیں، خواہ وہ عیب کیسا ہی سخت ہو، مثلاً جنون، جذام، برص، رتق اور قرن) صحابہ میں سے حضرت علی اور ابن مسعود اور ائمہ مجتہدین میں سے عطار نخعی، عمر ابن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ، اوزاعی، ثوری، ابوحنیفہ اور ابو یوسف رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تمام ایسے عیوب جو مانع تعلقات زن و شوہر ہوں، ان میں عورت اور مرد دونوں کو خیار فسخ ہے، مثلاً جنون، جذام، برص، گندہ دہنی، امراض خبیثہ، اور شرمگاہ کے ایسے عوارض جو مانع قربت ہوں۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے، چنانچہ ابن جزی نے القوانین میں عیوب مذکورۂ بالا کی تفصیل بیان کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ اذا کان فی احد الزوجین احد العیوب کان للآخر الخیار فی البقاء معہ والفراق۔

امام شافعی کے نزدیک جنون، جذام اور برص میں عورت اور مرد دونوں کو خیار فسخ ہے۔ مگر قروح سیالہ فرج، مثلاً آتشک وغیرہ، اور گندہ دہنی اور خارشت میں خیار نہیں ہے۔ البتہ اگر عورت اندام نہانی کے ایسے امراض میں مبتلا ہو جو مانع مباشرت ہوں، یا مرد عنین یا

مقطوع الذکر ہو تو ایسی صورت میں فریق ثانی کو خیار فسخ ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک شوہر کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیار فسخ نہیں ہے۔ مگر عورت کو شوہر کے جنون اور جذام اور برص میں خیار فسخ ہے۔

ان تمام مذاہب میں سے دوسرا مذہب قرآن مجید کی تعلیم سے اقرب ہے۔ قرآن کی رو سے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں دو چیزوں کو مقصدی اہمیت حاصل ہے۔ ایک تحفظ اخلاق، دوسرے زوجین کی باہمی مودت و رحمت۔ یہ دونوں مقصد ایسے عیوب میں فوت ہو جاتے ہیں جن سے زوجین طبعاً ایک دوسرے سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں، یا ایک دوسرے کی طبیعی خواہشات کو پورا نہ کر سکتے ہوں۔ پھر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ بات اسلامی قانون ازدواج کے اصول میں سے ہے کہ ازدواجی تعلق زوجین کے لئے مضرت اور حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہ ہونا چاہئے۔ یہ قاعدہ بھی ان عیوب میں خیار فسخ نہ رکھنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تمام امراض جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ضرر پہنچانے والے ہیں اور ان سے اس امر کا بھی خوف ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک نفرت کی وجہ سے یا اپنی طبعی خواہشات پوری نہ ہونے کی وجہ سے حدود اللہ کو توڑ دے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام عیوب میں زوجین کے لئے خیار فسخ رکھا جائے۔

یہ تو اس صورت میں ہے جبکہ نکاح سے پہلے زوجین کو ایک دوسرے کے حال کی خبر نہ ہو اور بعد میں علم ہوتے ہی اس پر نارضامندی کا اظہار کر دیں۔ رہی یہ صورت کہ زوجین کو نکاح سے پہلے ایک دوسرے کا حال معلوم تھا اور انہوں نے جان بوجھ کر نکاح کر لیا، یا ان کو معلوم تو نہ تھا مگر بعد میں علم ہونے پر انہوں نے خیار فسخ استعمال نہ کیا، یا نکاح کے بعد عیب پیدا ہوا، تو ان تمام صورتوں میں مرد کے پاس تو ایک چارۂ کار ایسا موجود ہے جس سے وہ ہر وقت کام لے سکتا ہے یعنی طلاق۔ اور اس کے علاوہ دوسرا چارۂ کار بھی اس کے پاس موجود ہے، یعنی دوسری شادی کر لینا۔ مگر

عورت کے لئے بعض صورتوں میں فقہاء نے کوئی چارۂ کار تجویز نہیں کیا ہے اور بعض صورتوں میں کسی نے اس کی خلاصی کی تدبیر نکالی ہے اور کسی نے نہیں نکالی۔ اس باب میں جو فتاویٰ ہیں اُن کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کرکے ان پر بحث کریں گے۔

عنین، مجبوب وغیرہ | اگر شوہر مجبوب (مقطوع الذکر) ہو تو اس بات پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عورت کو تفریق کا دعویٰ کرنے کا حق ہے، اور تحقیق حال کے بعد فی الفور تفریق کرائی جائے گی۔

اگر شوہر نامرد ہو اور عورت تفریق کا مطالبہ کرے، تو حضرت عمرؓ کے فیصلہ کی بنا پر اسے ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ قادر نہ ہو تو تفریق کرادی جائے گی، لیکن اس کے ساتھ فقہاء نے حسب ذیل شرطیں لگائی ہیں:

(۱) عورت کو پہلے سے اس کے عنین ہونے کا علم نہ ہو۔ اگر اس کو علم تھا اور اس نے برضا و رغبت اس سے نکاح کیا تو اُسے تفریق کے مطالبہ کا حق نہیں:

(۲) اگر عورت کو پہلے علم نہ تھا، مگر بعد میں علم ہونے کے بعد اس نے اس کے نکاح میں رہنے پر رضامندی کی تصریح کردی تب بھی اس کو مطالبۂ تفریق کا حق باقی نہیں رہا۔

(۳) مرد ایک مرتبہ بھی مباشرت پر قادر نہ ہوا ہو۔ اگر اس نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کرلی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو، تب بھی عورت تفریق کا حق نہیں رکھتی۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں شرطیں درست نہیں ہیں۔ اگر کسی عورت نے قصداً اپنی حماقت سے کسی شخص کو عنین جانتے ہوئے اس سے نکاح کرلیا، تو اس کی یہ سزا معقول اور مناسب نہیں ہے کہ اس کو تمام عمر ایک نامرد شوہر کے ساتھ زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے مفاسد اس قدر بیّن ہیں کہ بیان کی حاجت نہیں۔ ایسی نادان عورت کے لئے بس اسی قدر سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کرکے تفریق کرادی جائے۔

اگر عورت کو نکاح کے بعد شوہر کے نامرد ہونے کا علم ہوا اور اس نے ابتداءً اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کی تصریح کر دی تو یہ کوئی ایسا قصور نہیں جس کی بنا پر اس کو تمام عمر معصیت کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ ابتدا میں اُن فطری تکلیفوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو ایک عنین کی بیوی کو پیش آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نیک طبعی کی بنا پر یہ خیال کرے کہ شوہر اگر عنین ہے تو کیا ہے، میں اسی طرح اس کے ساتھ زندگی بسر کر لوں گی۔ مگر بعد میں اس کو وہ ناقابل برداشت تکلیفیں پیش آئیں جن کا اسے پہلے سے احساس نہ تھا، اور وہ اپنی صحت کی خرابی یا مبتلائے معصیت ہونے کے خوف سے پریشان ہو کر تفریق کی خواہش کرے۔ کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ اس کی پہلی رضامندی کو سند قرار دے کر اس کی زبان پکڑ لی جائے اور اس سے کہا جائے کہ تو نے ابتدا میں جو غلطی کی تھی اس کی یہی سزا ہے کہ اب تو سڑ سڑ کر مر جا، یا آبرو باختہ بن کر زندگی گذار؟ جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے، اور اس سے ایسے نقصانات پیدا ہونے کا امکان ہے جو اس عورت کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں گے بلکہ سوسائٹی میں پھیلیں گے اور نسلوں تک منتقل ہوں گے۔ اتنے بڑے نقصان کو گوارا کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ایک شخص کے نقصان کو گوارا کیا جائے درآں حالیکہ حقیقۃً تفریق میں اس کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی سزا اس غلطی کی اُس عورت کو دی جا سکتی ہے تو وہ بس یہی ہے کہ اسے کل یا جزء مہر سے محروم کر دیا جائے

تیسری شرط بھی ہمارے خیال میں بہت سخت ہے۔ نکاح سے شریعت کا جو مقصد ہے وہ اس قسم کے ازدواجی تعلق سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ اسلام کا قانون کسی آسمانی مخلوق کے لئے نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کے لئے ہے۔ اور عام انسانوں میں جو عورتیں پائی جاتی ہیں ان کے لئے اگر یہ ناممکن نہیں تو غایت درجہ دشوار ضرور ہے کہ ایک یا چند مرتبہ شوہر کی صحبت سے

متمتع ہو جانا ان کے لئے کافی ہو، اور اس کے بعد مدت العمر اس سے محروم رہ کر وہ ہنسی خوشی گذار دیں اور اپنی عصمت کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں۔ بالفرض اگر پچاس فی صدی عورتیں بھی اس پر قادر ہوں، تو ان بقیہ پچاس فی صدی عورتوں کا حشر کیا ہوگا جن کے ضبط و تحمل اور پاکیزگی اخلاق کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے؟ کیا ان کے مبتلائے معصیت ہونے اور سوسائٹی میں ان کی وجہ سے طرح طرح کے مفاسد پھیلنے کی ذمہ داری اُس قانون پر نہ ہوگی جس نے ان کے لئے حلال کے دروازے بند کر کے انہیں حرام کے راستوں پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا؟ پس ہماری رائے میں عنت کی ہر شکایت پر خواہ وہ نکاح سے پہلے کی ہو یا بعد میں حادث ہوئی ہو، عورت کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہونا چاہیئے، اور اگر کافی علاج کے بعد (جس کے لئے ایک سال کی مدت مناسب ہے) یہ شکایت دور نہ ہو تو تفریق کرا دینی چاہیئے۔

فقہائے کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ایک سال تک علاج کرانے کے بعد شوہر نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو، تو عورت کا حق تفریق ہمیشہ کے لئے باطل ہو جائے گا۔ یہاں پھر بیجا شدت پائی جاتی ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس معاملہ میں ماہرین طب کی رائے پر اعتماد کیا جائے۔ اگر علاج کے بعد بھی ماہرین کی رائے یہ ہو کہ مریض، وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے لئے پوری طرح اہل نہیں ہو سکا ہے تو تفریق کرا دینی چاہیئے۔

فقہاء نے خصی کے لئے وہی قانون رکھا ہے جو عنین کے لئے رکھا گیا ہے، یعنی اس کو بھی علاج کے لئے ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے مباشرت پر قادر ہونے کی امید کی جا سکتی ہے (کما فی الھدایہ) لیکن طبی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس معاملہ میں خصی اور مجبوب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ مرد خواہ مقطوع الذکر ہو یا مقطوع الانثیین، دونوں صورتوں میں وظیفۂ زوجیت کے لئے وہ یکساں نااہل ہوتا ہے

اور کوئی علاج اس کی کھوئی ہوئی اہلیت کو واپس نہیں لا سکتا۔ لہذا خصی اور مجبوب کے حق میں ایک ہی قانون ہونا چاہیے۔

جنون | مجنون کے بارے میں حضرت عمر کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے علاج کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی جائے، اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو اس کی عورت اس سے جدا کر دی جائے۔ فقہاء نے اسی فیصلہ کو لیا ہے، اور مختلف طریقوں سے جزئیات میں اس حکم کو جاری کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم صرف اس مجنون کے لئے ہے جو نکاح سے قبل مجنون تھا اور نکاح کے بعد ہمبستری پر قادر نہ ہوا اس لحاظ سے گویا وہ عنین ہے اور اسی لئے اس کو ایک سال کی مہلت دی جاتی ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ کی رائے میں مجنون اگر حادث ہو تو اس کو علاج کے لئے ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔ اور اگر مطبق ہو تو وہ مجبوب کے حکم میں ہے، بلا تاجیل تفریق کرا دی جائے گی۔ امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک حادث اور مطبق دونوں میں ایک سال کی مہلت بغرض علاج دی جائے گی، اور اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو تفریق کرا دی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ فقہائے مالکیہ حسب ذیل شرطیں لگاتے ہیں:-

(۱) اگر نکاح سے پہلے وہ مجنون تھا اور عورت نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا تو وہ تفریق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

(۲) اگر نکاح کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ وہ مجنون ہے اور اس نے بصراحت اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی تب بھی تفریق کا حق باقی نہ رہا۔

(۳) اگر جنون نکاح کے بعد پیدا ہو تو عورت صرف اس صورت میں تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے کہ جنون پیدا ہونے کے بعد اس نے اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی کی تصریح نہ کی ہو اور اپنے اختیار و رضامندی سے اس کو مباشرت یا دواعی مباشرت کا موقع نہ دیا ہو۔

یہ شرطیں اسی نوعیت کی ہیں جن کا ذکر عنین کے باب میں گذر چکا ہے اور ان پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے۔ شریعت، تمدن اور اخلاق کے مقاصد ایسی صورت میں کبھی پورے نہیں ہو سکتے کہ کسی عورت کو ایک پاگل شخص کے ساتھ زبردستی باندھ رکھا جائے۔ اگر اس نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا تو اس کے لئے یہ سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگر نکاح ہو جانے کے بعد اسے جنون کا علم ہوا اور اس نے ابتداءً اس پاگل کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کر دیا، لیکن بعد میں اس کے لئے روحانی و جسمانی تکلیفیں ناقابل برداشت ہو گئیں تو درحقیقت اس نے کوئی ایسا جرم ہی نہیں کیا جس کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ تمام عمر وہ ایک پاگل کے ساتھ رنج، تکلیف اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گذارنے پر مجبور کی جائے۔ اگر نکاح کے بعد جنون پیدا ہوا اور ابتدائی حالت جنون میں عورت نے وفاداری اور رفاقت کے شریفانہ جذبات کی بنا پر اس کو چھوڑنا پسند نہ کیا اور حتی الامکان اس کی خدمت کی، اور سابق کا سا تعلق زن و شوہر اس کے ساتھ رکھنا گوارا کر لیا تو اس سے یہ کیوں لازم آ جائے کہ جب اس کا پاگل پن اس بیچاری کے لئے ناقابل برداشت ہو چکا ہو اس وقت بھی اس کو رہائی دلانے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ قید لگانے سے قانون کا منشا یہ ہے کہ جوں ہی کسی عورت کے شوہر میں آثار جنون ہویدا ہوں، وہ فوراً اس کی تمام پچھلی محبتیں اور رفاقتیں فراموش کر کے اس کے ساتھ بے وفائی اختیار کرے اور اس کو چھوڑ کر چلی جائے، اس خوف سے کہ اگر بعد میں اس جنون نے مستقل ناقابل برداشت صورت اختیار کر لی تو اس وقت کی وفاداری و رفاقت بلائے جان ثابت ہو گی اور اس کا بہت بُرا خمیازہ بھگتنا پڑے گا؟

اس قسم کی شرطیں عائد کرنے میں عورتوں کے ساتھ بہت سختی کی گئی ہے۔ عورت اگر بیکار ہو جائے یا جنون میں مبتلا ہو، یا کسی نفرت انگیز یا مضرت رساں مرض میں مبتلا ہو تو مرد اُسے

طلاق دے سکتا ہے، یا دوسری شادی کر کے اپنی زندگی خوشگوار طریقہ سے بسر کر سکتا ہے۔ لیکن مرد ان حالات میں کسی حالت میں مبتلا ہو تو عورت نہ تو اُسے طلاق دے سکتی ہے، نہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کر سکتی ہے۔ اس کے لئے بجز تفریق کے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اب اگر اس ایک چارہ کار پر بھی ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر حالات میں اس کے لئے مخلصی کی کوئی صورت باقی ہی نہ رہے تو یہ اُس عدل اور توازن کے خلاف ہو گا جو اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ہے۔ ایسے تمام معاملات میں قرآن مجید کی وہ آیات ہمارے لئے دلیل راہ ہونی چاہئیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ نکاح میں معاشرت بالمعروف ہونی چاہیئے، عورت کو مرد کے نکاح میں رکھا جائے تو اس طرح کہ اس میں ضرار اور تعدی نہ ہو، اور حدود اللہ ٹوٹنے کا خوف نہ ہو۔ اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ لازمی شرطیں پوری نہ ہوں تو تسریح باحسان کے قاعدہ پر عمل ہونا چاہیئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک پاگل، یا آتشک زدہ، یا جذامی، یا مبروص شوہر کے ساتھ بجبر و اکراہ بندھے رہنے سے بڑھ کر کسی عورت کے لئے ضرار اور تعدی کی کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اور کون نہیں سمجھ سکتا کہ جو عورت اس حالت میں بجبر رکھی گئی ہو اس کے لئے حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے کس قدر مواقع زندگی میں پیدا ہو سکتے ہیں، اور ان مواقع سے بچنا ایک اوسط درجہ کی عورت کے لئے کس قدر دشوار ہے؟

مفقود الخبر مفقود الخبر کے متعلق قرآن مجید میں کوئی صریح حکم نہیں ہے۔ احادیث میں بھی کوئی معتبر حکم نہیں۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرأۃ المفقود امرأتہ حتّٰی یاتیھا البیان۔ حضور نے فرمایا کہ مفقود کی بیوی اسی کی بیوی ہے جب تک اُس کا حال معلوم نہ ہو جائے۔

لیکن یہ حدیث سوار بن مصعب اور محمد بن شرجیل ہمدانی کے واسطہ سے پہنچی ہے جو

مجروح ہیں۔ ابن شرجیل کے متعلق ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ انہ یروی عن المغیرۃ مناکیر ابالطیل۔ اور سوار بن مصعب کے متعلق ابن القطان نے لکھا ہے کہ وہ متروکین میں ابن شرجیل سے زیادہ مشہور ہے۔ پس یہ حدیث ضعیف ناقابل احتجاج ہے۔ علاوہ بریں مفقود کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہؓ بن عمر جیسے اکابر صحابہ کی آرا میں جو اختلاف ہوا ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان حضرات میں سے کسی کو اس حدیث کا علم نہ تھا، اور نہ ان کے عہد میں کسی صحابی کو اس کی خبر تھی، کیونکہ اگر صحابہ میں سے کوئی بھی اس حدیث سے واقف ہوتا تو وہ ان حضرات کے سامنے اسے پیش کر کے اختلاف کو ختم کر دیتا۔ محمد بن شرجیل اس حدیث کو مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد کی نہایت نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور گورنری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ ان کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہوتی اور وہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے دیتے۔ ان وجوہ سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ مفقود کے بارے میں کوئی حکم منصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق کلیتہً اہل علم کے اجتہاد سے ہے۔

صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کی آرا اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عمر، اور حضرت ابن عباس کی رائے یہ ہے کہ مفقود کی بیوی کو چار سال تک انتظار کا حکم دیا جائے۔ یہی رائے سعید بن المسیب، زہری، نخعی، عطا، مکحول، اور شعبی کی ہے۔ امام مالک نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور امام احمد کا میلان بھی اسی کی طرف ہے۔

دوسری جانب حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ مفقود البحر کی بیوی کو اس وقت تک صبر کرنا چاہیئے جب تک کہ وہ واپس نہ آئے یا اس کی موت کی تحقیق نہ ہو جائے۔

سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔ انتظار کے لئے حنفیہ یہ قاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ جب تک شخص مفقود کے ہم عمر لوگ اس کی بستی یا اس کے ملک میں زندہ ہوں اس وقت تک اس کی بیوی انتظار کرے۔ بعض بزرگوں نے انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کا اعتبار کیا ہے۔ یعنی ایک انسان زیادہ سے زیادہ جس عمر تک پہنچ سکتا ہے اس عمر تک مفقود کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے مثلاً اگر کوئی شخص ۲۰ سال کی عمر میں مفقود ہوا ہو تو اس کی بیوی کو بقول بعض ۹۰ سال اور بقول بعض ۷۰ سال اور بقول بعض ۶۰ سال اور بقول بعض ۵۰ سال یا کم سے کم ۴۰ سال انتظار کرنا پڑے گا، کیونکہ بعض کے نزدیک انسان کی عمر طبعی ۱۲۰ سال ہے اور بعض ۱۰۰ یا ۹۰ یا ۸۰ یا ۷۰ قرار دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں جب ہم قرآن مجید کے اصولی احکام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ اور ان کے متبعین کا مذہب ہم کو صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہی اسلامی قانون کی روح اور اس کے عدل اور اس کے توازن اور اس کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔ قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ چار بیویوں کی اجازت دینے کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ۔ (ایک بیوی کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلق چھوڑ دو)۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کسی عورت کو معلق چھوڑ دینا پسند نہیں کرتا۔ اور جب وہ شوہر کی موجودگی میں اس کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے مفقود ہونے کی صورت میں کیونکر پسند کر سکتا ہے۔ دوسری جگہ شوہروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں سے ایلاء کرو تو زیادہ سے زیادہ چار مہینے تک ایسا کر سکتے ہو، اس کے بعد تم کو طلاق دینا ہوگا۔ یہاں پھر اسلامی قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی صحبت سے اتنی مدت تک محروم نہ رکھی جائے کہ اس کے لئے موجب ضرر ہو یا حدود اللہ سے تجاوز کا سبب

بن جائے۔ پھر وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا فرمایا گیا جس کا منشار صاف طور پر یہ ہے کہ رشتۂ ازدواج میں ضرار نہ ہونا چاہئے، اور یہ ظاہر ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو مدت العمر انتظار کا حکم دینے میں انتہا درجہ کا ضرار ہے۔ اس کے ساتھ وہ آیت بھی قابل غور ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو خلع میں کچھ مضائقہ نہیں یہاں حدود اللہ کی حفاظت کو رشتۂ ازدواج کے قیام پر مقدم رکھا گیا ہے، اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جس عورت کا شوہر برسوں سے مفقود ہو اس کے لئے حدود اللہ پر قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ ان تمام احکام کے اصول اور اُن کے مصالح اور ان کی حکمت پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو ایک غیر معلوم مدت تک انتظار کا حکم دینا اور اس کو معلق رکھ چھوڑنا درست نہیں ہے۔

مذہب مالکی کے احکام | علمار احناف نے انہی وجوہ سے مفقود الخبر کے مسئلہ میں مذہب مالکی کے حکم کے مطابق فتویٰ دینا پسند کیا ہے۔ لہٰذا اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں مالکیہ کے تفصیلی احکام کیا ہیں۔

مذہب مالکی کے لحاظ سے فقدان زوج کی تین صورتیں ہیں، اور ہر ایک کے احکام جدا جدا ہیں:۔

(۱) مفقود نے اپنے پیچھے اتنا مال نہ چھوڑا ہو کہ اس کی بیوی گذر بسر کر سکے۔ اس صورت میں حاکم اس کو انتظار کا حکم نہیں دے گا۔ بلکہ تحقیق حال کے بعد بلا انتظار اس کو باختیار خود طلاق دے دے گا یا اُسے اجازت دے گا کہ اپنے اوپر آپ طلاق وارد کرلے[1] شافعی اور حنبلی مذاہب

---

[1] تطلیق کے لئے حاکم کے بطور خود طلاق دینے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ عورت کو خود اپنے اوپر طلاق وارد کرنے کی اجازت دے، کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے فرمایا تھا کہ انت املك بنفسك ان شئت اقمت مع زوجك وان شئت فارقتيه (یعنی تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے خواہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے یا اس سے جدا ہو جائے)

بھی اس مسئلہ میں مالکی مذہب کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک عدم نفقہ بجائے خود تفریق کے لئے کافی وجہ ہے۔

(۲) مفقود نے مال تو چھوڑا ہے، مگر عورت جوان ہے اور اُس کو کسی طویل مدت کے لئے معلق رکھ چھوڑنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہے۔ ایسی صورت میں حاکم اس کو ایک سال یا چھ مہینے یا جس قدر مدت مناسب سمجھے انتظار کرنے کا حکم دے گا۔ اس باب میں حنبلی مذہب بھی مالکی مذہب کا ہم نوا ہے۔ بلکہ بعض شدید صورتوں میں حنابلہ اور مالکیہ نے بلا انتظار بھی تفریق کو جائز رکھا ہے۔ نیز خوف معصیت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مدعیہ خود منہ پھوڑ کر کہدے کہ مجھے اس شوہر کی قید نکاح سے آزاد کرو ورنہ میں زنا کروں گی۔ بلکہ یہ دیکھنا خود قاضی کا کام ہے کہ جو عورت فقدان زوج کی شکایت لے کر آئی ہے اُس کی عمر کیا ہے، کس ماحول میں رہتی ہے، اور دعویٰ کرنے سے پہلے کس قدر مدت شوہر کے انتظار میں گذار چکی ہے۔ ان چیزوں پر نظر کرنے سے وہ خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس کے اخلاق کی حفاظت کے لئے اُسے مدت انتظار میں کس قدر تخفیف کرنی چاہئے۔

(۳) مفقود نفقہ بھی چھوڑ گیا ہے اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا خوف بھی نہیں ہے اس صورت میں پھر چار شقیں پیدا ہوتی ہیں۔

الف۔ اگر مفقود بلاد اسلام میں یا ایسے ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات ہیں اور جہاں اس کا پتہ چلانا ممکن ہے، تو اس کی عورت کو چار سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

ب۔ اگر وہ میدان جنگ میں کھویا گیا ہے تو اس کی تلاش کی امکانی کوشش کرنے کے بعد ایک سال انتظار کیا جائے گا۔

ج۔ اگر وہ کسی اندرونی فساد کے سلسلہ میں کھویا گیا ہے تو فساد ختم ہونے کے بعد اُس کی تلاش کے لئے امکانی کوشش کی جائے گی پھر بلا انتظار اس کی بیوی کو عدت وفات گذرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔

د۔ اگر وہ ایسے وحشی ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات نہیں ہیں، اور جہاں اس کے تلاش کرنے کا امکان نہیں ہے، تو اس کی بیوی کو مدت تعمیر گذرنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مدت تعمیر کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض ۷۰ سال کہتے ہیں، بعض ۹۰ سال اور بعض ۷۵ سال۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ کافی نفقہ چھوڑ گیا ہو، اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا بھی خوف نہ ہو۔

علماء احناف عموماً اپنے فتاویٰ میں مذہب مالکی کی ان شرائط کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور فقدان زوج کی تمام صورتوں میں چار سال کی مدت انتظار کا فتویٰ دیتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ خصوصاً موجودہ زمانہ میں جب کہ اخلاقی حالات کو بگاڑنے کے بکثرت اسباب پیدا ہو گئے ہیں ہر فاقد الزوج عورت کے لئے چار سال کی مدت انتظار پر اصرار کرنا مصالح شرعیہ کے بالکل خلاف ہے۔ آج اسلامی سوسائٹی میں وہ زبردست اخلاقی ڈسپلن باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھا، غیر اسلامی قوانین کے رواج نے ان تمام بندشوں سے انسان کو آزاد کر دیا ہے جو شہوات نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے اسلام نے قائم کی تھیں۔ سینما، عریاں تصاویر عشقیہ ناولوں اور قصوں کے رواج عام اور عورتوں اور مردوں کے آزادانہ میل جول نے جذبات کو متحرک کرنے کے اتنے سامان پیدا کر دیئے ہیں کہ کسی شخص کے لئے ضبط نفس اور پرہیز گاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں یہ کہاں تک مناسب ہوگا کہ ایک جوان عورت جب اپنے مفقود الخبر شوہر کی واپسی کا دو تین سال انتظار کرنے کے بعد عاجز آ کر عدالت

میں رجوع کرے تو عدالت اس کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم دے۔ یہ ایسی سختی ہے جس میں صرف عورتوں ہی کے لئے ضرر نہیں ہے، بلکہ اس کے مضر نتائج تمام قوم میں پھیل جانے کا خوف ہے۔ لہذا ہماری تجویز یہ ہے کہ قانون میں مفقود الخبر کے متعلق مذہب مالکی کی تمام شرائط کو شامل کیا جائے اور اجرا احکام میں فاقد الزوج عورت کی عمر، اس کے ماحول اور اس مدت کا مناسب لحاظ کیا جائے جس کو حالت انتظار میں گذارنے کے بعد اس نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہو۔

حکم بصورت واپسی مفقود اس سلسلہ میں یہ سوال بھی بحث طلب ہے کہ اگر شوہر مفقود، مدت انتظار کے ختم ہونے کے بعد واپس آئے تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمر کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کے نکاح ثانی سے پہلے اس کا شوہر واپس آگیا تو وہ اُسی کو ملے گی، لیکن اگر عورت نکاح کر چکی ہے تو خواہ شوہر ثانی کے ساتھ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، دونوں صورتوں میں شوہر اول کا اس پر کوئی حق نہ رہا۔ امام مالک نے موطا میں حضرت عمر کے اس قول سے استناد کیا ہے اور یہی مذہب مالکی کا مفتیٰ بہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت ہر حال میں پہلے شوہر کو واپس ملے گی خواہ دوسرے شوہر سے خلوت ہو چکی ہو اور بچے تک پیدا ہو گئے ہوں۔ مزید براں خلوت ہو چکنے کی صورت میں دوسرے شوہر سے اس عورت کو مہر بھی دلایا جائے گا۔ حنفیہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے بھی آخر میں حضرت علی کے اس فیصلہ کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ لیکن امام مالک کے نزدیک حضرت عمر کا رجوع ثابت نہیں ہے (ملاحظہ ہو موطا باب عدۃ التی تفقد زوجھا۔ اور المغنی لابن قدامہ)

حضرت عثمان کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت نکاح ثانی کر چکی ہو، پھر شوہر اول واپس آ جائے تو اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تجھے بیوی چاہئے یا مہر؟ اگر اس نے مہر واپس لینے (یا معاف کر دینے)

کو پسند کیا تو عورت شوہر ثانی کے پاس چھوڑ دی جائے گی۔ اور اگر وہ بیوی کو واپس لینے پر اصرار کرے تو عورت کو اپنے دوسرے شوہر سے جدا ہو کر عدت طلاق گذارنی ہوگی پھر وہ پہلے شوہر کے حوالہ کر دی جائے گی اور دوسرے شوہر سے اس کو مہر دلایا جائے گا۔ بعض روایات میں حضرت عمر سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک ان تینوں فیصلوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ احسن ہے، اس لئے کہ اگر نکاح ثانی ہو جانے کے بعد بھی شوہر اول کا حق عورت پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص ایسی عورت سے نکاح کرنا پسند نہ کرے گا جس کے متعلق اس کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ نہ معلوم کب اس کا پہلا شوہر واپس آجائے، اور نہ صرف عورت اس سے چھن جائے، بلکہ اس کو مہر بھی دینا پڑے، اور بچے ہو جانے کی صورت میں اس کی اولاد الگ برباد ہو۔ اس قسم کی شرط عائد کرنے میں عورت کے لئے غایت درجہ کا ضرر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک طویل اور تھکا دینے والی مدت انتظار گذار کر بھی اس کی مصیبت ختم نہ ہو، عدالت سے آزادی کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے پاؤں میں ایک زنجیر پڑی ہے اور اس کو ساری عمر معلق حالت ہی میں رہ کر گذارنی پڑے۔

لعان | لعان کے متعلق قرآن مجید کا حکم پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اس کے تفصیلی احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

شوہر خواہ اپنی بیوی پر بالفاظ صریح زنا کا الزام لگائے یا اولاد کے متعلق کہے کہ وہ اس کی نہیں ہے، دونوں صورتوں میں لعان واجب آتا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے فریقین کو مخاطب کر کے تین مرتبہ فرمایا: اللہ اعلم ان احدکما کاذب فھل منکم من تائب "اللہ خوب جانتا ہے کہ تم دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے، پھر کیا تم میں سے

کوئی توبہ کرے گا؟" جب دونوں نے توبہ سے اعراض کیا تو آپ نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق پہلے شوہر سے چار قسمیں اس بات پر لیں کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے یہ کہلوایا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ پھر اسی طرح چار قسمیں عورت سے لیں کہ جو الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ غلط ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے کہلوایا کہ اگر یہ الزام صحیح ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا ذالکم التفریق بین کل متلاعنین الی یوم القیمۃ اذا تفرقا لا یجتمعان ابداً "یہ ہر لعان کرنے والے زوجین کے درمیان قیامت تک کے لئے تفریق ہے، اس تفریق کے بعد وہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔" شوہر نے عرض کیا کہ جو مال میں نے اس کو مہر میں دیا تھا وہ واپس دلوایا جائے۔ آپ نے جواب دیا: لا مال لك۔ ان كنت صدقت عليها فبم استحللت من فرجها وان كنت كذبت عليها فذالك ابعد لك منها "مال تجھے نہیں مل سکتا۔ اگر تو نے سچا الزام لگایا ہے تو یہ مال اس تمتع کا معاوضہ ہے جو تو اس سے اٹھا چکا ہے۔ اور اگر تو نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو مال کی واپسی کا استحقاق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا۔"

حضور کے اس فیصلہ سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں:۔

(۱) لعان قاضی کے سامنے ہونا چاہیے، عورت اور مرد آپس میں یا اپنے رشتہ داروں کے سامنے لعان نہیں کر سکتے۔ نہ ایسے لعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔

(۲) لعان سے پہلے قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ ان میں سے کوئی ایک قصور کا اعتراف کرے۔ جب دونوں اپنی اپنی بات پر اصرار کریں تب لعان کرایا جائے گا۔

(۳) فریقین کی طرف سے لعان کا فعل تمام ہونے کے بعد قاضی اعلان کرے گا کہ ان کے درمیان تفریق کر دی گئی۔ جمہور کا خیال ہے کہ لعان سے خود بخود فرقت واقع ہو جاتی ہے لیکن امام ابوحنیفہ کی

رائے یہ ہے کہ تفریق کے لئے حکم حاکم ضروری ہے تمام معتبر احادیث جو اس مسئلہ میں ہم کو پہنچی ہیں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ہر ایسے مقدمہ میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے لعان کا فعل پورا ہونے کے بعد تفریق کا فیصلہ صادر فرمایا ہے، اور محض ملاعنت کو فرقت کے لئے کافی قرار نہیں دیا ہے۔

(۴) لعان سے جو تفریق کی جاتی ہے وہ ابدی ہے۔ اس کے بعد فریقین اگر دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اس معاملہ میں تحلیل کا وہ قانون جاری نہیں ہوتا جو حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۵) لعان سے مہر ساقط نہیں ہوتا۔ خواہ شوہر کا الزام حقیقت میں صحیح ہو یا غلط، بہر صورت مہر اس کو دینا پڑے گا۔ یا اگر دے چکا ہے تو اس کو واپس مانگنے کا حق نہیں ہے۔

اگر عورت پر الزام لگانے کے بعد شوہر لعان کرنے سے انکار کرے تو جمہور کی رائے میں اس پر حد قذف جاری کی جائے گی، اور امام ابوحنیفہ کی رائے میں وہ حد کا نہیں بلکہ قید کا سزاوار ہوگا۔ اسی طرح اگر شوہر کے لعان کر چکنے کے بعد عورت لعان سے انکار کرے تو شافعی مالک اور احمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس کو رجم کیا جائے گا، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس کو قید کیا جائے گا۔ اس باب میں امام اعظم کا مذہب زیادہ صحیح اور مبنی بر مصلحت ہے۔ لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ لعان سے انکار کرنے کو جرم مستلزم سزا قرار دیا جائے، اس لئے سر دست ضابطۂ شرعی میں اس کے لئے مناسب شکل یہ ہوگی کہ اگر مرد لعان سے انکار کرے تو عورت کو اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور اگر عورت انکار کرے تو اسے مہر سے محروم کر دیا جائے۔

تطلیقات ثلثہ در مجلس واحد | بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمار امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ

ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق بائن کے حکم میں۔ لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اُس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اُس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو حضور غصہ میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا أیلعب بکتاب اللہ عزوجل وانا بین اظھرکم: کیا اللہ عزوجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟" بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضور نے اس فعل کو معصیت فرمایا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص ان کے پاس مجلس واحد میں تین طلاق دینے والا آتا تو وہ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے اس فعل پر سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

ہمارے زمانہ میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے۔ لوگ کسی فوری جذبہ کے تحت اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دے دیتے ہیں، پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے، اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور سابق تعلقات باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے نقصان سے بچنے کے لئے متعدد دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تطلیقات ثلثہ در مجلس واحد پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو جسے بیک وقت تین طلاقیں دی گئی ہوں، عدالت میں ہرجانہ کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور ہرجانہ کی مقدار کم از کم مہر کی نصف مقدار تک مقرر کی جائے۔ اس کے علاوہ اور صورتیں بھی روک تھام کی نکل سکتی ہیں جن کو ہمارے علماء اور ماہرین قانون غور و خوض کے بعد تجویز کر سکتے ہیں۔

خاتمہ کلام | اس رسالہ میں اسلامی قانون ازدواج کے مقاصد اور اصول کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور کتاب و سنت کی تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج کل مسلمانان ہند کی ازدواجی زندگی میں مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو کچھ ہم نے اسلام کے قانون کو سمجھا ہے وہ بالکلیہ صحیح ہے، نہ ہم کو اس پر اصرار ہے کہ حل مشکلات کے لئے جو تجویزیں ہم نے پیش کی ہیں ان کو بعینہٖ قبول کر لیا جائے۔ انسانی رائے میں بہرحال خطا و صواب دونوں کا امکان ہے، اور کسی انسانی رائے کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خطا سے پاک اور وحی خداوندی کی طرح واجب الاطاعت ہے۔ ہمارا مقصد اس طویل بحث و تحقیق سے صرف اس قدر تھا کہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اسلامی قانون ازدواج کے جو اصول ہم نے سمجھے ہیں ان کو بیان کر دیں، اور پھر ان اصول سے اکابر صحابہ و ائمہ مجتہدین نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ان پر نظر ڈال کر ایسے فروع اخذ کریں جو ہمارے نزدیک اس زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے مفید اور مناسب ہیں۔ اب یہ اہل علم اور اصحاب فکر و رائے کا کام ہے کہ وہ بحث نظر اور تدبر فی الکتاب والسنہ سے کام لے کر ہماری ان تجاویز پر غور کریں۔ اگر اس میں کچھ خطا پائیں تو اس کی اصلاح کر دیں۔ اور اگر کوئی چیز صواب نظر آئے تو اس کو محض اس بنا پر رد نہ کر دیں کہ لکھنے والا بدقسمتی سے چوتھی صدی کے بجائے چودھویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔

آخر میں ہم ان مسودات قانون کے متعلق بھی مجملاً اپنی رائے ظاہر کر دینا چاہتے ہیں جو اس سلسلہ میں حیدر آباد اور برطانوی ہند کے بعض حضرات نے مرتب کئے ہیں[1]۔ ہمارے نزدیک یہ سب مسودے تشنہ اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے غیر مکتفی ہیں۔ اس قسم کے مختصر مسودات سے ان خرابیوں کو دور نہیں کیا جا سکتا جو انگلو محمڈن لا کے نقائص اور غیر مسلم عدالتوں کے صد سالہ نظائر اور موجودہ عدالتی نظام کے طریق کار سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر چند خاص معاملات میں یہ طے کر دیا گیا کہ فقہ حنفی کے

[1] یہاں ان مسودوں کے محض نفس مضمون سے بحث ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ آیا مجالس قانون ساز کو بجائے خود کوئی

(باقی بر صفحہ ۹۹)

بجائے فقہ مالکی کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ یا بعض مسائل میں جزئیات کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی، تو اس سے وہ حکام عدالت کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے جو قوانین شریعت اور مذاہب فقہیہ کے جزئیات پر کوئی وسیع نظر نہیں رکھتے، اور جن کے دماغوں پر وہی اینگلو محمڈن لا کی اسپرٹ مسلط ہے۔ اس بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خاص کر ازدواجی معاملات کے لئے ایک مفصل ضابطہ مرتب کیا جائے جیسا کہ ہم اس رسالہ کے گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ وقت اور محنت چاہتا ہے۔ اور ایک شخص کے بس کا بھی نہیں۔ اس کے لئے اصحاب علم و رائے کی ایک منتخب جماعت کو ایک کافی مدت تک سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے، اور یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیئے کہ وہ محض متقدمین کی کتابوں سے جزئیات کو لفظ بلفظ نقل کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، بلکہ امت کے ارباب حل و عقد ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ قوانین شریعت کی ایسی تعبیر کریں جس سے شریعت کے اصلی مقاصد پورے ہوں اور قوم کے دین، اخلاق اور معاملات کی حفاظت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے۔

(بقیہ حاشیہ صـ۹۸) "اسلامی قانون" پاس کرنے کا حق ہے بھی یا نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے جو قانون یہ پاس کریں، خواہ وہ لفظ بلفظ شریعت کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، بہرحال وہ شرعی قانون نہیں ہو سکتا۔

یورپ کے قوانین طلاق و فسخ و تفریق

[تعرف الاشیاء باضدادھا۔ اسلامی قانون ازدواج کی جو تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں ان کو دیکھ کر پوری طرح اس قانون کی شان کمال کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کے ان قوانین کا مطالعہ نہ کیا جائے جن کے متعلق ترقی یافتہ قوانین ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر انسان جب خود اپنا قانون ساز بنتا ہے تو کس قدر ٹھوکریں کھاتا ہے۔]

اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اصول اور اساسی احکام میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اخلاق کا ایک بلند ترین نصب العین پیش نظر رکھتا ہے تو دوسری طرف انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک طرف وہ تمدنی و اجتماعی مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے تو دوسری طرف افراد کے حقوق بھی پامال نہیں ہونے دیتا۔ ایک طرف وہ واقعی حالات پر نگاہ رکھتا ہے تو دوسری طرف ایسے امکانات کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا جن کا کسی وقت عالم واقعہ میں آنا متوقع ہے۔ غرض یہ ایک ایسا معتدل قانون ہے جس کا کوئی قاعدہ اور کوئی حکم افراط و تفریط کی جانب مائل نہیں ہے۔ قانون سازی میں جتنے مختلف پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ان سب کا اس میں نظری حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عملاً پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، اور ان کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا گیا ہے کہ کہیں کسی ایک طرف نامناسب میلان اور کسی دوسرے پہلو سے غیر منصفانہ اعراض نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تیرہ سو

برس سے یہ قانون مختلف ملکوں مختلف زمانوں، مختلف، تمدنی حالات، اور مختلف علمی مراتب اور مزاجی کیفیات رکھنے والی قوموں میں رائج رہا ہے اور کہیں کسی شخصی یا اجتماعی تجربے نے اس کے کسی اساسی حکم کو غلط یا قابل ترمیم نہیں پایا۔ یہی نہیں بلکہ انسانی فکر باوجود سعی بلیغ، اس کی کسی چیز کا ایسا بدل تجویز کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکی جو اعتدال اور توازن اور تناسب میں اس کے لگ بھگ بھی پہنچتا ہو۔

یہ کیفیت جو اسلامی قانون میں پائی جاتی ہے، صرف الٰہی حکمت و بصیرت ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ انسان اپنے لازمی تقیدات اور اپنی فطری محدودیتوں کے ساتھ کبھی اس پر قادر ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے، حال اور مستقبل پر یکساں نظر رکھے، مابالفعل اور مابالقوہ پر ایک ساتھ نگاہ ڈالے، خود اپنی اور اپنے تمام ابنائے نوع کی فطرت کے چھپے اور ظاہر خصائص کا پورا پورا لحاظ کرے، اپنے ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد ہو جائے، اور اپنے جذبات اور طبعی رجحانات اور عقلی کوتاہیوں اور علمی نارسائیوں سے یکسر پاک ہو کر کوئی ایسا قاعدہ وضع کر سکے جو ہر حال اور ہر زمانے اور ہر ضرورت پر ٹھیک ٹھیک عدل اور مناسبت کے ساتھ منطبق ہو سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قوانین انسانی فکر پر مبنی ہوتے ہیں ان میں صحیح توازن نہیں ہوتا۔ کہیں نظریات میں بے اعتدالی ہوتی ہے۔ کہیں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی رعایت میں کوتاہی کی جاتی ہے۔ کہیں اشخاص کے حقوق اور واجبات متعین کرنے میں عدل نہیں ہوتا۔ کہیں شخص اور جماعت کے درمیان حدود اور حقوق کی تقسیم میں بے انصافی ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ ہر نئے تجربے اور ہر متغیر حالت اور ہر بدلے ہوئے زمانے میں ایسے قوانین کی کمزوریاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں، اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ یا تو ان میں ترمیم کرے یا اعتقاداً ان کا متبع رہ کر عملاً ان کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔

الٰہی قانون اور انسانی قانون کے درمیان یہ بنیادی فرق آج اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ بجز اندھوں

اور شیرہ چشموں کے ہر شخص اس کو دیکھ سکتا ہے۔ کل تک تعصب یا جہل کی وجہ سے اسلامی قانون کے جن احکام اور اصولوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کئے جاتے تھے، اور ان کے مقابلے میں انسانی قوانین کے جن نظریات اور قواعد پر فخر کا اظہار کیا جاتا تھا آج ان کے متعلق کسی بحث و استدلال کے بغیر محض واقعات ہی کی ناقابل انکار شہادت سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے کہ جو کچھ اسلام نے سکھایا تھا وہی صحیح تھا اس کے خلاف جتنے طریقے انسانی قوانین نے تجویز کئے تھے وہ سب غلط اور ناقابل اتباع نکلے، اگرچہ عالم تخیل میں وہ بہت ہی درخشاں نظر آتے تھے۔ زبانیں اب بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے انکار کرتی ہیں، مگر عملاً دنیا اُن قوانین کو توڑ رہی ہے جن کو کل تک وہ نہایت مقدس اور ناقابل ترمیم سمجھتی تھی اور آہستہ آہستہ ان اُصول و قواعد کی طرف رجوع کر رہی ہے جو اسلام نے مقرر کئے تھے، لیک بعد از خرابی بسیار۔

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلہ کو لے لیجئے جس پر ابھی چند سال پہلے تک یہی دنیا مسلمانوں کو کیسے کیسے طعنے دیتی تھی، اور بہت سے مرعوب مسلمانوں کو شرمندگی کے مارے جواب بن نہ آتا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ازدواج کے مقدس رشتے کو ناقابل انقطاع قرار دینا اور قانون میں طلاق و خلع اور فسخ و تفریق کی گنجائش نہ رکھنا مسیحیت کا کوئی حکیمانہ فعل نہ تھا، بلکہ محض انسانی فکر کی بے اعتدالی کا نتیجہ تھا، اور اس میں اخلاق و انسانیت اور نظام تمدن کی فلاح نہیں بلکہ تباہی کے اسباب مضمر تھے۔

مسیح کے یہ الفاظ کس قدر شاندار ہیں کہ:-

"جسے خدا نے جوڑا اُسے آدمی جدا نہ کرے" (متی ۱۹: ۶)

مگر مسیحیوں نے نبی کے اس قول کا منشا نہ سمجھا اور اسے اخلاقی ہدایت کے بجائے قانون ازدواج کی اساس بنا لیا۔ انجام کیا ہوا؟ مسیحی دنیا صدیوں تک اس ناقابل عمل قانون کے خلاف حیلوں اور مکر و فریب کے ساتھ عمل کرتی رہی پھر خلاف ورزی قانون کی عادت بد نے اتنی ترقی کی کہ جو اخلاقی

حدیں رشتہ ازدواج سے زیادہ مقدس تھیں ان کو بھی بکثرت اور علانیہ توڑا جانے لگا۔ آخر کار انسانوں نے مجبور ہو کر اُس قانون میں چند جزوی اور ناقص ترمیمیں کیں جس کو وہ غلطی سے خدا کا قانون سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ اصلاحی قدم اُس وقت اٹھایا گیا جب قانون شکنی کی عادت نے پیروانِ مسیح کے دلوں میں خدا کی جوڑی ہوئی چیز کا احترام باقی ہی نہ چھوڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان جزوی اور نہایت ناقص ترمیموں ہی کی بدولت مسیحی دنیا میں طلاق اور فسخ و تفریق کا ایک طوفان امنڈ آیا جس کی شدت سے نظامِ عائلی کی "مقدس" دیواریں پاش پاش ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ انگلستان جہاں ۱۸۷۱ء میں صرف ۱۶۶ تفریقیں ہوئی تھیں، وہاں ۱۹۳۳ء میں چار ہزار سے اوپر تفریقیں ہوئیں، یعنی خدا کے جوڑے ہوئے ہر ۷۹ رشتوں میں سے ایک کو آدمی نے جدا کر دیا۔ امریکہ جہاں ۱۸۸۶ء میں ۳۵ ہزار تفریقیں ہوئی تھیں وہاں ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ ۸۳ ہزار مقدس رشتے قطع کئے گئے۔ فرانس میں تو اب قریب قریب ہر ۵ شادیوں کا انجام طلاق پر ہو رہا ہے۔ اور کم و بیش یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا بھی ہے۔

مسیح نے جو تعلیم دی تھی اُسی سے ملتی جلتی تعلیم قرآن میں بھی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ[1] (البقرہ: ۳)۔ مسیح نے یہودیوں کی "سخت دلی" اور طلاق کی کثرت کے خلاف نفرت دلانے کے لئے کہا تھا کہ "جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسرا بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے" (متی ۱۹: ۹)۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس غرض کے لئے اس سے زیادہ سچے تلے الفاظ میں طلاق کو ابغض المباحات (جائز کاموں میں سے سب سے زیادہ برا کام) فرمایا اور نفس پرستی کی خاطر طلاق دینے والے کو ملعون ٹھیرایا۔ مگر یہ اخلاق کے بلند پایہ اصول محض اشخاص

---

[1] جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور ان تعلقات کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، یقیناً وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

کی تعلیم کے لئے تھے تاکہ وہ اپنے عمل میں ان کو پیش نظر رکھیں، نہ یہ کہ انہیں کو بجلسہ لے کر ایک قانون کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم صرف معلم اخلاق ہی نہ تھے بلکہ صاحب شریعت بھی تھے، اس لئے آپ نے اصولِ اخلاق بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قانون میں ان اخلاقی اصولوں کی آمیزش کا صحیح تناسب کیا ہونا چاہیے اور اصول اخلاق و مقتضیاتِ فطرتِ انسانی کے درمیان کس طرح توازن قائم رہ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے مسیح علیہ السلام صاحب شریعت نہ تھے بلکہ اجرائے شریعت کی نوبت آنے سے پہلے ہی دنیا میں ان کی نبوت کا مشن ختم ہو گیا تھا اس لئے ان کے ارشادات میں اخلاق کے ابتدائی اصولوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ زندگی کے عملی مسائل پر ان اصولوں کا صحیح انطباق اگر ہو سکتا تھا تو موسوی شریعت کی روشنی ہی میں ہو سکتا تھا۔ مگر مسیحی یہ سمجھنے اور سینٹ پال نے ان کو یہ سمجھایا کہ ان اصولوں کو پا لینے کے بعد اب ہم الٰہی شریعت سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور یہ خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ "چرچ" کا کام ہے کہ ان اصولوں کی بنا پر خود قوانین بنائے۔

یہ عظیم الشان غلط فہمی تھی جس نے چرچ اور اس کے متبعین کو ہمیشہ کے لئے گمراہی میں ڈال دیا مسیحیت کی دو ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جتنے اصول دین بتائے تھے ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بھی کوئی صحیح قانون بنانے میں چرچ کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور آخر کار مسیحی قومیں ان اصولوں ہی سے انحراف کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

مسیح نے طلاق کی جو برائی کی تھی اس میں "حرام کاری" کا استثنار کر کے گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ طلاق مطلقاً بری چیز نہیں بلکہ سبب جائز کے بغیر مبغوض ہے۔ مسیحی اس کو نہ سمجھے اور اسے اوپر والی آیت "جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے" سے متعارض سمجھ کر بعض نے تو یہ رائے قائم کر لی کہ یہ استثنار بعد کا اضافہ ہے اور بعض نے اس سے یہ مسئلہ نکال لیا کہ "حرام کاری" کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے، مگر رشتۂ نکاح بدستور قائم رہے، اور دونوں میں سے کسی کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت

نہ ہو۔ صدیوں تک مسیحی دنیا اسی پر عمل کرتی رہی اور منجملہ دوسرے قوانین کے یہ قانون بھی مسیحی قوموں کے اندر بداخلاقی کے رواج کا بہت کچھ ذمہ دار ہے۔

لطف یہ ہے کہ چرچ کے اثر سے آزاد ہو جانے اور بالکل عقلی اصولوں پر قانون سازی کا ادعا کرنے کے باوجود انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں اب تک قانونی تفریق (Judicial separation) کے معنی یہی سمجھے جاتے ہیں کہ زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے مگر دونوں نکاح ثانی کے مجاز نہ ہوں۔ یہ ہے انسانی عقل کی کوتاہیوں کا حال۔

کلیسائے روم کے مذہبی قانون (Canon Law) میں مذکورۂ بالا اصول کی بنا پر جو قواعد بنائے گئے تھے ان کی رو سے طلاق (Divorce) یعنی رشتۂ نکاح کا کامل انقطاع جس کے بعد زوجین کو الگ الگ نکاح کرنے کا حق حاصل ہو، قطعاً ممنوع تھا۔ البتہ تفریق کے لئے ۶ صورتیں تجویز کی گئی تھیں:۔

(۱) زنا یا جرائم خلاف وضع فطری۔

(۲) نامردی۔

(۳) ظالمانہ برتاؤ۔

(۴) کفر۔

(۵) ارتداد

(۶) زوجین کے درمیان حرام خونی رشتوں میں سے کوئی رشتہ نکل آنا۔

ان چھے صورتوں میں جو قانونی چارۂ کار تجویز کیا گیا وہ یہ تھا کہ زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہمیشہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ کون صاحب عقل اس چارۂ کار کو مطابق عقل کہہ سکتا ہے؟ دراصل یہ کوئی قانونی چارۂ کار نہ تھا بلکہ ایک سزا تھی جس کے خوف سے لوگ تفریق کے مقدمے ہی عدالتوں میں لے جاتے ہوئے ڈرتے تھے، اور اگر کسی قضا کے مارے ہوئے جوڑے کی تفریق ہو جاتی تھی تو اسے لامحالا یا تو رہبانیت

کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی، یا پھر مدت العمر حرام کاری میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔

اس شدید اور ناقابل عمل قانون سے بچنے کے لیے مسیحی علمائے بہت سے شرعی حیلے نکال رکھے تھے جن سے کام لے کر چرچ کا قانون ایسے بدنصیب زوجین کا نکاح فسخ کر دیتا تھا۔ من جملہ ان کے ایک حیلہ یہ تھا کہ اگر کسی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ زوجین نے مدۃ العمر ساتھ رہنے کا جو عہد کیا تھا وہ بلا ارادہ اُن سے سرزد ہو گیا تھا ورنہ دراصل ان کا مقصود محض ایک محدود مدت کے لیے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا (متعہ) تھا، تو اس صورت میں مذہبی عدالت فسخ نکاح یا بالفاظ صحیح تر بطلان نکاح (Nullity) کا اعلان کر دے گی۔ مگر مسیحی قانون کی رُو سے "بطلانِ" نکاح کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ زوجین میں کوئی نکاح ہی نہیں ہوا، اب تک ان کے درمیان ناجائز تعلقات تھے اور ان سے جو اولاد ہوئی وہ حرامی تھی! اس معنی کے لحاظ سے یہ دوسرا قانونی چارہ کار پہلے سے بھی ذلیل تر تھا۔

رومن چرچ کے بالمقابل مشرقی کلیسا (Orthodox Eastern Church) نے جس کو فقہ اسلامی سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ مواقع ملے ہیں نسبتہً ایک بہتر اور قابل عمل قانون بنایا ہے۔ اس کے نزدیک بندِ نکاح سے زوجین کو حسب ذیل وجوہ کی بنا پر آزاد کیا جا سکتا ہے:

(۱) زنا، یا اس کے مقدمات (۲) ارتداد۔ (۳) شوہر کا اپنی زندگی کو قیس کی حیثیت سے مذہبی خدمت کے لیے وقف کرنا۔ (۴) بغاوت (۵) نشوز (۶) نامردی (۷) جنون (۸) برص و جذام (۹) طویل مدت کے لئے قید ہونا۔ (۱۰) نفرت باہمی یا شدید ناموافقت مزاج۔

لیکن مغربی ممالک کے مذہبی پیشوا اس قانون کو نہیں مانتے۔ وہ کلیسائے روم کی فقہ پر ایمان لا چکے ہیں جس میں قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ رشتۂ نکاح بجز موت کے کسی اور چیز سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اب اس فتوے کے بعد ان کے لیے عقل سے کام لینا تو درکنار خود اپنے ہی دین کے ایک دوسرے مذہب فقہی پر غور کرنا بھی حرام ہے۔ ۱۹۱۲ء کے رائل کمیشن کے سامنے بشپ گور (Bishop Gore) نے

مشرقی کلیسا کے بعض مسائل اخذ کرنے کی مخالفت محض اس حجت کی بنا پر کی کہ انگریزی چرچ رومن کلیسا کی فقہ کا پابند ہے ۱۹۳۰ء کی (Lambeth Conference) میں بالفاظ صریح یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم کسی ایسے مرد یا عورت کا نکاح ہی نہیں پڑھا سکتے جس کا سابق شریک حیات ابھی زندہ موجود ہو۔ آخری اصلاح جس پر ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک مجلس (Joint Committee of Convocation) متفق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر نکاح سے پہلے کوئی فریق امراض خبیثہ میں مبتلا ہو، یا موروثی خرابی دماغ یا نقص جسمانی کا شکار ہو، اور نکاح کے وقت اس کو دوسرے فریق سے چھپایا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور نکاح کے وقت اس نے شوہر سے اپنے حمل کو مخفی رکھا ہو تو نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کے بعد ایسی کوئی صورت پیش آئے تو نہ عورت کے لئے مذہبی حیثیت سے کوئی چارۂ کار ہے اور نہ مرد کے لئے!

یہ تو تھا مذہبی گروہ کا حال جس میں صدیوں تک پے در پے بڑے بڑے عقلا، علما اور فقہا پیدا ہوئے، مگر ابتدا میں ان کے پیشواؤں سے مسیح علیہ السلام کے ایک ارشاد کا مفہوم اور اس کی قانونی حیثیت سمجھنے میں جو غلطی ہوئی تھی، اس کا اثر ان کے دل و دماغ پر ایسا گہرا جم گیا کہ امتداد زمانہ، تغیر احوال، علمی و عقلی ارتقاء، انسانی فطرت کا مطالعہ، سینکڑوں برس کے تجربات، خود صریح عقل کے فیصلے اور دوسرے بہتر قوانین کے نظائر، غرض یہ سب چیزیں مل جل کر بھی ان کو اس اثر سے آزاد نہ کر سکیں، اور دو ہزار برس کی طویل مدت میں بھی رومن چرچ کے بہترین دماغ اپنے قانون کا توازن درست کرنے اور اس کو اعتدال کے صحیح نقشے پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اب ذرا ایک نظر ان روشن خیال اور وسیع علم و تجربہ رکھنے والے واضعین قانون کے کارناموں پر بھی ڈال لیجئے جنہوں نے مذہبی قانون کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی قوموں کے لئے خود اپنے علم کے بل بوتے پر ازدواجی قوانین بنائے ہیں۔

انقلاب فرانس سے پہلے تک یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک میں رومن چرچ کا مذہبی قانون نافذ تھا، اور اس نے دوسرے ایسے ہی قوانین کے ساتھ مل کر مغربی قوموں کی معاشرت اور ان کے اخلاق کو بہت سی شدید خرابیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انقلابی دور میں جب آزاد و تنقید اور آزادانہ تفکر کی ہوا چلی تو سب سے پہلے اہل فرانس نے اس قانون کے نقائص کو محسوس کیا اور یہ دیکھ کر کہ علمائے دین کسی طرح اس کی اصلاح پر آمادہ نہیں کیے جا سکتے، سرے سے اس کا جوا ہی اپنے کندھوں سے اتار پھینکا (۱۷۹۲ء)۔ اس کے بعد یہی ہوا دوسرے ممالک میں بھی چلی اور رفتہ رفتہ انگلستان، جرمنی، آسٹریا، بیجیم، ہالینڈ، سویڈن ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ وغیرہ نے مذہبی قانون کو چھوڑ کر اپنے اپنے جداگانہ قوانین نکاح و طلاق وضع کر لیے جن میں قانونی تفریق اور فسخ کے علاوہ طلاق کے لیے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طرح مسیحی اقوام کے ایک جم غفیر کا اپنے مذہبی قانون سے آزاد ہو جانا براہ راست نتیجہ ہے اس تنگ نظری، جہل اور تعصب کا جس کی بنا پر مسیحی علما ایک ناقابل عمل، خلاف فطرت اور سخت مضرت رساں قانون کو جبراً محض مذہب کی طاقت سے مسلط رکھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا نہ تھا۔ محض چند انسانوں کے اجتہاد پر مبنی تھا لیکن پادریوں نے اس کو خدائی قانون کی طرح مقدس اور ناقابل ترمیم قرار دیا۔ انھوں نے اس کی کھلی ہوئی غلطیوں، مضرتوں، اور خلاف عقل امور کو دیکھنے اور سمجھنے سے قطعی انکار کر دیا محض اس لئے کہ کہیں سینٹ پال اور فلاں اور فلاں ائمہ متقدمین کے نکالے ہوئے مسائل میں غلطی کا امکان ہی فرض کر لینے سے ان کا ایمان سلب نہ ہو جائے حتیٰ کہ انہوں نے خود اپنے دین کے ایک دوسرے فقہی مذہب سے بھی استفادہ کرنے کی مخالفت کی، نہ اس بنا پر کہ مغربی چرچ کا قانون مشرقی چرچ کے قانون سے بہتر ہے بلکہ صرف اس بنا پر کہ ہم مغربی چرچ کے مقلد ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کے اس طرز عمل نے مغربی قوموں کے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار باقی ہی نہ رکھا کہ وہ ایسے قانون کی بندشوں کو توڑ پھینکیں جس کی غلطیاں اور مضرتیں ظاہر ہو جانے کے باوجود قابل اصلاح نہیں سمجھی جاتیں۔

ایک قانون ازدواج ہی پر کیا موقوف ہے۔ دراصل یہی پادریانہ ذہنیت یورپ کی قوموں کو الحاد و دہریت اور لامذہبی کی طرف دھکیل دھکیل کر لے گئی ہے۔

مذہبی قانون سے آزاد ہونے کے بعد مغربی ممالک میں گذشتہ ستر اسی سال کے اندر جو ازدواجی قوانین وضع کئے گئے ہیں ان کو بنانے میں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں دماغوں نے اپنی بہترین قابلیتوں کے ساتھ حصہ لیا ہے، اور نئے تجربات کی روشنی میں پے در پے ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کرتے رہے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے قوانین میں وہ توازن اور اعتدال پیدا نہیں ہو سکا ہے جو عرب کے ایک اُمّی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پیش کئے ہوئے قانون میں پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مذہبی قانون سے آزاد ہو کر بھی وہ اپنے دل و دماغ کو اُن تصورات سے اب تک پاک نہیں کر سکے ہیں جو انہیں رومن چرچ کے ابتدائی بانیوں سے وراثت میں ملے ہیں۔

مثال کے طور پر انگلستان کے قانون کو لیجیے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک وہاں صرف زنا اور ظالمانہ برتاؤ دو ایسے وجوہ تھے جن کی بنا پر قانونی تفریق کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ طلاق جس کے بعد زوجین نکاح ثانی کے لئے آزاد ہوں اُس وقت تک وہاں ممنوع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قانون میں مذکورۂ بالا دو وجوہ کے ساتھ ایلا (یا انقطاع تعلق زن و شو (Desertion)) کو بھی ایک جائز وجہ تفریق قرار دیا گیا بشرطیکہ وہ دو سال یا اس سے زیادہ مدت تک جاری رہا ہو۔ علاوہ بریں اسی قانون میں طلاق (یعنی عقدۂ نکاح سے قطعی آزادی) کو بھی جائز کیا گیا، مگر اس کے لئے لازم کر دیا گیا کہ مرد عدالت سے رجوع کرے۔ بطور خود وہ طلاق نہیں دے سکتا۔ اور اسی طرح عورت کے لئے بھی لازم کیا گیا کہ اگر وہ طلاق لینا چاہے تو گھر کے گھر ہی میں مرد سے معاملہ طے نہیں کر سکتی، بلکہ ہر حال میں اسے بھی عدالت سے ہی رجوع کرنا ہوگا۔ پھر عدالت کے لئے طلاق کی ڈگری دینے کی خاطر ایک ہی صورت رکھی گئی، اور وہ یہ کہ اگر مرد طلاق چاہتا ہو تو وہ بیوی کا مرتکب زنا ہونا ثابت کرے، اور اگر عورت طلاق چاہتی ہو تو وہ شوہر کے ارتکاب زنا اور اس کے ساتھ ہی ظالمانہ برتاؤ

یا نشوز کا بھی ثبوت دے۔ اس طرح گویا عورتوں اور مردوں کو مجبور کیا گیا کہ خواہ وہ کسی وجہ سے ایک دوسرے کو چھوڑنا چاہتے ہوں، بہرحال ان کو ایک دوسرے پر زنا کا الزام ضرور لگانا پڑے گا، اور ایک کھلی عدالت میں اس کا ثبوت دے کر ہمیشہ کے لئے سوسائٹی کے ایک فرد کی زندگی کو داغدار بنا دینا ہوگا۔ اس قانون نے زنا کے جھوٹے الزامات تراشنے کا دروازہ کھولا، عدالتوں کو سوسائٹی کے تمام گندے کپڑے دھونے کی جگہ بنا دیا، اور پھر عدالتہائے طلاق کے مقدمات کی اشاعت گویا بداخلاقی کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی۔ مزید براں اس قانون نے شوہروں کو دیوثی کی بھی تعلیم دی، کیونکہ اس میں شوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کے ناجائز دوست سے ہرجانہ بھی وصول کر سکتا ہے، یعنی عورت کی عصمت کا معاوضہ! تمتع ناجائز کی قیمت جو قرمساقوں کا ذریعہ آمدنی ہوا کرتی ہے!!

۱۸۶۶ء کے قانون میں عدالت کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو نکاح کو توڑنے کے ساتھ ساتھ خطاکار شوہر پر مطلقہ عورت کے نفقہ کا بار بھی ڈال سکتی ہے ۱۹۰۷ء کے قانون میں شوہر کے خطاکار ہونے کی شرط اڑا دی گئی، اور عدالت کو مطلقاً یہ حق دیا گیا کہ جہاں مناسب سمجھے مطلقہ عورت کے نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ڈال دے۔ یہ عورتوں کے ساتھ کھلی ہوئی جانبداری ہے اور یہاں صاف طور پر توازن بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ جب عورت اور مرد کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو محض سابق تعلق کی بنا پر ایک غیر عورت کو ایک غیر مرد سے نفقہ دلوانا درانحالیکہ اس نفقہ کے بالمقابل اس مرد کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، نہ عقلاً درست ہے اور نہ اس کو مبنی بر انصاف کہا جا سکتا ہے۔

۱۸۹۵ء کے قانون میں طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم و ستم کی وجہ سے اس کا گھر چھوڑ کر نکل جائے اور اس سے الگ رہے تو عدالت شوہر کو اس کے پاس جانے سے

روک دے گی، اور اُسے نفقہ دلوائے گی اور بچوں کو بھی اپنے پاس رکھنے کا مجاز قرار دے گی۔ اسی قانون میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے بُرے برتاؤ یا تغافل کے سبب سے زنا کی مرتکب ہو تو اس کے خلاف طلاق کے لئے شوہر کا دعوے قابل سماعت نہ ہوگا! ذرا اس کے معنی پر غور کیجئے۔ شوہر کا ظلم ثابت کر کے عورت اس سے الگ جا بسے، شوہر کو پاس نہ پھٹکنے دے، خرچ کے لئے اُس سے روپیہ لے اور دوستوں کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھائے! پھر شوہر اگر ایسی عورت سے پیچھا بھی چھڑانا چاہے تو نہ چھڑا سکے۔ یہ ہے وہ قانون ازدواج جو انیسویں صدی کے آخری دور میں انگلستان کے بہترین دماغوں نے پچاس برس کی پے در پے محنتوں سے مرتب کیا!

۱۹۱۰ء میں طلاق اور ازدواجی معاملات پر غور کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے تین سال کی محنت کے بعد ۱۹۱۲ء کے اواخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان میں سے چند یہ ہیں:-

(۱) اسباب طلاق کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے یعنی جن وجوہ کی بنا پر مرد طلاق کی ڈگری پانے کا مستحق ہے، انہی وجوہ کی بنا پر عورت بھی طلاق حاصل کرنے کی مستحق ہو۔ مثلاً اگر شوہر ایک مرتبہ بھی زنا کا مرتکب ہو تو عورت اس سے طلاق لے سکے۔

(۲) طلاق کے سابق وجوہ میں حسب ذیل وجوہ کا اضافہ کیا گیا:- تین سال تک چھوڑے رکھنا۔ بدسلوکی۔ ناقابل علاج جنون جب کہ اس پر پانچ برس گذر چکے ہوں۔ شرابی پن[1] کی ایسی لت جس کے چھوٹنے کی امید نہ رہی ہو۔ وہ قید کی سزا جو سزائے موت سے معاف کر کے دی گئی ہو۔

---

[1] شرابی پن کے معنی مغربی اصطلاح میں عادۃً شراب پینے کے نہیں ہیں بلکہ حد سے زیادہ شراب پی کر عربدہ کرنے اور اودھم مچانے اور مار پیٹ، گالم گلوچ اور برسرِ بازار بیہودگیاں کرنے کے ہیں۔

(۳) شرابی پن کی بنا پر تین سال کے لئے زوجین میں تفریق کرائی جائے۔ اور اگر اس مدت میں یہ لت نہ چھوٹے تو ضرر رسیدہ فریق کو طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق ہو۔

(۴) نکاح سے قبل اگر کسی فریق کو جنون یا امراض خبیثہ میں سے کوئی مرض ہو اور دوسرے فریق سے چھپایا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور اس نے اپنا حمل مخفی رکھا ہو تو اس کو فسخ نکاح کے لئے کافی وجہ قرار دیا جائے۔

(۵) مقدمات طلاق کی رپورٹیں دوران مقدمہ میں نہ شائع کی جائیں اور بعد میں عدالت روداد کے جن حصوں کو شائع کرنے کی اجازت دے صرف انہی کو شائع کیا جائے۔

ان تجاویز میں سے صرف پہلی تجویز کو جو سب سے زیادہ نامعقول تھی قبول کر کے ۱۹۲۳ء کے قانون معاملات ازدواج (Matrimonial Causes Act) میں شائع کیا گیا، باقی جتنی تجویزیں تھیں ان میں سے کسی کو بھی اب تک قانون کی صورت نہیں دی گئی، کیونکہ کنٹربری کے اسقف اعظم (Archbishop of Canterbury) اور بعض دوسرے با اثر لوگ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

انگلستان کے بہترین قانونی دماغوں کے تفقہ کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ وہ عورت اور مرد کے ارتکاب زنا کا قانونی اور فطری فرق تک سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اُن کی اس غلط قانون سازی کی بدولت عورتوں کی طرف سے اپنے شوہروں کے خلاف طلاق کے دعووں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ انگلستان کی عدالتیں ان سے پریشان ہو گئیں اور ۱۹۲۸ء میں لارڈ مری ویل (Lord Merrivale) کو ان کی روک تھام کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

یورپ کے جن ممالک میں رومن چرچ کا اثر زیادہ ہے وہاں اب تک رشتۂ نکاح ناقابل انقطاع ہے البتہ بعض صورتوں میں قانونی تفریق ہو سکتی ہے جس کے بعد نہ زوجین مل سکتے ہیں نہ آزاد ہو کر

نکاح ثانی کر سکتے ہیں۔ آئرلینڈ اور اٹلی کے قوانین اسی قاعدہ پر مبنی ہیں۔

فرانس میں قانون ازدواج نے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ انقلاب کے بعد طلاق کو نہایت آسان کر دیا گیا۔ نپولین کے قانون (Code Napoleon) میں اس پر چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ ۱۸۱۶ء میں اس کو قطعاً ممنوع کر دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں پھر اسے جائز کیا گیا، اور اس کے بعد ۱۸۸۶ء ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۶ء میں اس کے لئے مختلف قوانین بنائے گئے جن کی رو سے طلاق کے لئے حسب ذیل وجوہ قرار دیئے گئے ہیں:۔ زوجین میں سے کسی کا ارتکاب زنا، ظالمانہ برتاؤ، اعدالزوجین کا کوئی ایسا فعل جس سے اس کے ساتھی کی عزت پر حرف آئے، حقوق زوجیت ادا کرنے سے انکار، شراب نوشی کی لت، عدالت سے کوئی ایسی سزا پانا جو موجب ذلت ہو۔ علاوہ بریں عدالت سے طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عورت کے لئے تین سو دن کی عدت بھی مقرر کی گئی ہے جو اسلامی قانون کی ناقص تقلید ہے۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں قوانین طلاق ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں مگر ناقص اور غیر معتدل ہونے میں سب متفق ہیں:۔

آسٹریا، بلجیم، سوئٹزرلینڈ اور ناروے میں زوجین صرف باہمی رضامندی سے طلاق کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ خلع سے ملتی جلتی چیز ہے مگر اس کی ناقص نقل ہے۔

جرمنی میں زوجین میں سے کسی ایک کا دوسرے کو چھوڑ دینا اور اس سے بے تعلق ہو کر رہنا موجب طلاق نہیں تاوقتیکہ یہ فعل مسلسل ایک سال تک جاری نہ رہے۔ یہ قانون ایلارکا ایک دھندلا سا عکس ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں اس کے لئے تین سال کی مدت ہے، اور ہالینڈ میں پانچ سال کی۔ دوسرے ممالک کے قوانین اس باب میں ساکت ہیں۔

مفقود الخبر کے لئے سویڈن میں ۶ سال کی مدت انتظار ہے اور ہالینڈ میں دس سال۔ دوسرے

ممالک کے قوانین مفقود الخبر کے باب میں خاموش ہیں۔

مجنون کے لئے جرمنی، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں تین سال کی مہلت ہے، باقی کسی ملک کا قانون مجنون کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

بلجیم میں مطلقہ کے لئے دس مہینے کی عدت ہے، فرانس اور بلجیم کے سوا کہیں عورت کے نکاح ثانی کے لئے مدت انتظار مقرر نہیں کی گئی۔

آسٹریا میں احد الزوجین کا پانچ سال یا اس سے زیادہ کی سزائے قید پانا دعوئے طلاق کے لئے کافی ہے۔ بلجیم میں مجرد سزایاب ہونا عورت یا مرد کو اپنے رفیق کے خلاف طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق دار بنا دیتا ہے۔ سوئیڈن اور ہالینڈ میں اس کے لیے حبس دوام کی شرط ہے۔

یہ ان قوموں کے قوانین ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ان پر ایک نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ایک مکمل اور معتدل قانون بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کے مقابلے میں اسلامی قانون کو جو شخص انصاف کی نظر سے دیکھے گا اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عدل، توازن، فطرت انسانی کی رعایت، فتنوں کے سدباب، اخلاق کی حفاظت، تمدنی مصالح کی نگہداشت، اور ازدواجی زندگی کے تمام مسائل و معاملات پر جامعیت کے ساتھ حاوی ہونے میں اسلامی قانون جس کمال کو پہنچا ہوا ہے اس کا عشر عشیر بھی مغربی قوانین کو نہ صرف فرداً فرداً بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی نصیب نہیں ہوا، حالانکہ یہ قوانین انیسویں صدی کے "روشن" زمانے میں یورپ کے سینکڑوں ہزاروں علماء و عقلاء نے قریب قریب ایک صدی کے غور و خوض، چھان بین اور قانونی تجربات کے بعد وضع کئے ہیں، اور اُس قانون کو اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کا ایک اُمّی بادیہ نشین پیش کر گیا ہے جس نے اس قانون سازی میں کسی پارلیمنٹ، کسی کمیشن، کسی جماعتِ ماہرین سے مشورہ نہیں لیا۔

اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی کہتا ہے کہ اسلامی قانون خدا کا نہیں انسان کا بنایا ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ ایسے انسان کو تو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا۔ مگر اس کی صداقت کا اس سے زیادہ بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ایسے فوق البشری کارنامے کا کریڈٹ نہیں لیا اور صاف کہا کہ میں اپنے دل و دماغ سے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتا، جو کچھ مجھے خدا سکھاتا ہے وہی تم تک پہنچا دیتا ہوں۔

پھر اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کے باوجود اگر انسان اپنی زندگی کے معاملات میں ہدایتِ الٰہی کی ضرورت سے انکار کیے چلا جائے، اور آپ اپنا ہادی و شارع بننے ہی پر اصرار کرتا ہے تو بجز اس کے کہ اس کی اس ضد کو حماقت کہا جائے، اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اُس شخص سے بڑھ کر احمق کون ہوگا جس کو ایک بے غرض اور خیر خواہ رہ نما سیدھا راستہ بتانے کے لئے موجود ہو، مگر وہ کہے کہ میں تو خود ہی راستہ تلاش کروں گا، اور اس تلاش میں خواہ مخواہ مختلف راستوں پر بھٹکتا پھرے۔

تدوین حدیث

(از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ)

حدیث کے متعلق ایک مدت سے ہندوستان میں غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں جن کی بنا چاہے نیک نیتی پر ہی ہو، مگر بہر حال ناواقفیت پر تو ضرور قائم ہے اور اس سے فی الواقع دین کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ حال میں اس فتنہ میں پھر تازہ روح پھونکی گئی اور بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہوئے۔ ترجمان القرآن میں اس سے پہلے حدیث کے متعلق متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں جن میں سے اکثر میری کتاب تفہیمات حصۂ اول میں جمع کر دیئے گئے ہیں، لیکن کوئی مبسوط بحث کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ الحمد للہ کہ اس کمی کو جناب مولانا مناظر احسن صاحب نے بطریق احسن پورا کر دیا ہے۔

مولانا کا یہ مضمون دراصل جامعۂ عثمانیہ کے توسیعی خطبات کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کو ہندوستان کے متعدد رسالوں نے قسط وار اپنے صفحات میں شائع کیا ہے، مگر اقساط میں تقسیم ہو جانے کی وجہ سے اس کا پورا فائدہ حاصل نہ کیا جا سکا۔ یہاں اس کو بتمام و کمال ایک ہی اشاعت میں درج کیا جا رہا ہے، اور کوشش کی جائے گی کہ اسے الگ کتابی صورت میں بھی طبع کرا لیا جائے تاکہ اس کی اشاعت عام ہو سکے۔ میں مولانا کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس رسالہ کو نہ صرف ترجمان القرآن میں، بلکہ الگ کتابی صورت میں بھی شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ کم علمی کی وجہ سے حدیث کے بارے میں بدگمانیاں رکھتے ہیں وہ اس مقالہ کو طالب علمانہ نظر سے مطالعہ کریں گے۔

ابوالاعلیٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

علم حدیث پر بحث کرنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے ان چند سوالات کو رکھ لینا چاہیئے ۔

(۱) حدیث کی حقیقت کیا ہے،

(۲) اس علم کی تدوین کب، کس طریقہ سے کس زمانہ میں شروع شروع ہوئی، اور ان طریقوں کا اس علم کے وثوق و اعتماد پر کیا اثر مرتب ہوا یا ہو سکتا ہے،

(۳) ابتدا سے اس وقت تک اس فن کی ممتاز خدمتیں جن بزرگوں نے انجام دیں، خود ان کی اور ان کے کارناموں کی تفصیل،

(۴) اس فن کے متعلق کن جدید تکمیلی کوششوں کی ضرورت باقی ہے،

(۵) حدیث کے بعد فن حدیث کے دوسرے متعلقات یعنی فن اسماء الرجال اور اصول حدیث کی حقیقت ان کی تاریخ، موجودہ حیثیت، ان میں آئندہ ترقیوں کے امکانات۔

حدیث کی حقیقت سب سے پہلے میں پہلے سوال کو لیتا ہوں یعنی حدیث کی حقیقت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ عموماً دنیا میں دو طرح کی قومیں پائی جاتی ہیں۔ بعض بلکہ شاید زیادہ تر قومیں ایسی ہیں جنہوں نے اپنے حال کو ماضی سے وابستہ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ کسی قوم کا کوئی حال ماضی سے الگ ہو کر تصور پذیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اس واقعہ کے جیسے جیسے وہ آئندہ کی طرف بڑھتی رہیں، اپنے ماضی کو بھلاتی چلی آئیں۔ ان کے پاس اپنے موجودہ حالات پر غور و فکر کرنے کے لئے گذشتہ حالات و واقعات، تجربات و مشاہدات کا کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ گویا جس طرح جنگل کی زندگی گذاری جاتی ہے، یہ بھی گذارتے ہیں۔ آخر ریچھوں اور بندروں کو کیا معلوم کہ ان کے جد اعلیٰ کون تھے، کن کن جنگلوں اور وادیوں

پہاڑوں سے چھلانگیں مارتے ہوئے، ان کے آباؤ اجداد موجودہ مقام تک پہنچے۔ کن کن حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔

لیکن ان کے مقابلہ میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ ان قوموں کا بھی ہے جنہوں نے حتی الوسع اس کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حال کی تعمیر میں ماضی کے تجربات و واقعات سے نفع اٹھایا جائے، اور اس کے لئے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ گذرے ہوئے واقعات کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کر لیا جائے۔ انسانیت کے اس گروہ کی اسی کوشش کا نام تاریخ ہے۔ ابتدا میں تاریخ کی حفاظت و بقا کا شوق قوموں میں کم رہا ہے، لیکن اب تو یہ ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گئی ہے کہ اپنی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ ہر قوم اس پر خرچ کر رہی ہے جس سے ہم اور آپ سب واقف ہیں۔ جنگل کی زندگی بسر کرنے والے بھی اب اپنے اجداد و اسلاف کے کارناموں کی جستجو گڑی ہوئی ہڈیوں اور پرانے مقبروں اور مرگھٹوں میں کر رہے ہیں۔ کونہ کونہ سے قدیم سکے برآمد کئے جا رہے ہیں، کہنہ قبروں کی کتابوں کے حروف کے پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پرانے کھنڈروں کی ایک ایک ٹھیکری چنی جا رہی ہے۔ ان ہی پر واقعی کہیے یا خیالی بلند و بالا عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ گویا اس علم کی ناگزیر ضرورت کو دنیا کی اکثر قوموں نے اب تسلیم کر لیا ہے، اور بجز چند ذہنی الطبع نشکی مزاج، خشک دماغ فلسفیوں کے، عام دنیا کا شدید رجحان بھی ان چیزوں کے جاننے کی طرف ہے۔

تاریخ اور فن حدیث | دنیا کی اسی تاریخ کے ایک عظیم الشان، حیرت انگیز انقلابی حصہ کا نام سچ پوچھئے تو حدیث ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جن انقلابات و حوادث سے گزر کر نسل انسانی موجودہ حالت تک پہنچی ہے، ان میں ایک ایسا واقعہ، جس نے کسی خاص شعبہ حیات ہی میں نہیں، بلکہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، تمام شعبوں میں انسانیت کا رخ پلٹ دیا، جس سے زمین کا کوئی خاص حصہ نہیں بلکہ بلا مبالغہ مشرق و مغرب دونوں متاثر ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے

رہیں گے، ماضی کے اسی مدہش حیرت انگیز واقعہ کی تاریخ یا تفصیلی بیان کا نام حدیث ہے۔ اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے حدیث کا تعلق قرار دیا جاتا ہے لیکن جہاں تک واقعات و حالات کا تعلق ہے میں "حدیث" کو "انسانیت" کی تاریخ کا ایک حصہ اور ایسا حصہ قرار دیتا ہوں جس کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے۔ کہ ایک بے نظیر عدیم المثال عالمگیر انقلابی عہد سے اس کا تعلق ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو آج جس کسی کے پاس یا جس قوم و امت کے ہاتھ میں بھی ماضی بلکہ حال کی تاریخ کا جو حصہ ہے وہ وثوق و اعتماد میں تاریخ کے اس "محفوظ حصہ" یعنی حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں ان آزردہ فطرت شکیوں میں نہیں ہوں، جو تاریخ کو جھوٹ کا جنگل قرار دے کر ماضی کا انکار کرتے ہیں، اور "جو کچھ محسوس ہو رہا ہے یہی محسوس ہو رہا ہے" اس سوفسطائی نظریہ پر زور دے کر حال کے وجود کو بھی شک کے دانتوں سے چبا کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ تاریخ کے مقررہ معیار پر ماضی کے جن واقعات کی اب تصحیح ہو چکی ہے اس کی قدر کرتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ آئندہ کی راہ درست کرنے کے لئے ہمیں ہمیشہ ماضی کی روشنی سے نفع اٹھانا چاہیئے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (لوگوں سے پچھلے قصے بیان کیا کرو تاکہ وہ سوچیں)

لیکن اگر یہ صحیح ہے، جیسا کہ ایک بڑے مشہور مسلم الثبوت مؤرخ کا بیان ہے کہ:۔

"کسی زمانہ کے حالات جب قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر مقام کی باناری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں، جو قرائن و قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑے زمانہ کے بعد (یعنی کتابی شکل اختیار کرنے کے بعد) یہی ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتی ہے۔ یورپ کی اکثر تصنیفیں اسی اصول پر لکھی گئی ہیں"۔

اور اس وقت ہمارے پاس ماضی کی تاریخوں کا جو ذخیرہ ہے خواہ وہ روم ہو یا یونان، چین ہو یا ایران ان قدیم اقوام کی تاریخ جن ذرائع سے مرتب ہوئی ہے، اگر ان کے اساسی سرچشموں کی جانچ کی جائے گی تو جو کچھ اس فاضل مورخ نے بیان کیا ہے، بہت کچھ اس کی توثیق کرنی پڑے گی۔ مشکل ہی سے انسانوں کے پاس اس وقت کوئی ایسی تاریخی یادداشت مل سکتی ہے، جسے واقعہ کے عینی شاہدوں نے خود مرتب کیا ہو، یا ان کے براہ راست بیانوں کو خود ان ہی سے سن کر کتابوں میں درج کیا ہو۔ اتفاقاً اگر کوئی ایسی چیز مل بھی جائے تو اس کا پتہ چلانا قطعاً دشوار بلکہ شائد ناممکن ہے کہ ضبط و اتقان، سیرت و کیرکٹر کے لحاظ سے ان کا کیا درجہ تھا۔ معتبر سے معتبر ترین کسی تاریخی ذخیرہ کے وثوق کے متعلق اگر کوئی بات پیش کی جاسکتی ہے تو یہی ہے کہ جس زمانہ میں واقعہ گزرا ہے مورخ خود بھی اس زمانہ میں موجود تھا۔ اتفاق سے کسی واقعہ کے متعلق اگر ایسی شہادت میسر آجاتی ہے تو تاریخ کا یہ حصہ زریں شاہکاروں میں شریک کر دیا جاتا ہے۔ لیکن خود اس معاصرت کا یہ حال ہے کہ قدیم ماضی کے تاریک زمانہ کو تو جانے دیجئے، آج جب کہ جدید صناعات و ایجادات نے زمین کی طنابیں کھینچ کر ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملا دیا ہے، تعلیم عام ہو چکی ہے، کم از کم یورپ کے مکتبوں اور اسکولوں میں روئے زمین کے اطلسوں کا مطالعہ ہر ایک کو کرا دیا جاتا ہے، لیکن ایک واقعہ نہیں، آئے دن ایسی ایسی جہالتوں اور غلط فہمیوں کے شکار غریب جاہل مشرقی ہی نہیں بلکہ فرزانہ دوانا فرنگ کے ارباب خبر و علم ہوتے رہتے ہیں کہ بعض دفعہ آدمی کو حیرت ہو جاتی ہے، اور "تاریخ جھوٹ کا جنگل ہے"، دماغ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس دعویٰ میں کچھ واقعہ کا عنصر بھی شریک ہے؟ بہت پرانے زمانہ کی بات نہیں ہے کہ ۱۹۰۵ء میں کانگڑہ (پنجاب) کا مشہور زلزلہ ہندوستان میں آیا تھا۔ ایک نہیں بلکہ متعدد انگریزی اخباروں میں اس زلزلہ کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "کانگڑہ جو بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے وہاں ایک سخت زلزلہ آیا"۔ اور بیچارے اخبار والے تو شہر خبروں کی جماعت ہے، عام طور پر گپ نویسی میں یہ بدنام ہے، لیکن مشہور ریفرنس بک ہینرل کی اینوئیل جو مشہور

کتاب ہے اور ہر قسم کے حوالجات کے لئے ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں اسی زلزلے کے متعلق یہ عبارت اس وقت تک موجود ہے :-

"ایک سخت زلزلے نے ایک وسیع ضلع میں جو آگرہ اور شملہ کے درمیان واقع ہے عام تباہی اور سخت نقصان برپا کیا"

نقصان کی تفصیل بتاتے ہوئے صرف اسی مورخ نے نہیں، بلکہ دوسروں نے بھی یہ ارقام فرمایا ہے کہ "اس سے کئی سو آدمی ہلاک ہوئے" حالانکہ پنجاب گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق اس زلزلہ میں بیس ہزار سے کم آدمی ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ معاصر مورخین کی کتابوں میں اگر اس قسم کی ظرفیوں اور بوالعجبیوں کو تلاش کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

سیاحوں کی یادداشتوں کو بھی تاریخی وقائع کے ثبوت میں بہت اہمیت دی جاتی ہے اور اس سے بے پروا ہو کر دی جاتی ہے کہ خود اس سیاح کا اپنے ذاتی رجحانات، سمجھ بوجھ، سچائی اور استبازی میں کیا حال تھا۔ لیکن ان سیاحوں کی بدولت واقعات کی صورت کبھی کبھی کتنی مسخ ہو جاتی ہے اس کا ایک سرسری اندازہ ہمارے موجودہ میر شعبۂ دینیات (نواب ناظر یار جنگ جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ) کے ڈرائنگ روم کی ایک تصویر سے ہو سکتا ہے جو انگلستان کے ایک معتبر اخبار سے الگ کر کے محفوظ کی گئی ہے۔ یہ ہندوستان کے ایک موقع کی تصویر ہے اور اس کے نیچے چوب خط حروف میں یہ لکھا ہوا ہے کہ "بودھ مذہب کے لوگ اپنی ایک مشہور مذہبی رسم جوادیا کے نام سے موسوم ہے ادا کر رہے ہیں" میں نے اس تصویر کے نیچے جب اس فقرہ کو پڑھا، تو بار بار حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ کیا ہے۔ تصویر سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت نماز پڑھ رہی ہے۔ اُن کی شکل و صورت، لباس، وضع، قطع، طریقہ نشست، ہر چیز ہندی مسلمانوں کی تھی۔ لیکن معتبر سیاح نے جس وقت یہ فوٹو لیا تھا اس کے نیچے اس نے یہی عبارت درج کی تھی۔ آخر جب میر شعبہ صاحب باہر تشریف لائے تو ان سے پوچھنے پر معلوم ہوا

کہ آپ نے قصداً اس تصویر کو اسی لئے محفوظ کیا ہے تاکہ یورپین سیاحوں کی تاریخی شہادت کی ایک گواہی مہیا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دہلی میں نماز عید کے موقعہ کی تصویر ہے۔ ایک مغربی سیاح نے اس عید کو اڈیا بنایا اور اڈیا کو خدا جانے کس طرح اس نے بودھ مذہب والوں کی رسم قرار دے کر اخبار میں اپنے اس جدید اکتشاف کا اعلان کیا۔

ان چند تشکیکی مثالوں کے پیش کرنے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ واقعی میں دنیا کے موجودہ تاریخی ذخیروں کو بالکلیہ غیر معتبر اور ناقابل لحاظ قرار دینا چاہتا ہوں۔ بلکہ مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان کمزوریوں کے باوجود بھی آج جب علمی دنیا میں "فن تاریخ" ہر قسم کے احترام و اعزاز کا مستحق ہے، تو "حدیث" جو صرف مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تمام دنیا کی انسانیت کے ایک عظیم انقلابی عہد آفریں دور کا ایک ایسا مکمل تاریخی مرقع ہے جسے ٹھیک حقیقی اور اصلی شکل و صورت بلکہ ہر خط و خال کی حفاظت میں لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی وہ ساری کوششیں اور تدبیریں صرف ہوئی ہیں جو کسی واقعہ کی حفاظت کے متعلق آدمی کا دماغ سوچ سکتا ہے، بلکہ اس کی حفاظت و صیانت میں بعض ایسے قدرتی عوامل نے بھی کام کیا ہے (جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا) جو دنیا کے کسی تاریخی واقعہ کو نہ اس درجہ تک میسر آئے اور نہ آئندہ آسکتے ہیں، کس احترام و اعزاز کا مستحق ہونی چاہیئے۔

<u>حدیث کی مدرسی تعریف</u> لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہوں، اس پر بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ حدیث، جس کے متعلق نہ جاننے والوں کا تو صرف یہ خیال ہے کہ وہ دینیاتی طرز کی کوئی چیز ہے، اور دینیات کے لفظ کے ساتھ ہی ان کا دماغ فوراً دور وحشت کے ان قدیم خرافات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جسے بدقسمتی سے اس زمانہ میں مذہب یا مذہب کی ایک قسم خیال کیا جاتا ہے۔ گویا دینیات کے معنی چند وہمی رسوم و عادات، یا چند رٹے ہوئے الفاظ منتر، جنتر، جادو، ٹونکے وغیرہ کے ہیں، جن میں صحرائی باشندے کسی زمانہ میں کیا اب تک مبتلا ہیں۔ مذہب کے متعلق جن کے دماغوں میں اس قسم کے خیالات ہیں،

حدیث جو مسلمانوں کے مذہبی علوم کا ایک جزو ہے، اس کے متعلق میرے ان دعوؤں کو سن کر ممکن ہے کہ انہیں حیرت ہو۔ اور ان کی حیرت تو چنداں محل تعجب نہیں، اس لئے کہ "جہل" ان مسکینوں کے لئے بڑا عذر ہے۔ لیکن جاننے والوں کو بھی شاید شبہہ ہوتا ہوگا کہ مدرسہ میں جس فن کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور ایسے واقعات جو اُن کے سامنے پیش آئے لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی (جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں) غرض پیغمبر کے اقوال و افعال و تقریر کا نام حدیث ہے اور بعضوں نے اس کو آگے بڑھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور بعضوں نے صحابہ کے شاگردوں یعنی تابعین کے اقوال و افعال کو بھی اس فن کے ذیل میں شریک کر لیا ہے۔

کہاں حدیث کی یہ مدرسی اور مذہبی تعبیر، اور کہاں میرا یہ دعویٰ کہ حدیث مسلمانوں ہی کی نہیں، بلکہ انسانیت کے اہم ترین انقلابی عہد کی تاریخ کا معتبر ترین ذخیرہ ہے۔ ان دونوں میں کیا نسبت ہے۔ شاید یہ خیال کیا جاتا ہو کہ زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر میں نے اپنی تعبیر بدلی ہے۔ لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر چیز کے سمجھانے کے لئے اسی زبان میں گفتگو کی جاتی ہے جسے مخاطب سمجھ سکتے ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ میں نے اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کچھ الفاظ ضرور بدلے ہیں۔ لیکن الفاظ کے بدلنے سے واقعات نہیں بدلتے۔ جو نہیں جانتے ہیں، انہیں تو آئندہ بتایا جائے گا لیکن جو جانتے ہیں کہ حدیث کا تعلق کس ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہے، کیا وہ اس کا انکار کر سکتے ہیں کہ جن الفاظ میں اس فن کی میں نے تعبیر پیش کی ہے کیا یہی اصل واقعہ نہیں ہے؟ اسلامی تحریک نے اپنے زمانہ آغاز سے اس وقت تک مشرق و مغرب کے باشندوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی پہلوؤں کے انقلاب میں جو کام کیا ہے اور کر رہا ہے، اُن کو پیش نظر رکھنے کے بعد مسلمان ہی نہیں کوئی نامسلمان بھی کیا حدیث کی اس تاریخی تعبیر کا انکار کر سکتا ہے جسے میں نے پیش کیا ہے؟

ماسوا اس کے سچ یہ ہے کہ بالکلیہ یہ میری تعبیر ہے بھی نہیں۔ فن حدیث کے سب سے بڑے

امام، امام الائمہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا جو نام رکھا ہے، اگر اسی پر غور کر لیا جائے تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ سمجھنے والوں نے ہمیشہ اس فن کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب آج تو صرف "بخاری شریف" کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں ہے بلکہ خود حضرت امامؒ نے اپنی کتاب کا نام۔

الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ"

رکھا ہے۔ اس میں "امور" اور "ایام" کے الفاظ قابل غور ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو۔ آگے ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا، یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی تھی کہ فن حدیث دراصل اس عہد اور زمانہ کی تاریخ ہے جس میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جیسی ہمہ گیر عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی۔ بہرکیف، اگر اصطلاحی جھگڑوں سے الگ ہو کر پھل سے درخت کے پہچاننے کے اصول کو مدنظر رکھا جائے تو حدیث کے موجودہ ذخیرہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی ایک معمولی آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ حدیث کی صحیح حقیقت اور اس کی واقعی تعریف وہی ہو سکتی ہے جس کی طرف حضرت امام بخاری نے اپنی کتاب کے نام میں اشارہ فرمایا ہے اور میں نے جس کی تشریح کی ہے۔

غالباً "حدیث" کی حقیقت یا تعریف کے لئے میرا یہ مختصر بیان کافی ہو سکتا ہے۔ درسی کتابوں میں جیسا کہ ہر تعریف کے قیود و شرائط پر بحث کر کے بات کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، میں ان دور از کار لفظی گورکھ دھندوں میں آپ لوگوں کو الجھا کر وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا، اس لئے اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے اب میں دوسرے ضروری سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ تاریخ کے اس حصہ کی تدوین کس طرح اور کس زمانہ میں عمل میں آئی؟ اسی سوال کے جواب میں آپ

کے سامنے وہ امتیازات اور خصوصیات بھی آجائیں گے جو تاریخ کے اس حصہ کو دنیا کے دوسرے تاریخی ذخیروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

اس تاریخ کے ابتدائی مورخین کی خصوصیات

اتنا تو کم از کم ہر لکھا پڑھا آدمی جانتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی پاک، یا بالفاظ امام بخاری "امور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم و رواۃ" کے پہلے رواۃ یا ابتدائی مورخین وہی حضرات ہیں جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے فیض یاب تھے، یعنی صحابہ کرام۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان بزرگوں نے تاریخ کے اس حصہ کی روایت کیا اُن ہی اسباب کے تحت کی جن کے زیر اثر دنیا کی دوسری تاریخیں مدوّن ہوئی ہیں؟ میرا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے عام تاریخی سرمایوں کی تدوین میں جس طرح عموماً حال کو ماضی سے مربوط رکھنے کا جذبہ یا پچھلوں کی مجلسوں کو پہلوں کی داستانوں سے گرم رکھنے کا ذوق کارفرما رہا ہے، کیا حدیث کی تدوین بھی اسی جذبہ کے تحت ہوئی؟ میرا خیال ہے کہ حدیث کی تدوین کی بحث چھیڑنے سے پہلے سخت ضرورت ہے کہ پہلے ان اسباب، یا جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اُن قدرتی عوامل کو سامنے لایا جائے جو دنیا کی عام تاریخ سے اس خاص حصہ یعنی حدیث کو بالکل جدا کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس بحث میں آپ کا کچھ زیادہ وقت میں لوں، لیکن بات چونکہ بالکل نئی ہے، اس لئے اجمال سے کام لینے میں اندیشہ ہے کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ شائد پورے طور سے ذہن نشین نہ ہو سکے۔ میں ان امتیازی اسباب و عوامل کو الگ الگ کر کے بیان کرتا ہوں۔

عام تاریخی ذخیروں سے حدیث کے امتیازات

(۱)

عام تاریخوں سے تاریخ کے اس حصہ کو جو پہلا امتیاز حاصل ہے وہ اُس امر کی بساط سے ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس اس وقت تاریخ کے جو عام ذخیرے

ہیں عموماً اُن کا تعلق کسی قوم کی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ، الغرض اِسی قسم کی منتشر اور پراگندہ گوناگوں چیزوں سے ہے جن کا احاطہ آسان نہیں ہے۔ بخلاف اس کے حدیث اُس تاریخ کا نام ہے جس کا تعلق براہ راست ایک خاص شخصی وجود، یعنی سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ ایک قوم، ایک ملک، ایک حکومت، ایک جنگ کے تمام اطراف و جوانب کو صحیح طور پر سمیٹ کر بیان کرنا ایک طرف ہے، اور دوسری طرف ملک نہیں ملک کی کوئی خاص قوم نہیں، کسی قوم کا کوئی قبیلہ نہیں، کسی قبیلہ کا کوئی خانوادہ نہیں، بلکہ صرف ایک واحد بسیط شخص کی زندگی کے واقعات کا بیان کرنا ہے۔ خود اندازہ کیجئے کہ احاطہ و تدوین کے اعتبار سے دونوں کی آسانی و دشواری میں کوئی نسبت ہے؟ پہلی صورت میں کوتاہیوں، غلطیوں غلطیوں کے جتنے قوی اندیشے ہیں، یقیناً اسی نسبت سے دوسری صورت میں صحت و واقعیت کی اسی قدر عقلاً توقع کی جاسکتی ہے۔

(۲)

دوسرا امتیاز جو پہلے امتیاز سے بہت زیادہ اہم ہے، وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے مورخوں یعنی صحابہ کرام کا باہمی تعلق ہے۔ بلاشبہ اس وقت ہمارے سامنے مختلف اقوام و ممالک، سلاطین اور حکومتوں کی تاریخیں ہیں لیکن جن مورخوں کے ذریعہ سے یہ تاریخیں ہم تک پہونچی ہیں، کیا اُن میں کسی تاریخ کا اپنے مورخ یا مورخین سے وہ تعلق تھا جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام کے ساتھ تھا؟ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مشکل ہی سے آج کوئی ایسا تاریخی حصہ ہمارے پاس نکل سکتا ہے جس کے مورخین خود ان واقعات کے عینی شاہد ہوں، بلکہ جیسا کہ پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے، عموماً ان تاریخوں کی تدوین یوں ہی ہوئی ہے کہ ابتدا میں مبہم مجہول الحال افواہوں کی صورت میں واقعات اِدھر اُدھر بکھرے رہے، پھر ان میں سے جب کسی کو شوق ہوا تو اس نے ان ہی افواہوں کو قلمبند کرنا شروع کیا، پھر خود اس مورخ ہی نے یا اس کے بعد والوں نے قرائن و قیاسات سے جہاں تک ممکن ہوا،

جس حصہ کو چاہا باقی رکھا، جسے چاہا قلم زد کر دیا۔ یہ تو شروع میں ہوا بلکہ کوچوں جوں ان قلم بند شدہ واقعات پر زمانہ گزرتا گیا، اوراق میں زیادہ بوسیدگی پیدا ہوئی، کیڑوں کی خوراک سے بچ کر جو حصہ باقی رہا پچھلی نسلوں کے لئے وہی تاریخی دستاویز بن گیا۔ آج اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں سے زیادہ بھروسہ قلمی کتابوں پر ہے، اور قلمی کتابوں میں بھی سب سے زیادہ قیمتی وہ مسودات ہیں جو بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکے ہوں۔ اور سنگی، برنجی یا آہنی تختیوں کا کوئی ذخیرہ اگر کسی مورخ کو مل گیا تو وہی چیز جو ہمارے ہی جیسے انسانوں نے کسی زمانہ میں لکھ کر زمین میں گاڑ دی تھی، بلکہ ہم تو اپنے معاصرین کو ایک حد تک جانتے بھی ہیں، لیکن ان کے لکھنے والوں[1] کا تو کچھ پتہ نہیں ہوتا، مگر کیا کیجیے کہ بایں ہمہ وہ معصوم فرشتوں کے بیان کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ مذکورۂ بالا کلیہ سے تاریخ کے بعض حصے مستثنیٰ بھی ہیں، خصوصاً اسلامی دور میں مسلمان بادشاہوں کے حکم سے جب تاریخوں کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا، اور باضابطہ شاہی وسائل و ذرائع کے ذریعہ سے مورخوں کو واقعات کے فراہم کرنے میں امداد دی گئی، یقیناً ان کتابوں کی نوعیت قدیم تاریخوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ اسی طرح

---

[1] بلکہ اگر بعض ثقہ راویوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ ہندوستان کی بعض قوموں کے علمی مرکزوں میں "قدیم ہند" کے لئے تاریخی مواد فراہم کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی گئی ہے کہ آہنی اور برنجی پتروں یا تختیوں پر پرانی زبانوں اور پرانے حروف میں اپنے مطلب کے موافق عبارتیں کندہ کر لی جاتی ہیں، اور کسی مشہور آثاری کھنڈر میں ان ہی کو دفن کر دیا جاتا ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد ان ہی کو نکال کر علمی ذخیرہ میں جدید اکتشاف کی حیثیت سے ان کا اور ان سے جو نتائج نکلتے ہیں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علم پر جاہلوں کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہم جن قدیم کتبوں پر اندھا دھند ایمان لا رہے ہیں، ان میں بھی اشتباہ کی کس حد تک گنجائش ہے۔ بلکہ سکندر کی لاتبنی مدفون زر ہوں کا افسانہ اگر صحیح ہے تو صرف کتبے ہی نہیں بلکہ ان کھنڈروں سے جو چیزیں نکل رہی ہیں اور ان سے جو نتائج نکالے جا رہے ہیں وہ بھی محل ۴

۴ غور و فکر سے رہ جاتے ہیں۔

ان لوگوں کے سامنے گونج رہا تھا، جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اس کی آواز میں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔

ان کا یہ فیصلہ غلط تھا، یا صحیح، مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ لیکن حضرات صحابہ کرام کے اس "فیصلہ" کا عالم مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کو ہے۔ بتایا جائے کہ دنیا کے کس تاریخی واقعہ سے اس کے مورخین اور راویوں کا یہ تعلق ہے؟ عجیب بات ہے کہ جن بزرگوں سے کسی زمانہ میں انسانوں کے کسی گروہ کو اگر یہ تعلق پیدا بھی ہوا تھا تو ان کی تاریخ ہی آج ناپید ہے، اور تاریخ کا جو سرمایہ آج ہمارے پاس ہے اس کے مورخوں کو ان تعلقات کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔

کہاں پچھلوں کی مجلسوں کی گرم بازاری کے لئے مورخین کے بیانات اور کہاں ان سوختہ سامانوں کی تاریخی شہادتیں۔

(۴)

اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی اطاعت و اتباع ہی ان بزرگوں کے لئے ضروری نہ تھی، بلکہ جس قرآن اور جس فرمان نے ان پر یہ فریضہ عائد کیا تھا اسی نے ان کو اس کا بھی ذمہ دار بنایا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہتے ہوئے انہوں نے سنا ہے، اور جو کچھ کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا ہے، وہ دوسروں تک مسلسل پہنچاتے چلے جائیں، ہر حاضر غائب کو، اور ہر پہلا پچھلوں کو ان کی طرف بلاتا جائے۔ قرآنی آیتوں

(۱) كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ — تم ایک بہترین امت ہو انسانوں کی رہبری خواہی کے لئے تم ظاہر کئے گئے ہو، تاکہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دو، اور بری باتوں سے ان کو روکو،

(۲) وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ — چاہئے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیکی اور بھلائی کی

إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

طرف لوگوں کو بلائے اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے۔

ہی کی یہ تفسیر تھی جو مختلف پیرایوں میں صحابہ کرام کو مخاطب کرکے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے۔ منیٰ کا میدان ہے، خیف کی مسجد ہے، ایک لاکھ سے اوپر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کا مجمع ہے، سب کو مخاطب کرکے فرمایا جاتا ہے:۔

(۱) نضر اللہ عبدًا سمع مقالتی فوعاها ثم اداها الی من لم یسمعها۔ (صحاح)

تروتازہ رکھے اللہ اس بندہ کو جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک اسے پہنچا دیا۔

یہی منیٰ کا میدان ہے حجۃ الوداع کے مشہور تاریخی خطبہ میں اعلان فرمایا جاتا ہے:۔

(۲) ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدهما کتاب اللہ وسنتی ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض (صحاح)

میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں جن کے بعد تم پھر گمراہ نہیں ہو سکتے (ایک تو) اللہ کی کتاب (اور دوسری) میری سنت۔ یہ دونوں باہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک کہ حوض (کوثر) پر پھر میرے سامنے آجائیں۔

مجمع سے یہ دریافت فرمانے کے بعد کہ کیا میں نے پہونچا دیا، آسمان کی طرف انگلیاں اٹھا کر اللّٰھم[1] ھل بلغت اللّٰھم ھل بلغت اللّٰھم ھل بلغت کے ارشاد فرمانے کے بعد آخری رخصت کے اس خطبہ کو اس مشہور متواتر فقرہ پر ختم فرمایا جاتا ہے:۔

الا فلیبلغ الشاھد الغائب (صحاح)

چاہیئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو پہونچا تا جائے۔

جس دردناک، اثر انگیز ماحول میں اس خاتمہ کا اعلان ہوا ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن جذبات و ہیجانات سے مخاطب مجمع بھرا ہوا تھا اس پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ اسی اثر کا آپ کو یقین

[1] یعنی اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا کیا میں نے پہنچا دیا کیا میں نے پہنچا دیا تین دفعہ ارشاد فرمایا ۱۲

تھا کہ صحابہ کی جماعت کو خطاب کر کے بطور پیشگوئی آپ فرماتے:۔

تسمعون، ویسمع منکم ویسمع من	تم مجھ سے سن رہے ہو، تم سے بھی سنا جائے گا اور
الذین یسمعون منکم (ابوداؤد، مستدرک)	جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے۔

نہ صرف عام مجامع میں یہ اعلان کیا جاتا تھا بلکہ ملک کے مختلف اطراف سے وقتاً فوقتاً وفود کے جو سلسلے دربار نبوت میں حاضر ہوا کرتے تھے عموماً ان کو ایسی جگہ ٹھیرایا جاتا تھا جہاں سے اُس واقعہ کے معائنہ اور مشاہدہ کا ان کو کافی موقعہ مل سکتا ہو جس کے وہ مورخ بنائے جاتے تھے، پھر جو کچھ سنانا اور دکھانا مقصود ہوتا وہ سنایا اور دکھایا جاتا تھا۔ آخر میں رخصت کرتے ہوئے حکم دیا جاتا، جیسا کہ بخاری میں ہے۔

احفظوھن واخبروھن من وراءکم	ان باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے ہیں
	انہیں ان سے مطلع کرتے رہنا۔

حافظ ابن حجر اس فقرہ کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

یشمل من جاؤا من عندھم وھذا باعتبار	یہ ان لوگوں کو بھی شامل ہے جن کے پاس سے
المکان ویشمل من بعدث لھم	یہ لوگ آئے تھے اور یہ بات مکان کے لحاظ
من الاولاد وغیرھم وھذا باعتبار	سے ہے، اور ان آئندہ نسلوں کو بھی شامل ہے جو بعد کو
الزمان۔ (فتح الباری)	پیدا ہونے والی ہیں، اور یہ بات زمانہ کے حساب سے ہوگی۔

اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام کے دائرہ میں جو قبائل داخل ہوتے جاتے تھے دربار رسالت سے ان کی تعلیم و تلقین کے لئے ذمہ دار اصحاب کو بھیجا جاتا تھا، حکم دیا جاتا تھا کہ جو کچھ تم نے ہم سے سیکھا ہے وہ انہیں بھی جا کر سکھاؤ۔ صرف استحبابی احکام ہی نہیں بلکہ قرآن کی اس آیت:۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ۔

جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جسے ہم نے اتارا ہے، اور جو کھلی کھلی باتوں اور سوجھ بوجھ (ہدایت) کی باتوں پر مشتمل ہے اور اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ انسانوں کے لئے کتاب میں ہم نے اسے بیان کر دیا ہے، یہی لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔

کی بنیاد پر صحابہ کرام جن تاریخ کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کا چھپانا گناہ خیال کرتے تھے خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بھی روایت کرتے تھے:۔

من سُئل عن علم ثم کتمہ الجم یوم القیامۃ بلجام من نار۔ (ابو داؤد و ترمذی)

جس کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائے گی۔

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سکرات میں مبتلا ہیں، لیکن بعض صحابہ سے یہ مروی ہے کہ اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ "علم کے چھپانے" کا الزام ان پر نہ رہ جائے حدیث بیان کرتے جاتے تھے۔ (بخاری و مسلم و عام صحاح)

(۵)

ان تمام امور کے ساتھ اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جس ذات گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے، اسی نے بار بار بکثرت ان کی فطرت میں مشہور حدیث من[۵] کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار کے تہدیدی خوف کو اس طرح راسخ کرنے کی کوشش

---

[۵] جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کرلے۔ ۱۲

کی تھی کہ جتنے صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے، مشکل ہی سے چند حدیثیں اس قدر کثیر تعداد صحابہ سے مروی ہوں گی۔ اور یوں بھی قرآن کی رو سے یہ نہایت بدیہی بات تھی جس قسم کے ایمان و یقین کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے اس فعل کی جرأت کس کو ہو سکتی تھی، جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے یوں بھی ان سے غلط بیانی کی توقع کون کر سکتا ہے، پھر سوا اس کے جب وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی امر کا انتساب دراصل اس چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنا ہے، اور ایک جگہ نہیں بے شمار آیتوں میں قرآن نے مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے، کیا قرآن پر تازہ ایمان رکھنے والوں کے لئے اس کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہو سکتی تھی کہ وہ قصداً العیاذ باللہ اپنے محبوب رسول پر جھوٹ باندھیں؟ یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ تو جس وقت "حدیث" بیان کرنے کے لئے بیٹھتے قبل کچھ بیان کرنے کے من کذب علی متعمداً والی حدیث کو ضرور پڑھ لیتے تھے، تاکہ ان میں اپنی نازک تاریخی ذمہ داری کا احساس بیدار اور تازہ ہو جائے۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں راوی ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دوامی قاعدہ تھا کہ:-

یبتدء حدیثه بان یقول قال رسول الله	اپنی حدیث جس وقت بیان کرنی شروع کرتے تو
الصادق المصدوق ابو القاسم صلی اللہ	کہتے:- فرمایا رسول اللہ صادق و مصدوق ابوالقاسم
علیه وسلم من کذب علی متعمداً فلیتبوء	صلے اللہ علیہ وسلم نے، جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ
مقعده من النار (اصابہ ج ع)	باندھا چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کرلے"۔

اس کے بعد جو کچھ بیان کرنا چاہتے تھے، بیان فرماتے۔

(۶)

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جو کچھ صحابہ کو سناتے

تھے، یاد کرکے دکھاتے تھے، اس کے متعلق صرف یہ حکم دے کر نہ رہ جاتے کہ تم بھی ان کو یاد رکھنا یا کرنا، بلکہ اس کی باضابطہ نگرانی فرماتے تھے کہ اس حکم کی کس حد تک تعمیل کی جاتی ہے۔ مہمات شریعت اور اساسی امور کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نگرانی کا کیا حال تھا اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک معمولی بات یعنی ایک صحابی کو یہ بتاتے ہوئے کہ جب سونے لگو تو یہ دعا پڑھ کر سویا کرو، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بتانے کے بعد فرمایا کہ اچھا میں نے کیا کہا اسے دہراؤ۔ صحابی نے آخری فقرہ "آمنت بکتابك الذی انزلت و نبیك الذی ارسلت" میں "نبیك" کے لفظ کو "رسولك" کے لفظ سے بدل دیا، جو تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں، یعنی بجائے نبی کے رسول کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے چونکہ "نبیك" کا لفظ ادا فرمایا تھا، حکم ہوا کہ میں نے یہ نہیں کہا، وہی کہو جو میں نے بتایا۔ ظاہر ہے کہ قانونی طور پر سونے کی دعا کی حیثیت اُن شرعی حقائق کی نہیں ہے جنہیں فرض و واجب کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ایک ایک لفظ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سخت نگرانی تھی۔ بخاری میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو کے متعلق یہ دوامی عادت بیان کی جاتی ہے کہ انہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلثاً۔ غالباً اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا۔ فعل کے متعلق مشہور حدیث ہے کہ ایک صاحب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے، نماز کے تمام ارکان یعنی قیام رکوع و سجود میں کوئی کمی نہیں کی تھی، صرف ذرا عجلت اور جلد بازی سے کام لے رہے تھے، مگر نماز سے جب وہ فارغ ہوئے تو وہ یہ سن رہے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صل فانك لم تصل (پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی) ارشاد فرما رہے ہیں۔ انہوں نے

۱؎ ایمان لایا میں اس کتاب پر جو تو نے اتاری اور اس نبی پر جسے تو نے بھیجا ۱۲ ۲؎ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کوئی بات کرتے تو اس کو تین دفعہ دہراتے ۱۲

پھر نماز دہرائی، لیکن اب بھی اس میں وہ وقار اور طمانیت نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے صَلُّوا کما رایتمونی اُصَلّی (ٹھیک اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) کے حکم کی تعمیل ہوتی۔ الغرض تیسری بار سمجھانے کے بعد انہوں نے اپنی نماز جیسی کہ چاہئے ادا کی۔ نماز میں سکینت و اطمینان کی حیثیت اکثر فقہاء امصار کے نزدیک فرض و واجب کی نہیں ہے، لیکن جن لوگوں کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنی پوری زندگی، اس کے ہر پہلو، ظاہر و باطن، اندر اور باہر کا مورخ بنانا چاہتے تھے، ان پر آپ ان معاملات کے متعلق بھی پوری نگرانی رکھتے تھے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی تاریخ بھی موجود ہے جس نے اپنے مورخین کی اور راویوں کے بیان و ادا کی خود نگرانی کی ہو، اور ایسی سخت کڑی نگرانی؟

تدوین حدیث کے قدرتی عوامل | تدوین حدیث کے سلسلہ میں جن امور کی تعبیر میں نے غیر معمولی خاص قدرتی عوامل سے کی ہے، اور عام تاریخی سرمایہ سے تاریخ کے اس حصہ کے لیے جن بنیادوں پر میں امتیاز کا مدعی ہوں، اس کے ٹھوس اور خصوصی اسباب تو یہ تھے۔ لیکن خصوصیتوں کا یہ قصہ ان ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جن بزرگوں کے ہاتھوں علم کے اس حیرت انگیز ایوان کی تعمیر ہوئی، ابھی ان کی اور بھی چند باتیں قابل لحاظ ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا ذکر آپ سن چکے، قرآن اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ دعوت جو شاعرانہ زبان میں نہیں بلکہ فی الحقیقت مولینا حالی مرحوم کی اس بلیغ تعبیر کی صحیح تصویر تھی:-

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی — عرب کی زمین جس نے ساری ہلا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی — نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی

اس نے صحابہ کرام کی ذہنی قوتوں، اور عملی توانائیوں میں نئی زندگی کی روح بھر کر ان میں ایسی ہلچل پیدا کر دی تھی کہ بقول گاڈفرے ہگنس "عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔"

اور میں تو کہتا ہوں کہ عیسائی ہی نہیں بلکہ دنیا کو چاہیئے کہ یہ یاد رکھے کہ اس نشہ کی نظیر نہ اس کے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد دیکھی جا سکتی ہے۔ عروہ بن مسعود ثقفی نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو صحابہ کرام کے اس نشہ کی خبر کتنے صحیح الفاظ میں دی تھی :-

ای قوم واللہ لقد وفدت علی الملوک ووفدت علی قیصر وکسریٰ والنجاشی واللہ ان رأیت ملکا قط یعظمہ اصحابہ ما یعظم اصحاب محمد محمدًا واللہ ان تنخم نخامۃ إلا وقعت فی کف رجل منھم فدلک بھا وجھہ وجلدہ وإذا امرھم ابتدروا امرہ واذا توضاء کادوا یقتتلون علی وضوءہ واذا تکلم خفضوا اصواتھم عندہ وما یحدون الیہ النظر تعظیما لہ (بخاری[1])

لوگو! خدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں بھی باریابی کا موقعہ ملا ہے قیصر (روم) کسریٰ (ایران) نجاشی (ابی سینیا) کے سامنے حاضر ہوا ہوں قسم خدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کی لوگ اتنی عظمت کرتے ہوں جتنی محمد کے ساتھی محمد کی کرتے ہیں۔ قسم خدا کی جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو نہیں گرتا ہے وہ لیکن ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ میں، پھر وہ اپنے چہرہ اور اپنے بدن پر اسے مل لیتا ہے۔ (محمد) جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں اس کی تعمیل کی طرف وہ جھپٹ پڑتے ہیں، جب محمد وضو کرتے ہیں تو اس وقت ان کے وضو کے پانی پر آپس میں الجھ پڑتے ہیں، جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

[1] اس حدیث کے مختلف فقرے صحاح کی کتابوں اور سیرت کی کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

بات کرتے ہیں تو ان کی آوازیں پست ہو جاتی
ہیں، محمد کو نگاہ بھر کر ان کی عظمت کی وجہ سے
وہ نہیں دیکھ سکتے۔

یہ دوست کی نہیں، بلکہ ایک دانا دشمن کی شہادت ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس جماعت کے نشہ کا یہ حال ہو، جو احکام و اوامر تو بڑی چیزیں ہیں تھوک اور وضو کے عنسالہ تک کو اپنے اندر پیوست کرتے تھے، اور ایک دوسرے پر سبقت کرنے میں گویا باہم الجھ پڑتے تھے، ایک ایک موئے مبارک کے متعلق یہ حال تھا کہ بخاری میں ہے کہ حضرت عبیدہ تابعی جنہیں حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ خادم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موئے مبارک ہاتھ آگیا تھا، فرماتے

لأن تكون عندی شعرة منها احب الی من الدنیا و ما فیها۔ — میرے پاس کسی بال کا ہونا، اس سے زیادہ محبوب ہے کہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب کچھ میرے یہاں ہو۔

جن لوگوں کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ کی "زندگی" جس کے خدا کی طرف سے بھی وہ محافظ اور مبلّغ قرار دیئے گئے تھے، سوچنا چاہیئے کہ ان ہی لوگوں نے اس "زندگی" کی نگہداشت میں کس اہتمام کس انہماک اور توجہ سے کام لیا ہوگا۔ ایک ایک موئے مبارک بھی جن کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھا، ان ہی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی غور کرنا چاہیئے کہ کیا قیمت تھی۔

اب ایک طرف حضرات صحابہ کرام کے ان جذباتی طوفانوں کو اپنے سامنے رکھئے، اور اسی کے ساتھ اس پر بھی غور کیجیئے کہ جس عہد میں اس "تاریخ" کی حفاظت و اشاعت کی ذمہ داری قدرت

کی جانب سے انہیں سپرد ہوئی تھی، اس زمانہ میں ان کے پاس کسی قسم کا کوئی دماغی مشغلہ قرآن مجید کے سوا موجود نہ تھا۔ عرب جاہلیت کی تاریخ ہم سب کے سامنے ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس حیرت انگیز بیدار دماغی بیداری کے زمانہ سے پہلے وہ اور ان کا ملک تقریباً ان عام علمی اور ذہنی مشغلوں سے مفلس تھا جن کا چرچا عموماً حضارت و تمدن کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگرچہ میں اس کا تو قائل نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عرب کے ایام جاہلیت کا یہ مطلب ہے کہ ان کی حالت ہندوستانی بھیلوں اور گونڈوں کی تھی۔ نہ صرف قریش بلکہ اور بھی دوسرے قبائل کے صحیح حالات سے جو واقف ہیں وہ ایک سکنڈ کے لیے یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ بلکہ جیسا کہ عنقریب آپ کے سامنے اس کی تفصیل آئے گی، "جاہلیت" کا یہ ترجمہ کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے عربی زبان اور قرآن مجید کے عام محاوروں کے خلاف ہے۔ عربوں کی جہالت کا جو یہ مطلب سمجھتا ہے، وہ دراصل واقعات سے جاہل ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کے سلسلہ میں عرب کا بھی اس زمانہ میں تقریباً وہی حال تھا جو عموماً اس زمانہ میں اگر کامل متمدن ممالک نہیں تو نیم متمدن ممالک کا تھا۔ یعنی جس طرح قدیم زمانہ میں تقریباً ہر ملک اور قوم میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص پیشہ ور طبقہ ہوتا تھا اور عام پبلک کو اس سے چنداں تعلق نہیں تھا، نہ اس کی اتنی اہمیت تھی، کسی ملک میں پادریوں، کسی میں موبدوں، کسی میں برہمنوں، الغرض اسی قسم کے لوگوں کے ساتھ یہ کام مخصوص تھا، اگر بالکلیہ نہیں تو قریب قریب عرب کا بھی یہی حال تھا۔ آئندہ یہ بتایا جائے گا کہ عرب میں بھی ایک خاصی تعداد خواندوں اور نویسندوں کی تھی۔ نہ صرف مرد بلکہ ایام جاہلیت میں بھی بعض لکھی پڑھی عورتیں پائی جاتی تھیں۔ شرفا ہی نہیں بلکہ غلاموں میں بھی ایسے افراد موجود تھے۔ میں اپنے اسی دعوے کی تھوڑی بہت تفصیل آگے بھی کروں گا۔ لیکن بایں ہمہ یہ بھی صحیح ہے کہ معمولی نوشت وخواند جو چند گنے چنے لوگوں تک محدود تھی، اس سے آگے عربوں کی ذہنی اور دماغی قوتوں کے لئے

اس زمانہ میں کوئی خاص اہم خوراک موجود نہ تھی۔ اور تھوڑی بہت اگر کچھ تھی بھی تو وہ بہت ادنیٰ درجہ کی تھی۔ ان کا سب سے بڑا دماغی مشغلہ شعر و شاعری کا تھا، یا باہم ایک دوسرے پر تفاخر کے لئے یا توہین کے لئے۔ وہ انساب کے علم سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور بھی ابتدائی نوعیت کی کچھ فنی چیزیں معدودے چند افراد کے پاس تھیں۔ لیکن اسلام نے شریفانہ کردار کا جو معیار مقرر کیا تھا اس میں گانے بجانے، رقص و سرود، مے نوشی، مفاخرت یا مشاجرت وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ ان کی خمری و فخری فحش و مبالغہ والی شاعری کی بھی اس نے کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ ایک طرف عربوں کی ذہنی اور علمی بھوک کی وہ شدت، اور دوسری طرف یوں ہی ان کے ملک کا دماغی مشغلوں سے خالی ہونا، چند بچی کھچی ادنیٰ درجہ کی کچھ عنایتیں جو ان کے پاس موجود تھیں ان کا بھی ان کے سامنے سے ہٹ جانا، اور سب کو ہٹا کر اس شدید دماغی تشنگی کے وقت میں ان کے سامنے صرف قرآن اور مبلغ قرآن صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا علم اور فن کے رنگ میں پیش ہونا اور اسی کی کمی بیشی پر سوسائٹی میں افراد کے مدارج کا قدرتاً مقرر ہو جانا، غور کرنے کی بات ہے کہ ایسے ماحول میں ہر چیز سے ٹوٹ کر ہمہ تن ان ہی دو چیزوں میں اگر وہ ڈوب گئے تھے تو آپ ہی اندازہ کیجئے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں یقیناً یہی ہو سکتا تھا اور یہی ہو کر رہا۔

بلکہ اسی کے ساتھ ہم جب اس واقعہ کو بھی ملا لیتے ہیں کہ فاقہ کش غریب اور مفلس عرب جو اپنے ملک کے خاص حالات کے لحاظ سے ایام جاہلیت میں معاشی حیثیت سے انتہائی سخت کوشیوں کا شکار بنا ہوا تھا، تعیش و رفاہیت کی زندگی کا تو کیا ذکر ہے، ضروری معاشی رسد کی تکمیل میں بھی ان کو آسمان و زمین کے قلابے ملانے پڑتے تھے، ساری عمر عرب کے چٹیل ریگستانی اور سنگستانی صحراؤں میں بیچارے صرف اس لئے دوڑتے پھرتے تھے کہ دو وقت کی خشک روٹی خواہ کسی شکل میں ہو مل جائے اور وہ بھی بہ مشکل میسر آتی تھی، لیکن اسلام نے ایک طرف ان کے باطنی قویٰ

اور ذہنی طلب میں یہ طوفان برپا کیا، دوسری طرف پندرہ بیس سال کی مدت میں جسمانی اور معاشی مطالبوں کے لیے رسد کا ایک ایسا بے تھاہ سمندر ان کے اس غیر آباد، قلیل التعداد ملک میں ٹھاٹھیں مارنے لگا کہ سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر بھی عرب کے آسمانوں نے نہ اس سے پہلے دیکھی تھی، اور نہ آج تک پھر وہ تماشا دیکھنا اسے نصیب ہوا۔ اُن خزائن اور دفائن، غنائم اور نفل کے سوا جو قرنہا قرن سے کسریٰ ایران کے خزانے میں جمع ہو رہے تھے، یا وہ دولت جو زمین فرعون (مصر) سے یا ارض شام سے آئی تھی، ستون فی سین (یعنی ساٹھ گز لمبا ساٹھ گز چوڑا) والا جواہر نگار بہار نامی ایرانی غالیچہ جس کے تمام نقش و نگار جن کا تعلق مختلف مناظر اور موسموں سے تھا انمول جواہرات کے ذریعہ سے کاڑھے گئے تھے، کسریٰ کا وہ مرصع تاج جو اپنے قیمتی اور وزنی پتھروں کی وجہ سے بجائے سر پر رکھنے کے سونے کی زنجیر سے لٹکا دیا جاتا تھا اور کج کلاہ ایران اسی میں اپنا سر داخل کر دیتا تھا، کھجوروں کے تنہ پر مدینہ میں جو مسجد کھڑی تھی اس میں یکے بعد دیگرے یہ سب کچھ ہر طرف سے چلا آ رہا تھا۔ خوراکی رسد کا یہ حال تھا کہ عام رمادہ کے قحط میں حضرت عمر نے مصر کے والی عمرو بن عاص کو غلہ کے لیے جب لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اونٹوں کی ایسی قطار غلہ سے لاد کر پایہ تخت خلافت میں بھیجتا ہوں جس کا پہلا اونٹ مدینہ میں ہوگا اور آخری اونٹ کی دم میرے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ سب تو وقتی دولت تھی، اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ دس پندرہ سال کے عرصہ میں حجاز، یمن، یمامہ، بحرین، عراق، شام، مصر کے لاکھوں مربع میل کے جو علاقے فتح ہوئے، جن میں بجز حجاز کے تقریباً اکثر حصہ صرف ثروت و دولت کا بے پناہ سرچشمہ تھا، مصر سے پہلا خط عمرو بن العاص کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام آیا تھا کہ ایک ایسی زمین پر خدا نے قبضہ دلایا ہے جو اچانک موتی کی طرح سفید اور پھر عنبر کی مانند سیاہ اور اسی کے بعد ہیرے کے مانند سرسبز ہو جاتی ہے، ان سارے علاقوں کا ایک بڑا حصہ اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جاگیروں پر تقسیم

کر دیا گیا تھا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اموال غنیمت کے حصوں کے ساتھ ساتھ ہر صحابی کے گھر میں سالانہ کتنی دولت ان جاگیروں سے آتی تھی۔ تاریخوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ عہد فاروقی تک پہونچتے پہونچتے مدینہ کے بازار کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ عہد نبوت میں جس گدھے کی قیمت پندرہ درہم تھی، اب وہ پندرہ سو میں ملتا تھا۔ بخاری کی مشہور روایت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غابہ کی زمین جو مدینہ کے پاس ہے کل ایک لاکھ ستر ہزار درہم میں مول لی تھی، لیکن ان کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے جب فروخت فرمایا تو اس کی قیمت سولہ لاکھ ملی تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اپنی داد و دہش کی وجہ سے مرتے کے وقت ایک پیسہ نہ چھوڑ سکے، لیکن مکانات اور زمین کی شکل میں جو ان کی جائداد تھی اس کی قیمت جیسا کہ بخاری میں ہے پچاس کروڑ دو لاکھ لگائی گئی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے انتقال کے وقت جو ترکہ چھوڑا اس کا حساب تو بہت طویل ہے، لیکن فراخی و فراغبالی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے ثلث مال سے انہوں نے وصیت کی تھی کہ ہر بدری صحابی کو (جن کی تعداد اس وقت تقریباً ایک سو کے قریب رہ گئی تھی) چار چار سو دینار دیئے جائیں۔ صحابہ اور صحابہ کی اولاد جو وہی عرب تھے جن کے پاس ہزار کے اوپر عدد کے لئے کوئی لفظ ہی نہ تھا، لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ایک ایک وقت میں صرف خیرات کرتی تھی، یا اپنے ملنے جلنے والے احباب و اعزہ کو دے ڈالتی تھی۔ عام تاریخی کتابوں میں بہ کثرت ان کی داد و دہش کے واقعات کا ذکر ہے۔ بخوف طوالت ان کی تفصیل ترک کی جاتی ہے

بہرحال مجھے حدیث کے ابتدائی رواۃ یا اس تاریخ کے ابتدائی مورخین کی دولت اور آمدنی کی تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ گزشتہ بالا حالات کے ساتھ جب ان کی معاشی فراغبالی کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور پھر سوچا جائے کہ علم کی پیاس کی جو آگ ان

کے دل میں لگائی گئی تھی اس کی تسکین کے لئے ان کے پاس کتنے وسیع مواقع قدرت نے مہیا کر دیئے تھے۔ ہو سکتا تھا اور تھوڑے دنوں بعد ہو بھی گیا کہ مال و دولت کی اس فراوانی نے ان ہی صحابیوں کی دوسری اور تیسری پشت میں ان امیرانہ مشاغل کو پیدا کر دیا جو اس کے لازمی نتائج ہیں۔ لیکن ہم جن لوگوں سے بحث کر رہے ہیں ان میں ایک ایسا روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ کردار کے اس بلند اسلامی معیار کو نہیں چھوڑ سکتے تھے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے ان میں پیدا کر دیا تھا۔ اور اس کی شہادت ان کی زندگی سے ملتی ہے۔ بجائے رنگ رلیوں کے ان کے مصارف وہی تھے جو اسلام نے ان کے لئے مقرر کئے تھے۔ ہر ایک نیکی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا۔ وہی عبدالرحمٰن بن عوف جن کا ذکر ابھی گزرا، مشہور بات ہے کہ اپنے ذاتی روپے سے خرید خرید کر انہوں نے تقریباً تیس ہزار غلاموں کو آزاد کیا تھا۔ اور ازیں قبیل سب ہی کا یہی حال تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان میں اکثر خصوصاً جن کا زیادہ میلان تعلیم قرآن اور تدوین حدیث کی طرف تھا ان کی تمام جائدادوں اور مالی ذرائع کی نگرانی بھی فرمانوں اور قیمتوں کے سپرد تھی، وہی وصول کرتے تھے اور وہی اس کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ ان بزرگوں کو اپنے کام کے سوا اور کسی بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ حضرت ابن عباس جو ترجمان القرآن حبر الامۃ وغیرہ عالمانہ القاب سے ملقب ہیں اور تدوین حدیث میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے، ان کے ایک بھائی عبیداللہ کی طبیعت کا میلان تو جود و سخا کی طرف تھا۔ کہا جاتا ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر ہزاروں روپے لوگوں کو دے دیتے تھے ایک شخص نے ان سے

لہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں روایت درج کی ہے کہ فارس کے غنائم، جن میں الجواہر و اللولو والذہب والفضۃ کی کثیر مقدار تھی، حضرت عمر کے سامنے جب ان کا ڈھیر لگایا گیا تو رونے لگے اور فرمایا کہ جس قوم کو یہ چیزیں ملیں بالآخر ان میں بغض و عداوت کا پیدا ہونا ضرور ہے ۱۲

اگر کہا کہ تم پر میرا حق ہے، بولے کیا؟ اس نے کہا کہ تم چاہ زمزم پر پانی پی رہے تھے، چہرہ پر دھوپ پڑ رہی تھی، میں نے اپنی چادر سے سایہ کر دیا تھا بولے ہاں تیرا احسان یاد ہے، قیم (داروغہ) کو آواز دی، پوچھا تیری تحویل میں اس وقت کتنی رقم ہے؟ دس ہزار درہم نقرئی اور دو سو طلائی دینار ہیں، اس نے جواب دیا۔ حضرت عبید اللہ نے حکم دیا سب اس شخص کو دے دو۔ اور یہ ان کا عام حال تھا لیکن وہی دولت جسے عبید اللہ اس طریقہ سے خرچ کرتے تھے، ان کے بڑے بھائی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ علم کی نشر و اشاعت پر صرف فرماتے تھے۔ بخاری میں ان کے مشہور شاگرد ابو جمرہ سے مروی ہے کہ صرف اس لئے تاکہ ابن عباس کی آواز[1] دوسروں تک وہ پہونچا یا کریں حضرت نے اپنی آمدنی کا ایک حصہ ابو جمرہ کے لئے مخصوص فرما دیا تھا۔ اور یہ حال تو اس وقت کا ہے جب مسند درس پر جلوہ فرما ہو چکے تھے، لیکن یہی ابن عباس باوجود اس ثروت و دولت کے اپنے طلب حدیث کے دنوں کو یاد کر کے فرماتے:۔

كنت لآتي الرجل في الحديث يبلغني	حدیث کی طلب میں میں کسی ایسے آدمی کے پاس جاتا جن
انه سمعه من رسول الله	کے متعلق مجھے خبر ملتی کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ
صلى الله عليه وسلم فاجده	علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے، اور پاتا کہ وہ دوپہر میں
قائلا فاتوسد ردائي على بابه	آرام کر رہے ہیں، تو اپنی چادر کو تکیہ بنا کر ان کے
تسفي الريح التراب على وجهي	دروازے پر پڑ جاتا، ہوائیں دھول اڑا اڑا کر
حتى يخرج فاذا خرج قال يا	میرے چہرے پر ڈالتیں، اور میں اسی حال میں
ابن رسول الله صلى الله عليه	پڑا رہتا، تا ایں کہ خود وہ صاحب باہر نکل آتے،

[1] بعضوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ابو جمرہ چونکہ فارسی جانتے تھے اس لئے حضرت ابن عباس کی باتوں کا ترجمہ عربی نہ جاننے والوں کو سنا دیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ دونوں کام کرتے ہوں۔

وسلم مالك فاقول بلغني حديث عنك انك تحدثه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فاحببت ان اسمعه منك فيقول هل بعثت الي حتى اتيك فاقول انا احق اليك۔

(دارمی)

باہر نکل کر (جب مجھے دیکھتے) تو کہتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے آپ کہاں تشریف لائے ہیں، میں کہتا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے تم کوئی حدیث روایت کرتے ہو، میں نے چاہا کہ اس حدیث کو تم سے سنوں، جواب میں وہ صاحب کہتے، آپ کسی کو بھیج دیئے ہوتے، میں خود حاضر ہو جاتا، میں کہتا کہ تمہارے پاس حاضر ہونے کا مستحق میں ہوں۔

صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ، تابعین، تبع تابعین، نیز دوسرے ائمہ اور بزرگوں نے اس فن کی تدوین میں کیا کیا مشقتیں برداشت کی ہیں، ان کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے۔ اس مثال کے پیش کرنے کی غرض اس وقت صرف یہ تھی کہ دولت و امارت نے ان کو امیرانہ چونچلوں میں الجھا نہیں دیا تھا بلکہ ان میں کتنے ایسے تھے جن کی آمدنی کا اکثر حصہ اسی علم کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔ مردوں ہی میں نہیں بلکہ عورتوں میں بھی اس علمی ولولہ کی یہ کیفیت تھی کہ معمولی معمولی عورتیں محض اس لئے کہ ان کا بچہ فن حدیث کا عالم ہو جائے، ہزار ہا روپے خرچ کر ڈالتی تھیں۔ اس موقع پر عہد صحابہ کا قصہ یاد آیا کہ فروخ نامی ایک معمولی آدمی تھے، آزاد شدہ غلاموں کے طبقہ سے ان کا تعلق تھا، غالباً فوج میں ملازم تھے لیکن اس وقت مدینہ کی دولت کا یہ حال تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ غلام سپاہی بھی تیس تیس چالیس ہزار دینار طلائی سکہ پس انداز کر سکتا تھا۔ تقریباً سیر کی اکثر کتابوں میں یہ واقعہ درج ہے کہ اپنا سارا اندوختہ بیوی کو سپرد کر کے وہ کسی نوکری پر طویل مدت

کے لئے باہر چلے گئے، پندرہ بیس سال کے بعد واپسی ہوئی، جس وقت جا رہے تھے ان کی بیوی حاملہ تھیں پیچھے لڑکا پیدا ہوا، نام ربیعہ رکھا گیا، اس نیک دل خاتون کے علمی ذوق کا حال سنئے کہ انہوں نے شوہر کے سارے اندوختہ کو بچے کی تعلیم و تربیت پر ختم کر دیا، اور اس زمانہ کی تعلیم کیا تھی؟ یہی قرآن و حدیث کی خدمت۔ فروخ جب گھر واپس ہوئے تو لڑکا جوان ہو کر نہ صرف عالم بلکہ مسجد نبوی کے حلقہائے درس کے ایک ممتاز ترین معلم کی حیثیت حاصل کر چکا تھا، امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری جیسے لوگ جنہیں بعد کو امت میں امامت کا منصب عطا ہوا، وہ ان کے شاگردوں میں شریک تھے، فروخ باہر سے بھی چار پانچ ہزار روپیہ کما کر لائے تھے، دو تین دن کے بعد بیوی سے اپنے گذشتہ پس انداز کا حساب دریافت کیا، بولیں کہ سب کو میں نے گاڑ رکھا ہے، کچھ دم لے لو تو انہیں نکالوں، لیکن ذرا کل تم صبح کی نماز کے بعد مسجد نبوی کے حلقہائے درس میں گشت تو لگانا، دوسرے دن انہوں نے یہی کیا، ایک حلقہ میں پہنچے تو ہذا کی قدرت نظر آئی کہ ان کے لڑکے کو چاروں طرف سے شاگردوں کا حلقہ گھیرے ہوئے ہے، خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے، گھر پہنچے اور بیوی سے حال بیان کیا، بیوی نے کہا کہو روپیہ لینا چاہتے ہو یا ایسا عالم لڑکا، میں نے تمہارے روپے اسی کی تعلیم پر خرچ کر دیئے، فروخ نے اپنی بیوی کے فعل کی تحسین کی۔

علم حدیث کی تفصیل و تدوین اشاعت و نشر میں عہد صحابہ اور اس کے بعد لوگوں نے کتنی حیرت انگیز مالی قربانیاں کی ہیں اس کے لئے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت صرف دماغوں کا دھر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ منجملہ دیگر اسباب کے عہد صحابہ کی معاشی فراغبالی کو بھی دنیا کی تاریخ کے اس عجیب حصہ کی حفاظت میں غیر معمولی دخل ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ جو کام ؎

دو یار زیرک و از بادہ کہن دو منے فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے

کے ماحول میں انجام پا سکتا ہے، چہ خورد بامداد فرزندم کے سوال کے ہتھوڑوں سے چور دلوں

میں بجز خاص استثنائی صورتوں کے عموماً ایسے پراگندہ روزوں سے پراگندہ دماغی ہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

خصوصاً جو واقعہ خاص اس علم کے ساتھ پیش آیا ہے، اس کے لئے تو یہ ہونا زیادہ ضروری تھا۔ کیونکہ چند گنے گنائے آدمیوں سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو استثنائی قانون کا ممکن تھا کہ ظہور ہوتا۔ لیکن آپ کو آئندہ معلوم ہوگا کہ تاریخ کے اس بسیط اور مختصر حصہ کے بیان کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اب تک حدیث کے ابتدائی راویوں، یعنی صحابہ کرام کے کیفی حالات وخصوصیات سے میں بحث کر رہا تھا، لیکن اس تاریخ کے مورخوں کا جو مقداری امتیاز ہے، میرے خیال میں تدوین کے "قدرتی عوامل" میں غور وفکر کے لئے ان کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں ہے، بلکہ ایک لحاظ سے تو یہ اس فن کی ایک ایسی امتیازی شان ہے جس کی نظیر فن تاریخ ہی میں نہیں دوسرے علوم میں بھی بہ مشکل مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا یہ مشہور فقرہ کہ "کوئی قوم دنیا میں نہ ایسی گذری نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"

اسماء الرجال اور اس کی ضرورت کی تفصیل تو آگے آئے گی، میں اس وقت آپ کی توجہ اس "تاریخ" کے اساسی مورخوں کی تعداد اور ان کی مختلف نوعیتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

حدیث کے ابتدائی راویوں کی تعداد غور کیجئے! انصاف سے کہنا چاہئے کہ علمی دنیا کے ہاتھ میں آج تاریخ کا جتنا کچھ بھی سرمایہ ہے، وہی جس کی تعلیم وتعلم پر جامعات اور یونیورسٹیاں ہیں، اور نشر واشاعت وتدوین وترتیب پر تصنیف گاہوں اور مطابع واشاعتی اداروں میں، حکومتوں اور عام پبلک کی جانب سے بلا مبالغہ ہر سال کروڑہا کروڑ روپے صرف ہو رہے ہیں، اور ان تمام مصارف کا شمار بہترین علمی خدمتوں میں ہے اور بلاشبہہ یہ بہت بڑی علمی خدمت ہے،

لیکن تھوڑی دیر کے لئے اپنے اس علمی وفنی سرمایہ کا جائزہ لیجئے قدیم ہو یا جدید، تاریخ کے کسی حصہ پر اس حیثیت سے نظر ڈالئے کہ ابتدا میں ان واقعات کے بیان کرنے والوں، یا ان کو ریکارڈ کرنے والوں کی تعداد کیا تھی؟ قطع نظر اس سے جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ واقعات کے عینی شاہدوں کا ان تاریخوں میں بجائے خود ایک پیچیدہ ترین سوال ہے، بالفرض اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا کوئی حصہ ایسا مل بھی جائے جسے ہم خود چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکتے ہوں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ ہمیں ان کی دماغی اور اخلاقی منزلت کا بھی کسی نہ کسی ذریعہ سے علم حاصل ہو گیا ہو، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے، تاہم مان لیجئے کہ اس میں کامیابی ہو بھی جائے، پھر بھی جہاں تک میرے معلومات ہیں اور میرا اندازہ ہے ان تاریخوں کے ابتدائی راویوں کی تعداد بہ مشکل ایک دو سے آگے متجاوز ہو سکتی ہے۔ آخر ہماری تاریخوں کی آج جو کچھ بھی بنیاد ہے وہ کوئی پرانے زمانے کی کسی پرانے مصنف کی کوئی یادگار، پرانی قبروں کا کوئی کتابہ، پرانے سکوں کے ٹھپے، پرانے کھنڈروں کی کوئی سنگی یا برنجی تختی، یا ازیں قبیل کوئی اور چیز ہے۔ یقینی سے یقینی تر چیز کسی شخص کی ذاتی خود نوشت سوانح عمری ہو سکتی ہے۔ اس احتمال کے سوا کہ اس قسم کی بیوگرافیاں کیا موجودہ زمانہ کے مینوفسٹی بیانات نہیں ہو سکتیں، اور مان لیا جائے کہ ان میں گفتنی کے ساتھ تمام ناگفتنیوں کے اندراج کا بھی التزام کیا گیا ہو یا یوں کہئے کہ صاحب شعر و دیوان ہونے کی حیثیت کے ساتھ محلہ والوں[1] کے معلومات بھی اس میں بیان کئے گئے ہوں، لیکن ان سب سے بھی اگر قطع نظر کر لیا جائے تو جب بھی اس یقینی ترین تاریخی سرمایہ و خود نوشت سوانح عمری کی حیثیت ایک شخصی بیان ہی کی ہو سکتی ہے۔ اخلاقی اطمینان کے باوجود ایک شخصی دماغ

---

[1] یہ اکبر مرحوم کے مشہور شعر ؎ اکبر کی حقیقت کو تم کچھ پوچھو محلے والوں سے :: ہاں شعر تو اچھا کہتے ہیں دیوان تو اتنا دیکھا ہے کی طرف تلمیح ہے ۱۲

پر نسیان و ذہول، بھول چوک کی راہیں جتنی کھلی ہوئی ہیں، ظاہر ہے۔

لیکن اب آیئے، تاریخ کے ایک اس نادرۂ روزگار حصہ پر نظر ڈالیے جس کا نام "حدیث" ہے۔ جن چشم دید گواہوں اور عینی شاہدوں کے بیانات سے یہ "واقعات" حاصل کئے گئے ہیں، ان کی تعداد کیا تھی؟ ابھی سلسلہ روایت کے بعد کی کڑیوں سے بحث نہیں، بلکہ آپ کے سامنے اس کا صرف پہلا حلقہ یعنی ان لوگوں کا سوال ہے جو خود اس واقعہ میں شریک تھے۔ انہوں نے اس کو دیکھا اور اس نظر سے دیکھا جس سے ہر معمولی واقعہ نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ایک امتی جس نظر سے اپنے پیغمبر کو، یا ایک مرید اپنے پیر کو، یا صاف لفظوں میں کہئے، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عجیب و غریب صحابیوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ دیکھنے کے بھی وہ ذمہ دار تھے اور بیان کرنے کے بھی ذمہ دار تھے، جانتے ہیں کہ ان کی تعداد کیا تھی؟ علی بن ابی زرعہ جو فن رجال کے بڑے مشہور ائمہ میں ہیں ان سے یہی سوال پوچھا گیا، جواب میں انہوں نے فرمایا:۔

توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومن رآہ وسمع منہ زیادۃ علی مائۃ الف انسان من رجل وامرأۃ کلھم قد روی عنہ سماعا وروایۃ۔ (اصابہ ص ۳ ج ۱)	آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اس وقت ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے حضور کو دیکھا اور آپ سے سنا تھا ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، سب حضور سے سن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ابن ابی زرعہ نے یہ صحابیوں کی تعداد نہیں بتائی ہے، بلکہ ان خاص اصحاب کی تعداد ہے جنہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور دیکھنے کے بعد آپ کے متعلق کوئی نہ کوئی بات روایت کی ہے۔ "حدیث" تاریخ کے جس حصہ کی تعبیر ہے، اس کے ابتدائی رواۃ کی یہ تعداد کیا کوئی معمولی بات ہے؟ عموماً اس کو سن لیا جاتا ہے اور لوگ گذر جاتے ہیں۔ لیکن مقابلہ

سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ ایک طرف آپ کے سامنے تاریخ کا وہ ذخیرہ ہے جس کے ابتدائی راویوں کا حال اگر معلوم بھی ہو سکتا ہے تو ان کی تعداد دو تین سے آگے بہ مشکل متجاوز ہو سکتی ہے۔ اور بیچاری ایک تاریخ کیا بڑے بڑے مذہبی مستندات جن کے بھروسہ پر آج کروڑہا کروڑ انسان ایمانی زندگی بسر کر رہے ہیں، زیادہ تر ان کا بھی یہی حال ہے۔ خیال تو کیجئے کہ کہاں ایک لوقا[1]، ایک مرقس یا ایک سنجے گاڑی بان کا بیان، اور کہاں یہ ایک لاکھ سے اوپر چشم دید گواہوں کی شہادتیں۔ پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ عام تاریخی واقعات جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں پراگندہ اور منتشر کثرتوں کا مجموعہ ہے اور ان بکھری ہوئی کثرتوں کے سمیٹنے والے صرف ایک دو ہیں۔ ادھر ایک شخصی ذات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہے اور اُن کی سچی اور ہو بہو جیسے کہ وہ تھے، تصویر اتارنے کے لئے اردگرد لاکھوں زندہ آنکھوں کے کیمرے قدرت کی جانب سے کھڑے کئے گئے ہیں۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

راویوں کی تعدادی مقدار کے روایت پر کیا کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں؟ بادنیٰ تامل ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔

کثرت تعداد کا روایتوں کی وثاقت پر اثر سب سے پہلی بات تو یہی ہے، ایک یا دو آدمی سے ظاہر ہے کہ اتنے واقعات کا احاطہ یقیناً ناممکن ہے جو مشاہدہ کرنے والوں کی کثرت کی صورت میں ممکن ہے۔ پھر اسی کے ساتھ جب ہم اس کو بھی ملا لیتے ہیں کہ ان راویوں میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں کی بھی ایک بڑی جماعت شریک ہے تو احاطہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مورخین صرف مرد ہوتے، تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ ہم تک حضور صلے اللہ علیہ وسلم

[1] مختلف انجیلوں کے مختلف ابتدائی راویوں کے نام ہیں اور سنجے اس گاڑی بان کا نام ہے، جو ہندوؤں کی مشہور کتاب "گیتا" کا سری کرشن سے تھا رادی ہے۔ محض اسی کی روایت کی بنیاد پر ہندو گیتا کو گویا ایک قسم کی آسمانی کتاب سمجھتے ہیں ۱۲

کی سیرت طیبہ کے محض وہی واقعات پہنچے ہیں جن کا تعلق گھر کے باہر کی زندگی سے ہے۔ لیکن بجائے جلوت کے خلوت یا گھریلو زندگی کے حالات پر یقیناً پردہ پڑا رہتا، اور ایسے بہت سے مسائل جن کا خصوصی تعلق صرف عورتوں سے ہے ان کے متعلق کوئی واضح ہدایت نامہ ہمارے پاس نہ ہوتا۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو، جلوت کا ہو یا خلوت کا، کسی کو راز میں نہیں رکھا گیا۔ راویوں کی کثرت اور ان کی ان مختلف نوعیتوں ہی کا نتیجہ ہے کہ دوست ہی نہیں، آج دشمن بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہیں کہ:۔

"یہاں پورے دن کی روشنی ہے، جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے، اور ہر ایک تک وہ پہونچ سکتی ہے"

یہ باسورتھ اسمتھ کی شہادت ہے، جس کا اظہار اس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت (صفحہ ۱۰۱) میں کیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی اگر ملحوظ رکھا جائے کہ باہر ہیں ہو یا اندر ہیں، قدرت نے ایسے اسباب فراہم کر دیئے تھے کہ صحرائے عرب کے ایک دور افتادہ نخلستانی قصبہ میں تقریباً دنیا کے بڑے بڑے قابل ذکر مذاہب، یعنی بت پرستی، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت کے ماننے والوں کو مسلمان کر کے حق تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں پہونچا دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی و تکمیلی زدیں دنیا کے تمام مذاہب پر جو پڑ رہی تھیں اس کے سمجھنے کے لئے خود ان مذاہب کے جاننے والوں کی ضرورت تھی۔ اور قدرت نے اس کا بھی سامان کر دیا تھا باہر میں بھی اور اندر میں بھی، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اور عام طور پر لوگ اس سے واقف بھی ہیں۔ عملی طور پر ان عینی شاہدوں کی کثرت کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ قطع نظر اس سے کہ ایک واقعہ کے جب بہت سے دیکھنے والے ہوتے ہیں تو ہر ایک دوسرے کی تکذیب کے خیال سے عموماً غلط بیانی کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ اگرچہ صحابہ کرام کے جن خصوصیات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ان کی بنا پر

یوں بھی ان سے قصداً کسی غلط بیانی کی کون توقع کر سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ قرآن نے قانون شہادت کے ذکر کے سلسلہ میں بیان کیا ہے، ایک گواہ کے سمجھنے یا یاد رکھنے میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو دوسرا اس کی اصلاح کر سکتا ہے۔ حدیث کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایک موقعہ پر نہیں بلکہ متعدد مواقع اس قسم کے پیش آئے ہیں جہاں راویوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے غلط فہمیوں کی اصلاح ہوئی ہے۔ میرا مضمون بہت طویل ہو جائے گا، ورنہ ان کے نظائر جن سے معمولی طلبہ تک واقف ہیں، یہاں پیش کرتا۔

ماسوا اس کے صحابی راویوں کی جو تعداد ابن ابی زرعہ کے حوالے سے میں نے اوپر نقل کی ہے ظاہر ہے کہ صحبت مبارک میں ان سب کا اجتماع ایک وقت میں نہیں ہوا تھا۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہر لمحہ یا ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ یہ سارا مجمع رہتا۔ اگرچہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر تقریباً لاکھ سے اوپر صحابیوں کا مجمع جمع ہو گیا تھا۔ لیکن یہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔ ورنہ عموماً مدینہ منورہ میں جو تعداد صحابہ کی رہتی تھی، یا غزوات و اسفار میں جو لوگ آپ کے ساتھ ہوتے تھے، ان کی ظاہر ہے کہ اتنی تعداد کبھی اکٹھی نہیں ہوئی۔ بیس ہزار، دس ہزار، پانچ ہزار، تین ہزار چار ہزار یا اس سے نیچے کی تعداد فوجی مہموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عموماً رہی ہے۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں ابتداً انصار کے ساتھ مہاجرین کا ایک مختصر گروہ آپ کے ساتھ تھا لیکن جس وقت غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا ہے، کعب بن مالک جو اس سفر میں رفاقت سے محروم رہے تھے اور اس کا ایک دلچسپ واقعہ بخاری میں ان ہی کی زبانی منقول ہے اس میں مدینہ کے اصحاب کا ذکر فرماتے ہوئے آپ نے یہ جملہ فرمایا تھا:۔

والناس کثیر لا یحصیہ دیوان — لوگ بکثرت تھے، کسی دفتر میں ان کی تعداد منضبط نہ تھی۔

بہر حال مدینہ منورہ میں بالآخر اچھی خاصی جماعت باہر کے مہاجرین کی بھی جمع ہو گئی، لیکن ظاہر ہے کہ ان سب کو ہر وقت اپنے مختلف مشاغل کی وجہ سے مجلس مبارک میں حاضری میسر نہیں آتی تھی۔ کسی وقت کوئی رہتا تھا، کسی وقت کوئی۔ اب اگر راویوں کی تعداد دو چار پر ختم ہو جاتی، تو کیا وہ ذخیرہ جمع ہو سکتا تھا جو آج جمع ہو لہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گرد و پیش میں ان ہزاروں مردوں اور عورتوں کے رہنے آنے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی نہ کسی واقعہ یا کسی قول کے محفوظ کرنے کا موقعہ ملا۔ اور اپنی مذکورہ بالا ذمہ داریوں کی بنیاد پر بعض لوگوں نے تو یہ عام قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ اپنی حاضری کے دنوں میں اس عجیب و غریب شخصی تاریخ کے متعلق جن واقعات کا علم حاصل ہوتا تھا دوسرے دن اپنے غائب رفیق کو من و عن سنا دیا کرتے تھے۔ بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:-

كنت انا وجار لي من الانصار في بني اميه بن زيد وهي من عوالي المدينه وكنا نتناوب النزول على رسول الله صلى الله عليه وسلم ينزل يوما وانزل يوما فاذا نزلت جئته بخبر ذلك اليوم من الوحي وغيره وان نزل فعل مثل ذلك۔

میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی ہم دونوں امیہ بن زید والوں کی بستی میں رہتے تھے جو مدینہ کے عوالی کی بستیوں میں سے ہے ہم دونوں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری سے حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن وہ حاضر ہوتے ایک دن میں حاضری دیتا۔ میں جس دن حاضر ہوتا اس دن کے حالات اور خبریں وحی وغیرہ کی ان کو سناتا، اور جب وہ حاضر ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

ابتداءً اسلام میں محدود معاشی ذرائع ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ مہاجرین بیچاروں کو

اپنے اپنے اہل وعیال کی پرورش کے لئے عموماً بیوپار یا صنعتی کاروبار میں مشغول ہونا پڑتا تھا۔ جس کا ذکر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذکر کیا، یہاں آپ کی نگرانی میں کپڑے بننے کی کارگاہیں تھیں، سخ نامی گاؤں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کارخانہ تھا، انصار عموماً اپنے باغوں اور کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ ایک جماعت ان لوگوں کی بھی تھی جو اپنے در گھر سے جدا ہو کر نومسلموں کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں صُفہ نامی جو مدرسہ قائم فرمایا تھا، اس میں داخل ہو جاتے تھے۔ ان کے قیام وطعام کا نظم خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم یا مدینہ کے خوش باش لوگ کیا کرتے تھے اس لئے معاشی افکار سے الگ ہو کر ان کا زیادہ کام یہی تھا کہ قرآن سیکھیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال وسنن کو یاد کریں۔ اسی جماعت کے سرگروہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی ہیں۔ لوگوں کو ان کی کثرت روایت پر کبھی تعجب ہوتا تو خود ہی فرماتے:۔

انکم تزعمون ان ابا ھریرۃ یکثر الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ الموعد انی کنت امرءً مسکینا اصحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ملء بطنی وکان المھاجرون یشغلھم الصفق بالاسواق وکانت الانصار یشغلھم القیام علی اموالھم (بخاری)

تم لوگ خیال کرتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حدیثیں بیان کیا کرتا ہے۔ مگر قسم ہے خدا کی کہ میں ایک غریب مسکین آدمی تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف پیٹ پر پڑا رہتا تھا، درآنحالیکہ مہاجرین بازاروں کے کاروبار میں مشغول رہتے اور انصار اپنے اموال (باغ اور کھیت) میں الجھے رہتے۔

ایک دوسرے موقع پر یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سلسلہ میں وہ کیا کرتے تھے خود تفصیل فرماتے ہیں :-

قدمت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخیبر و انا یومئذ قد زدت علی الثلثین فاقمت معہ حتی مات واد و معہ بیوت نسائہ واخدمہ واغزو معہ واحجّ

میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خیبر کے مقام پر حاضر ہوا، اس وقت میری عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی، پھر میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس قیام کر لیا، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی - میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگا رہتا، آپ اپنی بیویوں کے مکانوں پر جاتے تو میں آپ کے ساتھ جاتا، ہر وقت آپ کی خدمت کرتا، حج میں اور جہاد کے سفروں میں آپ کے ساتھ جاتا۔

(ابن سعد)

طالب العلمی کے ان دنوں میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کیا کیا گذری بعد کو مزے لے لے کر بیان کرتے کبھی کہتے جیسا کہ امام بخاری راوی ہیں :-

واللہ الذی لا الہ الا ھو ان کنت لاعتمد علی الارض بکبدی من الجوع واشد الحجر علی بطنی۔

اُس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے کہ بھوک کی وجہ سے میں جگر تھام کر زمین پر ٹیک لگا لیتا، اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا،

کبھی فرماتے :-

رأیتنی اصرع بین منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحجرۃ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کے درمیان

عائشة فيقال مجنون و ما بی جنون ان هی الا الجوع۔ (صحاح)

میں چکرا کر گر پڑتا، خیال کیا جاتا کہ میں پاگل ہوں، حالانکہ مجھے جنون سے کیا تعلق، وہ تو صرف بھوک کا اثر تھا

مگر یہ سب کچھ گذر رہا تھا، دوسرے ساتھیوں کو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کاروبار کرکے آرام اٹھا رہے ہیں، لیکن تیس تیئیس سال کا یہ دوسی یمنی نوجوان

موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے آستان یار سے اُٹھ جائیں کیا

کہہ کر بیٹھ گیا تھا اور اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ حتی توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور اس قسم کے یہ ایک آدمی نہیں ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود جن کا خطاب ہی صحابہ کی جماعت میں صاحب النعلین والسواک والوسادہ تھا، حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم جب یمن سے آئے تو ابن مسعود کے متعلق مدت تک ہم سمجھتے رہے کہ:۔

انه رجل من اهل بيت رسول الله صلى الله عليه وسلم لما نرى من دخوله و دخول اُمّه على النبى صلى الله عليه وسلّم (اصابہ)

وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر کے کوئی آدمی ہیں، جس کی وجہ ان کی اور ان کی ماں کی آمد و رفت تھی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتی رہتی تھی،

ان کو دربار رسالت سے یہ حکم ملا ہوا تھا کہ،

"على ترفع الحجاب و تسمع سوادی" (اصابہ)

ابن مسعود! تم پردہ کو اٹھا کر میرے حجرہ میں آ سکتے ہو اور تنہائی کی گفتگو سن سکتے ہو۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو ۹ سال تک مسلسل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خانگی خدمت میں رہے۔ اور ان کے سوا بھی حضور کے موالی مثلاً رافع، بلال رضی اللہ

تعالیٰ عنہم ہیں جو بہت کم مجلس رسالت کی حاضری سے محروم رہتے تھے۔ یہ تو مردوں میں۔ اور عورتوں میں یہی حال امہات المومنین کا تھا جن میں کوئی نہ کوئی خلوت کی زندگی میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی تھیں، ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابہ میں جن لوگوں کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جن امور کا علم براہ راست حاصل نہ ہوتا تھا ان کو وہ اپنے دوسرے بھائیوں اور ساتھیوں کے ذریعہ سے معلوم کر لیا کرتے تھے۔ اور اس میں بڑے اور چھوٹے کی بحث نہیں تھی، خود حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ:

کانوا یعرفون لزومی فیسألونی عن حدیثہ منھم عمر و عثمان وعلی وطلحۃ والزبیر۔ (ابن سعد)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میری وابستگی کا حال لوگوں کو چونکہ معلوم تھا اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں مجھ سے پوچھا کرتے، ان پوچھنے والوں میں عمر بھی ہیں اور عثمان بھی علی بھی طلحہ بھی زبیر بھی۔

حدیث کی کتابوں میں اس کا ایک ذخیرہ موجود ہے جس میں خلفاء راشدین اور دوسرے جلیل القدر اصحاب نے باہم ایک دوسرے سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث پوچھی ہے۔ مردوں میں اگر پتہ نہیں چلتا تو امہات المومنین کے پاس آدمی بھیجا جاتا کہ ان کو اگر کوئی علم ہو تو بیان کریں۔ ایک دن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا ابھی ذکر گذرا، حالانکہ ۹ سال تک صحبت نبوی میں ان کو ہمہ وقتی رفاقت کا موقعہ ملا ہے، لیکن ایک حدیث بیان کر رہے تھے کہ حلقہ کے لوگوں میں سے کسی نے پوچھا:۔

انت سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کیا آپ نے اس حدیث کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا۔

ما کل ما نحدثکم به سمعناه من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن کان یحدث بعضنا بعضا۔

(مستدرک حاکم)

ہم تم سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی جو باتیں بیان کیا کرتے ہیں سب خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی سے ہم نے نہیں سنا ہے، بلکہ ہم میں بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے (یعنی ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے سنا ہے)

اور یہ بھی تھا بہت بڑا عظیم نفع حضرات صحابہ کی کثرت تعداد کا۔ ہر ایک اپنی کمی دوسرے کے علم سے پوری کرتا تھا۔ اپنے علم کی تکمیل کے شوق ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ تابعین یا اصاغر صحابہ ہی کے زمانہ میں نہیں، بلکہ خود باہم ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے اپنے علمی نقص کی تکمیل کے لئے کبھی کبھی لمبے لمبے سفر کئے ہیں، اور قرآن نے اسوۂ حسنہ کی کامل اتباع اور پیروی کا ان سے جو مطالبہ کیا تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا بھی چاہیئے تھا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جن کا گھر مدینہ ہی میں تھا، اور خاص طور پر "حدیث" کے مشہور سرمایہ داروں میں ان کا شمار ہے، جیسا کہ آگے بیان ہوگا، خود بیان کرتے ہیں کہ

بلغنی حدیث عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فابتعت بعیراً فشددت علیہ رحلی ثم سرت الیہ شہراً حتی قدمت الشام فاذا عبد اللہ بن انیس الانصاری فاتیت منزلہ وارسلت الیہ ان جابراً علی الباب،

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے ایک صاحب کے واسطے سے مجھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پہونچی۔ میں نے اسی وقت ایک اونٹ خریدا اور اس پر اپنا کجاوا کس کر ایک ماہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ شام پہنچا، اور عبد اللہ بن انیس انصاری (جن سے حدیث پہونچی تھی) ان کے گھر پہونچا۔

فرجع الی الرسول فقال جابر بن عبد اللہ فقلت نعم فخرج الی فاعتنقته واعتنقنی قال قلت حدیث بلغنی عنك انك سمعته من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی المظالم لم اسمعه انا منه قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول الحدیث۔

(جامع بیان العلم ابن عبد البر ص۹۳)

اندر آدمی بھیجا کہ دروازہ پر جابر کھڑا ہوا ہے۔ آدمی نے واپس ہو کر پوچھا کہ کیا جابر بن عبداللہ ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ عبداللہ بن انیس باہر نکل پڑے۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے۔ پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے ذریعہ سے ایک حدیث پہونچی ہے۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے "مظالم" کے متعلق آپ نے سنی ہے اور میں نہیں سن سکا ہوں۔ عبداللہ بن انیس نے جواب میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے (پھر عبداللہ نے پوری حدیث سنائی)

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدفونِ قسطنطنیہ[1] کا ہے کہ ایک حدیث انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خود سنی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ شک پیدا ہوا، آپ کے ساتھ اس حدیث کے سننے کے وقت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی بھی دربار رسالت میں موجود تھے، لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہو گئے تھے، سن کر حیرت ہو گی کہ صرف ایک حدیث میں معمولی شک مٹانے کے لئے حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ سے مصر روانہ ہوتے ہیں اور حضرت عقبہ بن عامر کے پاس حاضر ہو کر فرماتے ہیں۔

---

[1] قسطنطنیہ میں آپ کے دفن کا واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان قسطنطنیہ کا محاصرہ (باقی صفحہ ۴۲۰ پر)

حدثنا ما سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم فى ستر المسلم لم يبق احد سمعه غيرى وغيرك۔

مجھ سے اُس حدیث کو بیان کرو جسے تم نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلق سنا ہے، اب اس حدیث کے سننے والوں میں میرے اور تمہارے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے سامنے اس حدیث کو دہراتے ہیں۔ حدیث یہ تھی من ستر مسلماً خزية ستره الله يوم القيامه۔ وہ سنتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، وہ اس سے بھی عجیب تر ہے کہ

فاتى ابو ايوب راحلته فركبها وانصرف الى المدينه وماحل رحله

(۴۹۔ جامع)

حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث سنتے ہی اپنی سواری کی طرف پلٹے، سوار ہوئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ آپ نے (مصر) میں اپنا کجاوہ بھی نہ کھولا،

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے نام نامی سے حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی واقف ہے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ "ان ابا سعید رحل فى حرف" یعنی حدیث

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۹) کے پڑے تھے جس میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ اتفاق سے بیمار ہوئے اور یقین ہوگیا کہ آخری وقت ہے۔ وصیت فرمائی کہ میری وفات کے بعد جنازہ کرکے مسلمان حملہ کریں اور دشمن کی زمین میں جہاں تک گھس سکتے ہوں گھستے چلے جائیں۔ آخری نقطہ جہاں تک تمہاری رسائی ہو اسی میں مجھے دفن کر دینا۔ جنازہ لے کر مسلمانوں نے حملہ کیا، اور غنیم کو پسپا کرتے ہوئے فصیل کی دیوار تک پہنچ گئے۔ وہیں قبر کھود حضرت کو دفن کر دیا گیا۔ محمد فاتح نے جب صدیوں بعد قسطنطنیہ فتح کیا تو خواب میں آپ نے اپنی قبر کا نشان دیا۔ اسی پر جامع ابی ایوب تیار ہوئی۔

کے ایک حرف کی تصحیح کے لئے ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باضابطہ کوچ کیا۔ دارمی میں ایک اور صحابی کے متعلق ہے

ان رجلاً من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم رحل الی فضالۃ بن عبید اللہ وھو بمصر فقدم علیہ وھو یعید لناقۃ لہ فقال مرحبا قال اما انی لم اتک زائراً ولکن سمعت انا وانت حدیثاً من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجوت ان یکون عندک منہ علم۔ (دارمی)

آنحضرت کے صحابیوں میں سے ایک صاحب فضالہ بن عبید اللہ کے پاس مصر پہنچے۔ فضالہ اس وقت اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے۔ صحابی کو دیکھ کر مرحبا کہا صحابی نے جواب میں فرمایا کہ میں تمہاری ملاقات کو نہیں آیا ہوں بلکہ ہم نے اور تم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی تھی۔ میں یہ امید لے کر آیا ہوں کہ وہ تمہیں یاد ہوگی۔

یہ تو بڑے بڑے صحابیوں کا حال تھا۔ باقی ایسے کمسن اصحاب جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک سے اتنا فائدہ نہ اٹھا سکے تھے، یا ان کے معاصر اور تلامذہ جنہیں تابعین کہتے ہیں، اس باب میں تو ان کے کارناموں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما باوجود قرابتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے صحابہ کے دروازوں پر تلاش حدیث میں گرد کھاتے پھرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کی کثرت تعداد کے اس فائدے کو محسوس کر لیا تھا کہ ان کے ذریعہ سے اپنی تاریخ کے تمام خط و خال کی تکمیل میں پوری مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے ایام طلب کے قصے بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ میں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ

هلم فلنسأل اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم فانهم الیوم کثیر

چلو بھائی! ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے چل کر دریافت کریں کیونکہ ابھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے۔

لیکن ان کے رفیق بخت کے چھوٹے تھے بولے :۔

یا ابن عباس اتری الناس یحتاجون الیك وفی الناس من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم (دارمی)

ابن عباس! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ لوگ تمہارے بھی محتاج ہوں گے حالانکہ ابھی تو لوگوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابی موجود ہیں۔

لیکن اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ یوں ہی چھوٹے بڑوں کے گذرنے کے بعد بڑے بنتے ہیں۔ بعد کو اپنے علمی سرمایہ کی بدولت جب ابن عباس مرجع انام بن گئے تو وہ بیچارے پچھتاتے تھے اور کہتے تھے کان هذا الفتیٰ اعقل منّی (یہ نوجوان مجھ سے زیادہ دانش مند تھا) تابعین میں سعید بن المسیب مسروق وغیرہ جن کے حالات آگے آرہے ہیں، ان کے بیانوں میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب سے امام مالک راوی ہیں :۔

انی کنت لأسیر اللیالی والایام فی طلب الحدیث (جامع)

میں حدیث کی تلاش میں کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں مسلسل چلتا رہا ہوں۔

حضرت مسروق کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ رحل فی حرف (یعنی صرف ایک لفظ کی تحقیق کے لئے کوچ کیا)۔ ان تابعیوں کی نزاکت ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب اوقات کوئی حدیث ان کو ایسے آدمی سے پہونچتی جو شرف صحبت سے فیض یاب نہ ہوتے، حالانکہ

اس حدیث کا علم ان کو حاصل ہو چکا ہوتا، لیکن اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ جس صحابی سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے وہ زندہ ہیں، تو خواہ وہ کسی مقام پر ہوتے، ان تک پہنچ کر کوشش کرتے کہ براہ راست بھی اس روایت کو صحابی سے خود سن لیں۔ دارمی نے ابو العالیہ سے یہ روایت درج کی ہے۔

کنا نسمع الروایۃ بالبصرۃ عن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم نرض حتیٰ رکبنا الی المدینۃ فسمعناھا من افواھھم (دارمی)	ہم لوگ بصرہ میں ایک روایت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے حوالہ سے سنتے تھے، مگر ہم صرف اسی پر قناعت نہیں کر لیتے تھے، جب تک سوار ہو کر مدینہ پہونچ کر خود ان صحابیوں کی زبانی بھی اس روایت کو نہ سن لیتے۔

یہ کسی خاص شخص کا حال نہیں ہے بلکہ عام تابعین کے طرز عمل کا بیان ہے۔

طلب حدیث کے لئے رحلت کا ایسا عام مذاق پھیل گیا تھا کہ بطور امور عامہ کے بعض بعض تابعین کی زبان پر یہ لطیفہ جاری ہو گیا، یعنی شاگردوں سے حدیث بیان کرتے اور آخر میں نہیں مخاطب کر کے بطور طیب کے فرماتے:۔

خذھا بغیر شئ قد کان الرجل یرحل فیما دونھا الی المدینۃ (ابن سعد)	بغیر کسی معاوضہ کے (مفت) یہ حدیث لے لو، ورنہ حال یہ تھا کہ اس سے بھی کم چیز کے لئے لوگ مدینہ تک سفر کرتے تھے۔

یہ حضرت شعبی کا قول ہے جو کوفہ میں اپنے طلبہ سے مزاحاً کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔

مذکورہ بالا عوامل و موثرات سچ پوچھیے تو بجائے خود ان میں ہر ایک حدیث، یعنی تاریخ کے اس عجیب و غریب سرمایہ کی حفاظت کی کافی ضمانت ہے۔ لیکن جہاں یہ سارے اسباب اکٹھے ہو گئے ہوں، اور اب اسی کے ساتھ آپ اس عام تاریخی دعوی کو بھی اپنے سامنے

رکھ لیجئے کہ:-

مذهب العرب انهم كانوا	عرب کا عام طریقہ تھا کہ زبانی یاد رکھنے کی کچھ
مطبوعين على الحفظ مخصوصين	ان کی فطری عادت سی تھی۔ اس بات میں ان
بذالك (جامع)	کو خاص خصوصیت حاصل تھی۔

عرب کا بد دکتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اڑاتا تھا۔ بدوؤں کا یہ عام چلتا ہوا فقرہ تھا "حرف فی تامورك خير من عشرة فی كتبك" (اول میں ایک حرف کا محفوظ رہنا، کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے)

عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

ليس يعلم ما حوى القمطرا	ما العلم الا ما حوى الصدرا
علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے	نہیں ہے علم لیکن حرف وہی جو سینہ میں محفوظ ہو

دوسرا کہتا ہے ؎

استودع العلم قرطاسا فضيعه	وبئس مستودع العلم القراطيس
بس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا اس نے اسے ضائع کیا	علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں

تیسرے کا شعر ہے ؎

علمی معی حيث ما يممت احمله	بطنی وعاء له لا بطن صندوق
میرا علم میرے ساتھ ہے جہاں جاتا ہوں اسے اٹھائے لئے جاتا ہوں	میرا باطن اس علم کا برتن ہے نہ کہ تنگ صندوق
ان كنت فی البيت كان العلم فيه معی	اذا كنت فی السوق كان العلم فی السوق
اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ رہتا ہے	جب بازار میں ہوتا ہوں تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے

کم از کم ان اشعار سے اس قوم کے خاص رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے اور کتابت کے متعلق

شاید ہی کسی زبان میں اس قسم کے اشعار مل سکتے ہیں۔ سوسائٹی کے اس خاص مذاق کا یہ نتیجہ تھا کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظہ پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انسان اپنی جس قوت کو زیادہ استعمال کرتا ہے اسی میں جلا پیدا ہو جاتی ہے۔ مختلف اقوام کی مختلف چیزوں کے ساتھ خاص مناسبت کی یہی وجہ ہے۔ اسی لئے یہ مسلم ہے ان العرب قد خصت بالحفظ (عرب حافظہ کی قوت میں خصوصیت رکھتے تھے)۔ ان کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات کتابوں میں درج ہیں کتابی قوموں کے لئے حقیقت یہ ہے کہ ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ حافظ عمر بن عبد البر لکھتے ہیں۔

کان احدھم یحفظ اشعار بعض فی سمعۃ واحدۃ	ان میں بعض لوگ صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے۔

ابن عباس کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ستر شعر کا ایک طویل قصیدہ پڑھ گیا۔ شاعر کے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق کچھ گفتگو چلی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ مصرعہ اس نے یوں پڑھا تھا۔ جو مخاطب تھا اس نے پوچھا کہ تم کو پہلی دفعہ میں کیا پورا مصرعہ یاد رہ گیا؟ بولے کہو تو پورے ستر شعر سنا دوں، اور سنا دیا۔ حدیث کے مشہور راوی امام زہری کا بیان لوگ نقل کرتے ہیں کہ

انی لأمر بالبقیع فأسد آذانی مخافۃ ان یدخل فیھا شیٔ من الخنا فواللہ ما دخل اذنی شیٔ قط فنسیتہ (ابن عبد البر)	میں "بقیع" کی طرف گذرتا ہوں تو اپنے کانوں کو بند کر لیتا ہوں اس اندیشہ سے کہ ان میں کوئی خراب بات نہ داخل ہو جائے، کیونکہ قسم خدا کی میرے کان میں کوئی بات اب تک ایسی داخل نہیں ہوئی ہے جسے میں بھول گیا ہوں

شعبی بھی یہی کہتے تھے:۔

ما کتبتُ سوداء فی بیضاء وما استعدت حدیثا من النسیان (ابن سعد)	میں نے کبھی سیاہی سے سفیدی پر کچھ نہیں لکھا، اور نہ کسی شخص کی گفتگو میں نے کبھی بھولنے کے باعث دہرائی۔

غبروں پر تو محبت نہیں ہو سکتی۔ لیکن علماء اسلام کا خیال ہے کہ علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ کچھ قدرتی طور پر غیر معمولی تھا، یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق جس نے "انا لہ لحافظون" کا اعلان کیا تھا اُسی نے قرآن کی عملی شکل یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حفاظت جن کے سپرد کی تھی ان کے حافظوں کو غیبی تائیدوں کے ذریعہ سے بھی کچھ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا۔ اور یہ تو بخاری میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دربار رسالت میں نسیان کی جب شکایت کی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ اور دعا کے ذریعہ سے اُن کا حافظہ ایسا ہو گیا کہ پھر وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت تمام صحاح کی کتابوں میں مروی ہے، تقریباً شہرت کے انتہائی درجہ پر پہونچی ہوئی ہے۔

حدیث کے زندہ نسخے بہرحال صحابہ کا ذوق اتباع میں حتی الوسع ممکنہ حد تک اپنے کو بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے قریب تر کرنے کی کوشش، اور اسی رنگ میں دوسروں کو رنگنے کا ان میں بے پناہ جذبہ، ان تمام خصوصیات کے ساتھ جن کا میں نے ذکر کیا، اگر اس کے بعد میں یہ دعویٰ کروں کہ جن واقعات و حالات اور جن اقوال و ملفوظات کا ظہور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ہوا تھا، صحابہ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زندہ متنی بنے ہوئے تھے، اور اس طرح تاریخ کی وہ کتاب یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی، عہد صحابہ میں بجائے ایک نسخہ کے ہزاروں نسخوں کی صورت میں موجود ہو چکی تھی،

تو کیا میرے اس دعوی کو کوئی غلط ثابت کر سکتا ہے؟ پس تدوین حدیث کی پہلی صورت تو خود صحابہ کرام کی زندگی تھی، اور یہ تھی حفاظت حدیث یا اس تاریخ کے محفوظ کرنے اور ہونے کی پہلی صورت۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر صحابی اپنی زندگی میں بالکلیہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ہو بہو نقل تھے۔ اگرچہ خلفائے راشدین ہی نہیں بلکہ درجہ بدرجہ ان سے بھی جو فروتر اصحاب ہیں، ہم کتابوں میں یہ الفاظ ان کے متعلق پاتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید سے ترمذی میں مروی ہے کہ میں نے حضرت حذیفہ صحابی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:۔

حدثنا باقرب الناس من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم هديا ودلا تلقاه فناخذ عنه ونسمع منه	مجھے بتایئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال میں جو آدمی سب سے زیادہ قریب ہو وہ کون ہے تا کہ میں ان سے ملوں اور ان سے علم حاصل کروں، حدیثیں سنوں،

ایک معاصر دوسرے معاصر کے متعلق یہ شہادت ادا کرتا ہے، یعنی حذیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں:۔

اقرب الناس هديا ودلا وسمتا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن مسعود	آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال، وضع و انداز میں سب سے زیادہ قریب ترین آدمی ابن مسعود ہیں۔

صرف اُن ہی باتوں میں نہیں جن کا تعلق شریعت و قانون سے ہے بلکہ بعض صحابہ تو آنحضرت

لہ فن تقید رجال میں انسانی فطرت کی اس کمزوری کا خیال کیا گیا ہے جس کی تعبیر المعاصرۃ اصل المنافرۃ" ہم عصری باہمی نفرت کی بنیاد ہے" کے مشہور فقرہ سے کی گئی ہے اسی لئے معاصر کی معاصر کے متعلق تعریف بہت اہم سمجھی جاتی ہے

صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہو بہو تصویر اتارنے کے لئے یہاں تک کرتے تھے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق عام طور سے مشہور ہے :۔

کان تیتبع آثارہ فی کل مسجد صلی فیہ وکان یعترض براحلتہ فی طریق رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرض ناقتہ (اصابہ)	جن جن مقامات پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے (راستوں) میں نمازیں پڑھی تھیں، ابن عمر ان مقامات کو تلاش کرتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے ۔ راہ میں جہاں کہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا ابن عمر بھی قصداً اس مقام پر یہی کام کرتے تھے۔

یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ سفر کے موقع پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم اگر استنجا کے لئے اونٹ سے کہیں اتر کے بیٹھے تھے تو باوجود عدم ضرورت کے استنجا کرنے والوں کی شکل بنا کر ابن عمر اونٹ سے اتر کر وہاں بیٹھا کرتے اسی سلسلہ میں ان کی یہ عام عادت بیان کی جاتی ہے :۔

لیسئال من حضر اذا غاب عن قولہ وفعلہ (اصابہ)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قول و فعل سے یہ غائب رہتے تو جو لوگ اس وقت حاضر ہوتے ان سے پوچھ لیتے۔

امام مالک سے ان کے شاگرد یحییٰ نے ایک دن پوچھا کہ :۔

أسمعت المشائخ یقولون من اخذ بقول ابن عمر لم یدع الاستقصاء قال نعم (اصابہ)	کیا آپ نے بزرگوں سے یہ سنا ہے کہ ان کا خیال تھا جس نے ابن عمر کے قول کو اختیار کیا، اس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی تکمیل میں کوئی چیز نہیں چھوڑی؟ بولے ہاں!

یہ "استقصا" یا سیرت طیبہ کی کامل "تصویر کشی" یا "ہو بہو نقل" آثارنا انصب العین تو سب ہی کا تھا لیکن ہر شخص کے لئے اس کا میسر آنا آسان نہیں ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ جتنے بھی صحابی تھے ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا اور اسی بنیاد پر میں ہر صحابی کو دراصل حدیث کا ایک نسخہ یا موجودہ اصطلاح میں اجازت دیجئے تو اڈیشن قرار دیتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں بعض اڈیشن بہت زیادہ کامل اور حاوی تھے اور بعض میں وہ کاملیت نہیں پائی جاتی تھی۔ اور اگر صحابہ کی جو تعداد اوپر بیان کی گئی ہے صحیح ہے تو ایمان و اسلام اور جوش عمل کی ان میں جو سینہ زوریاں تھیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا یقیناً مبالغہ نہ ہوگا کہ عہد نبوت میں ہی ہماری وہ تاریخ جس کا نام حدیث ہے، اس کے کامل و ناقص زندہ نسخوں اور اڈیشنوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ کیا دنیا میں کوئی تاریخ یا کسی تاریخ کا کوئی حصہ ایسا موجود ہے جس کے عینی شاہد اتنی تعداد میں خود اس واقعہ کے مجسم آئینے بن کر دنیا کے سامنے پیش ہوئے ہوں؟ اور کیا آئندہ ان نسخوں کی تعداد میں کوئی کمی ہوئی؟ کاملیت کے اعتبار سے جتنی بھی کمی ہوئی ہو لیکن کمیت اور مقدار کے لحاظ سے ہر شخص جانتا ہے کہ ان تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں ہر سال اس کی تعداد میں اضعافاً مضاعفۃً اضافہ ہی ہوتا رہا، اور ہو رہا ہے۔ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں آباد ہو، آج اس کی زندگی میں جتنے صحیح مذہبی اور اخلاقی عناصر شریک ہیں، کیا یہ اسی تاریخ کے کسی حصہ کا عکس نہیں ہے؟ آج بھی کوئی مسلمان ہندوستان کے کسی کور دہ دیہات میں جو نماز میں پڑھتا ہے، قسم کھا کر کہہ سکتا ہے، اور یقیناً وہ اپنی اس قسم میں سچا ہے، کہ وہ اسی طرح ہاتھ اٹھاتا ہے جس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اٹھاتے تھے، یہی کہتا ہے جو حضور کہتے تھے، وہ پڑھتا ہے جو حضور پڑھتے تھے، اسی طرح وہ جھکتا ہے جس طرح حضور جھکتے تھے، اسی طرح زمین پر سر رکھتا ہے جس طرح حضور رکھتے تھے۔ اسی پر مسلمانوں کے

دوسرے مذہبی اور دینی اعمال وعقائد کو قیاس کر لیجئے۔ کچھ نہیں تو کم از کم اس تاریخ کی کوئی ایک آدھ ہی بات، کلمۂ شہادت ہی سہی، اس تاریخ کا یہ جزو تو ہر ایک مسلمان کے اندر اب تک محفوظ ہے حدیث کا بہت بڑا حصہ متواتر ہے اور اسی بنیاد پر کل کے متعلق تو نہیں، لیکن تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرے کے ایک بڑے حصہ کو میں متواتر خیال کرتا ہوں، یعنی بغیر کسی انقطاع کے نسلاً بعد نسل لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑہا کروڑ انسانوں کے ذریعہ سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہونچا ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہنچتا رہے گا۔ ان کی مقدار کیا ہوگی؟ اس کے لئے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ امت اسلامیہ کے تمام فرقے جن مسائل پر متفق ہیں، تقریباً سب کا یہی حال ہے۔ عقائد و ایمانیات کے سوا طہارت، غسل، وضو عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، معاملات، عقوبات، سیاسیات، مباحات و محظورات وغیرہ وغیرہ مختلف ابواب سے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں طبقۃً بعد طبقۃٍ خلفاً عن سلف تواتر کے ساتھ اس حیثیت سے مسلّم ہیں کہ یہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم اور طرز عمل تھا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی اور ان کا شمار کرنا زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔

گویا قرآن کے بعد ہم جس چیز کو بغیر کسی تذبذب و دغدغہ کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں، وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و تقریرات کا یہی حصہ ہے جو ہم تک تعامل و توارث کے ذریعہ سے پہونچا ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ ان معلومات کے ہر ہر جزء کو مسلسل روایت کے ذریعہ سے فن حدیث میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یوں باہم ایک کی دوسرے سے توثیق ہوتی ہے۔ اب روایتوں کے ذریعہ سے یہ چیزیں جس طرح مروی

ہیں ان کو، اور مسلمانوں نے تعامل کے ذریعہ سے ان چیزوں کو جس طرح ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا ہے، دونوں کو سامنے رکھئے ہر ایک کی تصدیق دوسرے سے ہوگی۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا وہ حصہ جس کی منتقلی اس اتفاقی تعامل کے ذریعہ سے عمل میں نہیں آئی ہے، اس کے لئے سب سے پہلے تو ہمارے پاس وہی روایت کا ذریعہ ہے۔ روایت کے اس سلسلہ کی آئندہ کڑیوں پر تو آگے بحث آئے گی، عہد صحابہ میں جس حزم و احتیاط کے ساتھ ان چیزوں کو اپنی اصلی حالت پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی داستان آپ سن چکے۔ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فعل کی نگرانی، صحابہ کرام کا ایک ایک لفظ کے شک مٹانے کے لئے سینکڑوں میل کا سفر طے کرنا، اس کا ذکر بھی آپ سن چکے ہیں۔ لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی بلکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، خود صحابہ بھی ایک دوسرے سے اس معاملہ میں پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، ہر ایک اپنے علم کو دوسرے کے علم پر پیش کرتا تھا، ان کے اس طرز عمل ہی سے روایت کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

متابعات اور شواہد | اسی کے ساتھ صحابہ سے روایت کرنے والے حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ ایک ہی روایت کو جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو اس میں کمی نہ کی جائے۔ اصطلاح حدیث میں روایت کے اس طریق عمل کا نام متابعت تھا۔ اور جو روایتیں اس طریقہ سے حاصل کی جاتی تھیں، یعنی ایک ہی واقعہ کو تصدیق و توثیق کے لئے شاگرد اپنے استاذ کے رفیقوں اور ہمعصروں سے بھی جو روایت کرتا ہے، ان کا نام اصطلاحاً متابعات و شواہد ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا محدثین میں توابع و شواہد کے جمع کرنے کا شوق زیادہ شدت پذیر ہوتا رہا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات سات سو طریقوں سے مروی ہے۔ یعنی حدیث ایک ہے لیکن اس کی سندیں سات سو ہیں۔ اور یہ عدد بھی ایک خاص نقطہ نظر سے ہے۔ ورنہ اس

حدیث کے طرق دراصل اس سے بھی زیادہ ہیں۔ روایتوں میں قوت پیدا کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ محدثین نے اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے جس کا قصہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئے گا۔ حدیث کی مشہور کتاب صحیح مسلم میں امام مسلم کا نقطہ نظر زیادہ تر اسی عمل پر مرکوز رہا ہے۔ خیر یہ تو بعد کو ہوا، لیکن عہد صحابہ میں بھی جہاں تک ممکن ہوا ہے، اس طریقہ کے برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ غیر متواتر حدیثوں کا بھی جو ذخیرہ ہمارے پاس ہے زیادہ تر ان میں ایک ایک حدیث کے راوی آٹھ آٹھ دس دس صحابی ہیں۔ مشہور محدث امام ترمذی نے اپنی کتاب میں جہاں اور بہت سی مفید باتیں اضافہ کی ہیں، اس کا بھی التزام کیا ہے کہ ہر حدیث کو بیان کرکے آخر میں بتاتے ہیں کہ کن کن صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے۔ اور یہ تو واقعہ کے عینی شاہدوں یا ہمعصروں کی تعداد ہے۔ بعد کو صحابہ کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے شاگردوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوتا چلا گیا ان کا تو شمار کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہمارے پاس بحمداللہ ایسی ایک نہیں متعدد کتابیں موجود ہیں، جن میں ہر حدیث کے تمام اسناد ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ آج دنیا میں کون ہے جو گذرے ہوئے واقعات میں سے کسی ایک واقعہ کے متعلق بھی وثوق و اعتماد کے ان آہنیں ذرائع کو پیش کر سکتا ہے؟ باسورتھ اسمتھ حدیث کی اسی تاریخی وثاقت کو دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے:۔

"کوئی شخص یہاں (سیرت نبوی) کے متعلق نہ خود کو دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے کہ یہاں دن کی پوری روشنی ہے" (لائف آف محمد از باسورتھ اسمتھ صفحہ ۱۰۸)

لیکن ابھی بات پوری نہیں ہوئی۔ ایک اہم نقطۂ بحث کا ابھی باقی ہے۔ قبل اس کے کہ میں ادھر توجہ کروں، ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے چلوں۔ عموماً لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ "حدیث" کی ابتدائی نوعیت کسی علم کی نہیں تھی، متفرق طور پر متفرق صحابیوں نے آنحضرت سے کچھ سنا، یا کچھ کرتے ہوئے دیکھا تھا، پھر یا تو بہ ضرورت انہوں نے کبھی اس کا اظہار کر دیا،

یا بعض تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ جیسے گھر کے پرانے بڑے بوڑھے اپنی ریٹائرڈ زندگی میں نوجوانوں کے درمیان بیٹھ کر اپنے عہد جوانی کے قصے دل بہلانے اور گرمیٔ بزم کے لئے بیان کرتے ہیں، اسی طرح نعوذ باللہ حدیث کی ابتداء ہوئی، بعد کو پھر یہ تدریج لوگوں نے اس کو ایک علم بنالیا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور سیرت طیبہ کو جو تعلق قرآن اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی بنیاد پر مسلمانوں کی اخلاقی و مذہبی زندگی سے تھا، آپ اس کا حال سن چکے۔ کیا ان کے بعد کوئی ایک سکنڈ کیلئے بھی سوچ سکتا ہے کہ خدانخواستہ کسی زمانہ میں بھی آپ کے اقوال و اعمال خصوصاً عہد صحابہ میں اتنے غیر اہم ہو سکتے تھے جیسا کہ اس غیطانی وسوسہ کا اقتضاء ہے؟ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے اس کے ذمہ دار تھے کہ قرآن کی تعملی شکل اور اسکے تشریحی مطالب کو خود اپنی زندگی کے نمونوں سے مسلمانوں کو بتائیں، اور مسلمان بھی اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے ہیں کہ ان کو اپنی زندگی کا جزء بنائیں اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلانے کی کوشش کریں ایسی صورت میں یہ انوکھے سوا اس قسم کے اوہام میں اور کون مبتلا ہو سکتا ہے؟ ماسوا اسکے خود عہد نبوت میں جیسا کہ کہہ چکا ہوں، قرآن اور سنن و سیرت کے سیکھنے سکھانے کے لئے ایک باضابطہ تعلیم گاہ صفہ کے نام سے قائم تھی جس میں طلبہ کی تعداد ایک ایک وقت میں اسی اسی تک ہوتی تھی۔ اس مدرسہ میں تعلیم دینے کا کام ابوہریرہ، ابن مسعود، زید بن ثابت، اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم عہد صحابہ میں انجام دیتے تھے۔ مسلمان ہو کر باہر سے لوگ آتے تھے اور حسب ضرورت اس مدرسہ میں تعلیم پا کر اپنے گھر جاتے تھے۔ خود قرآن میں اس کا حکم بھی دیا گیا تھا جیسا کہ ارشاد ہے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا	پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر آبادی میں سے ایک گروہ نکل کر جایا کرے تاکہ دین
فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا	کی سمجھ حاصل کرے اور واپس جا کر اپنے لوگوں کو ڈرائے۔
إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ۔ توبہ	ہو سکتا ہے کہ لوگ اس کے بعد پرہیزگاری اختیار کریں۔

اس مدرسہ میں انہیں کن کن باتوں کی باضابطہ تعلیم دی جاتی تھی حدیثوں میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ فروہ بن مالک جو یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے اور بعد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے قبائل مراد زبید، مذحج

کے گورنر بنا کر بھیجے گئے ان کے ذکر میں بیان کیا جاتا ہے:۔

جاء من الیمن و تعلم القرآن و فرائض الاسلام وشرائعه (ابن سعد)

یمن سے آئے اور قرآن اور اسلام کے فرائض و قوانین کی تعلیم حاصل کی۔

اور یہ تو ان لوگوں کی تعلیم کا طریقہ تھا جو خود مدینہ چلے آتے تھے ۔ لیکن جو نہیں آسکتے تھے ان کے لئے آستانہ نبوت سے باضابطہ معلمین بھیجے جاتے تھے ۔ اسی سلسلہ میں بیر معونہ اور رجیع کے معلموں کا مشہور واقعہ ہے جن میں ان بیچارے معلموں کو دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا تھا ان کے سوا حضرت معاذ بن جبل، حضرت علی کرم اللہ وجہہ منجملہ اور اغراض کے تعلیمی غرض سے بھی یمن بھیجے گئے تھے ۔ حضرت معاذ کو جو حکم دیا گیا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے ۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:۔

بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی قومی ادعوھم الی اللہ تبارک و تعالیٰ و اعرض علیھم شرائع الاسلام (مستدرک)

مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی طرف اس لئے بھیجا کہ ان کو اللہ تبارک و تعالےٰ کی طرف بلاؤں، اور ان پر اسلامی قوانین پیش کروں

الغرض قرآن کے ساتھ ساتھ شرائع اسلام یعنی قرآن کے احکام کی تعمیلی شکل جو صحابہ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم خود کر کے بتایا کرتے تھے، عہد نبوت ہی میں ان دونوں ہی کی حیثیت مستقل علم کی ہو چکی تھی ۔ حدیث کا وہ ذخیرہ جس میں تعلیم و تعلم پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرایوں میں ابھارا ہے، آج کل کی لیڈرانہ تقریروں میں نواس کے تحت داغ اور امیر کی شاعری اور شیکسپیئر و رکالی و اس

کے ڈراموں تک کی تعلیم حاصل کرنے کو داخل کر دیا جاتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ زیادہ تر ان سے مراد قرآن اور سنت ہی کی تعلیم تھی۔ پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا، نہ صرف مدینہ منورہ بلکہ ان تمام مرکزی شہروں میں جہاں جہاں اسلام کی حکومت پہنچ چکی تھی، اور حضرات صحابہ کرام کی مختلف جماعتیں وہاں جا کر توطن پذیر ہو گئی تھیں، جن میں خود مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، یمن، یمامہ، بحرین، دمشق، کوفہ، بصرہ، مصر کو خاص اہمیت حاصل ہے جلیل القدر اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان شہروں کے جوامع میں قرآن کے ساتھ ساتھ روایت حدیث کے باضابطہ حلقے قائم کر دیئے تھے۔ مدینہ منورہ میں مردوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ، اور عورتوں میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمات اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ اسی طرح دمشق میں حضرت ابودرداء، کوفہ میں عبداللہ بن مسعود، بصرہ میں عمران بن حصین، ازیں قبیل ہر مرکزی شہر میں ان اغراض سے تعلیمی حلقے جاری ہو چکے تھے۔ حضرت ابوہریرہ کا ذوق روایت تو اس حد تک پہونچا ہوا تھا کہ جمعہ کے دن بھی چوں کہ مسجد میں عام مسلمانوں کا بڑا مجمع جمع ہو جاتا تھا، اس مجمع کو غنیمت خیال کر کے تقریباً ہر جمعہ میں قبل اس کے کہ امام خطبہ کے لئے منبر پر آئے، آپ کا یہ عام قاعدہ تھا جیسا کہ حاکم کی مستدرک میں روایت ہے کہ

کان ابوھریرۃ یقوم یوم	جمعہ کے دن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ
الجمعۃ الی جانب المنبر	تعالےٰ عنہ منبر کے ایک کنارے کھڑے
ثم یقبض علی رُمّانۃ المنبر	ہو جاتے پھر منبر کا گولا تھام کر فرماتے
یقول قال ابوالقاسم صلی	"فرمایا ابوالقاسم صلے اللہ علیہ وسلم

الله علیه وآله وسلم قال محمد صلی الله علیه وآله وسلم قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم قال الصادق المصدوق صلی الله علیه وآله وسلم فاذا سمع باب المقصورة یخرج الامام جلس۔

نے" فرمایا محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے" فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے" فرمایا الصادق المصدوق صلے اللہ علیہ وسلم نے" پھر جب انہیں محسوس ہوتا کہ "مقصورہ"[1] کے دروازہ سے امام نکل رہا ہے، بیٹھ جاتے۔

ابن سعد کی ایک تابعی سے روایت ہے کہ وہ

دخل مسجد حمص فاذا بحلقة فیهم رجل جمیل وضاح الثنایا وفی القوم من هو أسن منه وهم یقبلون علیه یستمعون کلامه فسألته من انت فقال انا معاذ بن جبل۔

(ابن سعد)

(شام کے مشہور شہر) حمص میں داخل ہوے، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوبصورت آدمی جن کے دانت الگ الگ تھے، لوگوں کے مجمع میں بیٹھے ہوئے ہیں، مجمع میں ایسے آدمی بھی ہیں جو اس حسین آدمی سے عمر میں بڑے ہیں، اور اس پر جھکے ہوئے اس کی باتیں سن رہے ہیں، میں نے پوچھا تم کون ہو، بولے میں معاذ بن جبل ہوں۔

بصرہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے صاحب کا بیان ہے:۔

---

[1] خلفاء پر جب اچانک حملے ہونے لگے تو مسجد میں ایک کمرہ خاص بنا دیا جاتا تھا جس میں خلیفہ سنتیں وغیرہ پڑھتے اور اس سے باہر ہو کر منبر پر آتے۔ اسی کو مقصورہ کہتے تھے۔

أتيت البصرة فدخلت المسجد فاذا انا بشيخ ابيض الراس واللحيه مستند الى اسطوانة فى حلقة يحدثهم

(ابن سعد)

میں بصرہ پہونچا اور مسجد میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھے آدمی جن کے سر کے بال سپید تھے مسجد کے ستون سے پیٹھ لگا کر ایک حلقہ میں بیٹھے ہوئے حدیثیں بیان کر رہے ہیں،

ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ

كان لجابر بن عبد الله حلقة فى المسجد النبوى يوخذ عنه العلم

(اصابہ ج ۱ ص ۲۱۳)

مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا ایک حلقہ درس تھا جس میں لوگ ان سے علم حاصل کرتے تھے۔

اور یہ سب کے سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر اکابر اصحاب ہیں ہیں۔ اس کے بعد پھر کون کہہ سکتا ہے کہ "فن حدیث" کی حیثیت عہد نبوت یا عہد صحابہ میں باضابطہ علم کی نہیں بلکہ افواہی قصوں کی تھی۔

حدیث کی کتابی تدوین | بہرحال یہاں تک تو "فن حدیث" کے وثوق و اعتماد کے صرف دو ذریعوں پر بحث ہوئی یعنی ایک تعامل، دوسری روایت لیکن آخر میں ایک سوال رہ جاتا ہے اور دنیا کے اس کاغذی دور میں عموماً گدگدی اسی کی اٹھتی ہے۔ دل ہی دل میں لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی لیکن کتابی شکل میں آخر تاریخ کا یہ حصہ کب آیا۔ گویا اسی زمانہ کو تدوین حدیث کا آغاز قرار دینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ گذشتہ بالا سازوسامانوں کے ہوتے ہوئے شاید اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی، بلکہ کتابت کے متعلق جو عربی مذاق تھا اس کو دیکھتے ہوئے تو اس کی اور بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ فقہ و حدیث کے مشہور امام

اوزاعی تو فرمایا کرتے تھے۔

كان هذا العلم شيئاً شريفا اذا كان من افواه الرجال يتلاقونه ويتذاكرونه فلما صار في الكتب ذهب نوره وصار الى غير اهله

(جامع بیان العلم ج ۱ ص ۹۸)

حدیث کا علم بہت ہی قیمتی اور شریف اس وقت تک تھا جب لوگوں کے منہ سے حاصل کیا جاتا تھا۔ لوگ باہم ملتے جلتے رہتے تھے اور آپس میں اسی کا تذاکرہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن جب سے حدیثیں کتابوں میں درج ہو گئیں، اس کا نور اور اس کی رونق جاتی رہی اور ایسے لوگوں میں پہنچ گیا جو اس کے اہل نہیں ہیں۔

اور اسی لئے تاریخ حدیث کے بیان کرنے والوں نے حدیث کی کتابی تدوین کا آغاز کب سے ہوا، اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔ لیکن آج اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو نہیں جانتے ہیں اُن مسکینوں کو تو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اس حدیث کا کیا اعتبار جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دو سو برس بعد مدون ہوئی۔ اچھے پڑھے لکھے لوگ اپنے اس دعوی کے ثبوت میں بیچارے امام بخاری اور مسلم کے سن وفات کو پیش کر دیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک سب سے پہلے حدیثوں کو جس نے قلمبند کیا، وہ یہی حضرات تھے۔ اور یہ تو خیر جاہلوں کی باتیں ہیں۔ لیکن بعض محدثین کے بیانات سے عموماً ارباب واقفیت بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ سب سے پہلے جس نے حدیث مدون کی وہ ابن شہاب زہری ہیں جن کا زمانہ پہلی صدی کے اختتام کا ہے۔ گویا یہ لوگ ایک سو برس پیچھے ہٹ کر کتابت حدیث کی تاریخ کو لے جاتے ہیں۔ اس زمانہ کے مطالبوں سے پریشان ہو کر بعض بزرگوں نے جب زیادہ کد و کاوش کنج دکاوے سے کام

لیا تو انہوں نے اعلان فرمایا کہ زیادہ تو نہیں، لیکن حدیثوں کا تھوڑا بہت حصہ عہد صحابہ بلکہ عہد نبوت میں بھی قید تحریر میں آگیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس میں پوری تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ ان لوگوں کو اپنی تائید میں یہ مغالطہ بھی مل جاتا ہے کہ عہد نبوت و صحابہ میں تحریری ساز و سامان ہی کہاں تھا۔ تھوڑا بہت جو تھا، اسی کی حیثیت کے مطابق کچھ چیزیں قید تحریر میں آگئی ہوں گی۔ کتابت و تحریر کے سامانوں کی اس زمانہ میں عرب کے اندر کیا حالت تھی، یہ ایک مستقل مضمون ہے۔ شروع میں بھی اس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور اس وقت اگر تفصیل سے کام لیتا ہوں تو بات بہت طول ہو جائے گی، اس کے لئے مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔ لیکن کم از کم جو قرآن پڑھتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ عرب جو قرآن کا ماحول ہے، اس کے متعلق تحریری سامانوں کے اس افلاس کا کس طرح یقین کر سکتا ہے۔ بھلا جس کتاب کا نام ہی قرآن (پڑھی جانے والی چیز) ہو، فاتحہ کے بعد جس کی پہلی سورۃ کی پہلی آیت کا دوسرا لفظ کتاب ہو، اور مسلسل کتاب، زبر، اسفار، قراطیس، لوح کا ذکر تقریباً ہر بڑی سورہ میں بار بار آتا ہو، پہلی آیت جو پیغمبر پر نازل ہوئی اس میں پڑھنے، لکھنے، قلم تک کا ذکر موجود ہو، روشنائی (مداد) دوات، سفرہ، کاتبین، سجل کا ذکر جس کتاب میں پایا جاتا ہو، کون خیال کر سکتا ہے کہ یہ کتاب ایسے لوگوں میں اتری جو نوشت و خواند سے ایسے عاری تھے جیسے جنگل کے بھیل، اور گونڈ ہیں۔ سر دست[1] صرف اسی ایک قرآن کے اندرونی اشارہ پر اکتفار کر کے میں اب

---

[1] میں نے اب تک اس موضوع پر کوئی مستقل مقالہ تو نہیں لکھا ہے لیکن "جاہلیت اولیٰ و جاہلیت عربی" کے عنوان سے جو میرا مضمون شائع ہو چکا ہے اس میں پیش نظر مواد کا ایک حصہ آگیا ہے خدا نے چاہا تو ان اللہ اپنے معلومات کو کسی مستقل کتاب کی شکل میں مرتب کر دوں گا۔

اپنے دعوے کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ عملی تواتر اور روایت ان دو ذریعوں کے سوا حدیث کی کوئی معمولی مقدار نہیں، بلکہ اس وقت ہمارے پاس اس تاریخ کا جو ذخیرہ موجود ہے، اُس کا غالب ترین حصہ (کم از کم نصف اول کی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے) خود اس کے عینی شاہدوں کے زمانہ میں زیادہ تر ان ہی کے ہاتھوں سے قید تحریر میں آچکا تھا۔ اور اس کے بعد اس دعوے پر یہ اور اضافہ کرتا ہوں کہ ان واقعات کا ایک بڑا جز جس طرح تواتر کے ساتھ مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اور روایت کے متابعاتی و شواہدی طریقوں سے جس طرح یہ موجودہ شکل میں آیا ہے، ٹھیک اسی طرح اپنے چشم دید گواہوں کے زمانہ سے قید تحریر میں آکر مسلسل اسی طرح کتابی شکل میں باقی رہا اور اب تک باقی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے کہ ابتدا میں بعض لوگوں نے حدیث کے بعض ذخیروں کو لکھ لیا ہو، لیکن بعد کو وہ کتابی ذخیرے ضائع ہو گئے، اور درمیان میں پھر زبانی روایت پر اس کا دارومدار رہ گیا ہو، اور آخر میں لوگوں نے اسے پھر قلم بند کیا۔ ایسا سمجھنا بھی قطعاً واقعات کے خلاف ہے۔ بلکہ جس طرح گلستان جب سے سعدی نے لکھی اور اب تک درمیان میں غائب ہوئے بغیر اسی کتابی شکل میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، یعنی اس کتاب پر ایسا کوئی زمانہ نہیں گذرا کہ دنیا سے بالکلیہ ناپید ہو گئی ہو، اور پھر لوگوں نے اپنے حافظوں کے ذریعہ سے اسے دوبارہ قید تحریر میں لایا ہو۔ جیسا کہ توارت وغیرہ کے متعلق ایک دفعہ نہیں بار بار یہ واقعہ پیش آتا رہا ہے کہ تین تین سو چار چار سو سال کے لئے اس کا تحریری سرمایہ ناپید ہو گیا اور پھر سینوں سے اس کو سفینوں میں لانے کی کوشش[1] کی گئی، حدیث کے اس کتابی ذخیرہ پر

---

[1] منجملہ دیگر عام مصادر کے میری کتاب النبی الخاتم صلے اللہ علیہ وسلم میں توارت و انجیل وغیرہ کے متعلق اس سلسلہ کے کافی معلومات مل سکتے ہیں۔

بحمد اللہ یہ حادثہ کبھی نہیں گذرا۔

بہرحال یہ تو میرا دعویٰ ہے، اس دعوے کے ثبوت کے جو ذرائع میرے پاس ہیں اب انہیں پیش کرتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ اور باتیں بیان کی جائیں، پہلے یہ سن لینا چاہیے کہ اس وقت امت کے ہاتھ میں حدیثوں کا جو معتبر اور قابل اعتماد ذخیرہ موجود ہے، اس کی مقدار اور ان حدیثوں کی تعداد کیا ہے؟ یوں تو عام طور سے جہاں حدیث کے حافظوں کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو نامعتبر یا ردشدہ حدیثوں کے سوا جو قابل اعتماد حصہ محفوظ تھا اس کی تعداد سات لاکھ کے اوپر تھی۔ اسی طرح امام ابوزرعہ جو حفاظ حدیث میں خاص امتیاز رکھتے ہیں ان کی حدیثوں کی تعداد بھی سات لاکھ بتائی جاتی ہے۔ امام بخاری کے متعلق عام طور سے لکھتے ہیں کہ انہیں دو لاکھ کے قریب تو غیر صحیح اور ایک لاکھ صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ امام مسلم سے لوگوں نے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ اپنی کتاب صحیح کے متعلق خود فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کان سے سنی ہوئی تین لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے۔ اسی طرح مختلف لوگوں کی طرف بڑے بڑے اعداد منسوب ہیں۔ لیکن ان بیانوں سے عوام جو سمجھتے ہیں کیا اس کا مقصود بھی وہی ہے؟ بات یہ ہے کہ لوگ محدثین کی ایک اصطلاح سے چوں کہ ناواقف ہیں اس لئے انہیں حیرت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ مثلاً امام بخاری کو اگر اتنی صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں تو پھر انہوں نے اپنی کتاب میں سب کو کیوں درج نہیں کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ حدیث کی حفاظت و بیان کا جو روایتی طریقہ ہے پہلے بھی میں بتا چکا ہوں کہ اس طریقہ کو مستحکم و مضبوط بنانے کے لئے ابتدا سے متابعات و شواہد کی کثرت کا طریقہ مروج ہوگیا تھا۔ یعنی ایک ایک حدیث کو جن جن سندوں اور طریقوں سے روایت کرنا ممکن تھا،

محدثین ان تمام طرق کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور ان کی یہ اصطلاح تھی کہ ایک ہی حدیث کو ان کے مختلف طریقوں کے اعتبار سے بجائے ایک کے، طریقوں کے حساب سے شمار کرتے تھے، مثلاً انما الاعمال بالنیات کی حدیث جیسا کہ بیان کر آیا ہوں واقعہ کے لحاظ سے ایک حدیث ہے لیکن محدثین چوں کہ سات سو طریقوں سے اسے روایت کرتے ہیں، اس لئے بجائے ایک کے صرف اسی ایک حدیث کی تعداد سات سو ہو جاتی ہے۔ اور یہ کسی ایک حدیث کا نہیں بلکہ حدیث کے بیشتر حصہ کا یہی حال ہے۔ حدیثوں کے ان عجیب و غریب اعداد کی بنیاد ایک تو یہ ہے۔ دوسرے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ گو ابتدا میں حدیث جس کے لفظی و لغوی معنی بات کے ہیں، اس کا اطلاق محض آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات طیبہ پر کیا جاتا تھا۔ مگر پھر اس میں وسعت پیدا ہوئی اور آپ کے افعال و تقریرات کو بھی اس کے نیچے درج کیا گیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اطلاق میں اور کشادگی پیدا ہوئی اور صحابہ کے اقوال و فتاوی اور فیصلوں، بلکہ تابعین و تبع تابعین تک کی چیزوں کو بعض لوگوں نے "حدیث" کے نیچے داخل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے قدرتاً حدیثوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ لیکن عامی خیال کرتے ہیں کہ یہ براہ راست رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی تعداد ہے۔ صاحب توجیہ النظر لکھتے ہیں۔

ان کثیرا من المتقدمین کانوا یطلقون اسم الحدیث علی ما یشمل آثار الصحابۃ والتابعین وتابعیھم وفتاوٰھم ویعدون الحدیث المروی باسنادین	متقدمین کی بڑی جماعت عموماً حدیث کے لفظ کا اطلاق ایسے عام مفہوم پر کرتی تھی جس میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے آثار و فتاوی سب ہی داخل ہیں۔ نیز ایک ہی حدیث جو دو سندوں سے مروی ہوتی اسے دو حدیث

حدیثین (ص ۹۳) قرار دیتے تھے۔

اور یہی مراد ہے ابن جوزی کے اس فقرے سے جو حدیثوں کے ان اعداد کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان المراد بھذہ العدد الطرق لا المتون (تلقیح ص ۱۸۱) یعنی ان اعداد سے مقصد حدیثوں کے متن کی مقدار نہیں ہے بلکہ ان کے طریقے اور اسناد مراد ہیں۔

یہ حدیث کے ان بڑے بڑے اعداد کا حال ہے۔ لیکن واقعی وہ حدیثیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں، آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ کہاں لاکھوں لاکھ، چار لاکھ کی باتیں تھیں، اور اب سنئے کہ امام بخاری کی صحیح سند کے ساتھ جو حدیثیں مروی ہیں ان کی تعداد لے دے کے بہ مشکل دو ہزار چھ سو دو (۲۶۰۲) ہے۔ اور امام مسلم کی حدیثوں کی تعداد کل چار ہزار ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مسلم میں بخاری کے سوا چار ہزار حدیثیں ہیں۔ بلکہ زیادہ تر دونوں کی روایتیں مشترک ہیں۔ اور یہ تو ان دو بڑی کتابوں کی حدیثوں کا حال ہے۔ موطا امام مالک جسے بعض لوگ صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں، اس کی کل حدیثوں کی تعداد صرف چھ سو ستانوے (۶۹۷) ہے۔ بہرحال شمار کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ صحیح، حسن، ضعیف، ہر قسم کی تمام حدیثیں جو اس وقت صحاح ستہ، مسند احمد اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں اُن کی تعداد پچاس ہزار بھی نہیں ہے۔ اور یہ ہر رطب و یابس کے مجموعہ کی تعداد ہے۔ تمام کتابوں سے چھان بین کر ابن جوزی نے نہیں، جن کی تنقید کا معیار بہت سخت ہے، بلکہ حاکم جو نرمی اور مسامحت میں مشہور ہیں، ان کا بیان ہے کہ اول درجہ کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اب حاکم کی اس رپورٹ کو اپنے سامنے رکھئے اور اس کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ اُن خطوط، اور معاہدوں، امان ناموں، جاگیر و قطائع وغیرہ کے فرامین کے سوا جن کو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا ہے اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے[1] اور حدیث کی جو تعریف ہے ان پر وہ بھی صادق

---

[1] ہمارے فاضل و عزیز دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ڈی فل، ڈی لٹ، پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ان اباقی اگلے صفحہ پر

آتی ہے، حدیث کے اس کتابی ذخیرہ کے سوا عہد نبوت و قرون صحابہ میں حدیث کا کتنا سرمایہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا؟ دنیا کو یہ سن کر حیرت ہو گی، لیکن کیا کیا جائے واقعہ یہی ہے کہ دس ہزار ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ تعداد میں حدیثیں عہد نبوت و عہد صحابہ میں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ آخر آپ خود جوڑ لیجئے۔ محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں اور مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے اور ایک ذریعہ سے نہیں مختلف ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ خود اپنی یادداشت کے لئے بھی اپنی روایت کردہ حدیثوں کو کتابی شکل میں لے آئے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع میں ان کی اس کتاب کے واقعہ کو اس طرح درج کیا ہے کہ مشہور صحابی عمرو بن امیہ ضمیری جن کو طلسم ہوشربا اور داستان امیر حمزہ نے عمرو عیار کے نام سے بہت مشہور کر دیا ہے، اُن کے صاحبزادے حسن بیان کرتے ہیں:۔

تحدثت عند ابی هريرة بحديث فانكره فقلت	میں نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے
انی قد سمعته منك فقال ان كنت سمعته	سامنے ایک حدیث بیان کی۔ اُنہوں نے
منی فهو مكتوب عندی فاخذ بيدی	اس کا انکار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس
الی بيته فارانا كتبا كثيرة	حدیث کو میں نے آپ ہی سے سنا ہے۔
من حديث رسول الله صلی	بولے اگر تم نے مجھ سے حدیث سنی
الله عليه وسلم فوجد ذلك	ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہو گی۔
الحديث فقال قد اخبرتك	پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے

(بقیہ صفحہ ۱۹۶) کو ایک فاضلانہ ترتیب کے ساتھ جمع بھی کر دیا ہے اور اب ان کی یہ کتاب مصر میں "الوثائق السیاسیہ" کے نام سے طبع ہو رہی ہے۔ اب تک ڈاکٹر صاحب ممدوح کو عہد نبوی کے ۱۷۲ کتابی وثائق مل چکے ہیں۔

ان کنت حدثت به فهو مکتوب عندی۔

کمرہ میں لے گئے۔ مجھے انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی کتابیں دکھائیں۔ اسی (ذخیرہ) میں وہ حدیث بھی پائی گئی۔ حضرت ابوہریرہ نے اس کے بعد فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں نے اگر کوئی حدیث تم سے بیان کی تھی تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے بھی دوسری سند سے فتح الباری میں اس روایت کو درج کیا ہے۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہ کے پاس صرف چند حدیثیں لکھی ہوئی تھیں، بلکہ جو کچھ وہ روایت کرتے تھے کتابی شکل میں ان کے پاس وہ موجود تھا۔ جب یہ معلوم ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے اس کے بعد اگر کہا جائے کہ پانچ ہزار سے اوپر حدیثیں اس وقت لکھی ہوئی تھیں تو کیا اس روایت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی! اور صرف ایک نسخہ نہیں، دارمی جو حدیث کی مستند کتاب ہے اور اس کا درجہ صحاح ستہ کی اکثر کتابوں سے بلند ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہور شاگرد بشیر بن نہیک نے ایک نسخہ ان کی حدیثوں کا تیار کرکے خود ان کو پڑھ کر سنایا تھا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن بشیر بن نهیك قال کنت اکتب ما اسمع من ابی هریرة فلما اردت ان افارقه اتیته

حضرت بشیر بن نہیک سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو حدیثیں میں سنا کرتا تھا انہیں لکھ لیا

بکتابہ فقرئتہ علیہ وقلت لہ ھذا ماسمعت منک قال نعم۔

کرتا تھا جب میرا ارادہ ان سے الگ ہونے کا ہوا تو ان کی حدیثوں کو ان کے سامنے پڑھ گیا اور آخر میں کہا کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو آپ سے میں نے سنی ہیں۔ بولے ہاں۔

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوسرے شاگرد ہمام بن منبہ ہیں جو یمن کے امرا میں تھے۔ ایک زمانہ تک ان کی خدمت میں رہے اور ان کی حدیثوں کو جمع کیا جو صحیفۂ ہمام کے نام سے مشہور ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی مسند میں داخل کر دیا ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسی زمانہ میں حضرت ابوہریرہ کی حدیثوں کے یہ تین نسخے تیار ہو چکے تھے۔ اور ان کا تو پتہ چلا ہے۔ ورنہ ابوہریرہ جن کے شاگردوں کی تعداد امام بخاری نے آٹھ سو کے قریب بتائی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ کتنوں نے اس کام کو کیا ہوگا۔ خود حضرت ابوہریرہ نے اپنے لئے جب نسخہ تیار کیا تھا تو کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ ان کے شاگرد ایسا نہ کرتے۔ اور اس سے بھی میں اور آگے بڑھتا ہوں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک یہ بیان درج ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔

مامن اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم احد اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں حضور کی حدیثوں کا بیان کرنے والا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں ہے۔ البتہ عبداللہ بن عمرو بن العاص اس سے مستثنیٰ ہیں (یعنی ان کی

لہ اس کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے برلن کے کتب خانہ میں ڈھونڈ نکالا ہے۔

حدیثوں کی تعداد مجھ سے بھی زیادہ ہے)

جس کے یہ معنی ہوئے کہ عبداللہ بن عمرو کی مرویات کی تعداد خود حضرت ابوہریرہ کے ذاتی اعتراف کی بنیاد پر ان کی حدیثوں سے زیادہ تھی۔ جب ان کی حدیثیں پانچ ہزار سے زائد ہیں تو اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چو بہتر سے یقیناً زائد ہونی چاہیئے۔ بخاری کے صریح الفاظ کا یہ تقاضا ہے۔ اب سنئے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیثوں کا کیا حال ہے۔ بخاری کی اسی حدیث میں ابوہریرہ ہی کا یہ بیان درج ہے کہ وہ لکھا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعہ کے متعلق تو صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انہوں نے اسے جمع کیا تھا یا وفات کے بعد۔ لیکن عبداللہ بن عمرو بن العاص جن کی حدیثوں کی تعداد حضرت ابوہریرہ ہی کے بیان کے مطابق ان کی حدیثوں سے زیادہ اور کثیر ہے، ان کے متعلق تو سب کو معلوم ہے کہ خود براہ راست آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ آپ کی حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ ان کا اپنا بیان ہے جس کا حافظ ابن عبدالبر، ابن سعد، بلکہ ابوداؤد وغیرہ سب نے ذکر کیا ہے۔ میں حافظ ابن عبدالبر کی روایت درج کرتا ہوں۔ خود حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں:۔

قلت یا رسول اللہ اکتبُ	میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا " وہ
کل ما اسمع منك؟ قال	سب کچھ" جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا
نعم۔ قلت فی الرضاء	کروں؟ حضور نے فرمایا ہاں میں نے
والغضب؟ قال نعم	عرض کیا کہ خوشی اور غصہ دونوں حالتوں
فانی لا اقول فی ذلك	کی باتوں کو لکھ سکتا ہوں؟ آپ نے

کلہ الاحقا۔ فرمایا ہاں کیونکہ میں ان سب حالات میں "حق" کے سوا کچھ نہیں بولتا۔

اس روایت میں "اکتب کل ما اسمع" وہ سب کچھ جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا کروں" قابل غور ہے۔ جس کے یہی معنی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہر بات خواہ رضا یا غضب کے حال کی ہو، لکھ لیا کرتے تھے۔ محدثین میں ان کی یہ کتاب "صحیفہ صادقہ" کے نام سے مشہور ہے اور اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ وہ خود بھی اپنی اس کتاب کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ مجھے اس وقت حوالہ محفوظ نہیں ہے، لیکن خیال آتا ہے کہ کسی کتاب میں میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ یہ نام خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تجویز کیا ہوا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔

ابھی مجھے بہت کچھ کہنا ہے، لیکن صرف اسی حد تک میں ٹھیر جاؤں تو گذشتہ بالا وثائق کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اول درجہ کی صحیح روایتوں کی جو تعداد حاکم نے بیان کی ہے، یعنی انہوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار ہے، بلکہ ان کے الفاظ یہ ہیں

الاحادیث التی فی الدرجۃ الاولی لا تبلغ عشرۃ آلاف — اعلیٰ درجہ کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہونچ پاتی،

(توجیہ النظر ص ۹۳)

جس کا یہی مطلب ہوا کہ دس ہزار سے کم ہی ہیں، اور معلوم ہو چکا کہ عہد نبوت ہی میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جو مجموعہ جمع ہوا، اس کی روایتوں کو پانچ ہزار تین سو چوہتر سے تو یقیناً زیادہ ہونا چاہئے، اور ایسے موقع پر ہمیں اس کا بھی خیال کرنا چاہئے کہ عام محاوروں میں "اکثر" کا لفظ جب استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے

محض ریاضیاتی زیادتی مراد نہیں ہوتی، یعنی صرف دو تین عدد کی زیادتی کبھی مقصود نہیں ہو سکتی بلکہ اکثریت معقول تعداد کی زیادتی کو چاہتی ہے، گویا حاکم نے صحیح حدیثوں کی جو تعداد بیان کی ہے، قریب قریب یہ باور کرنا چاہئے کہ عہد نبوت ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی اتنی مقدار خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عبد اللہ بن عمرو قلم بند کر چکے تھے۔ اور ان کے لکھنے پڑھنے کا جو حال تھا اس کے حساب سے ان کے لئے یہ کام کچھ دشوار بھی نہ تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی جب شام و مصر میں ان کو عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کی کتابیں ملیں تو ان سے منتخب کر کے انہوں نے ایک بڑا دفتر تیار کیا تھا اور اس کا نام انہوں نے صحیفہ یرموکیہ رکھا تھا کسی موقعہ پر ان کی اس کتاب کا ذکر آئے گا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف و تصنیف سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔ بہرحال پھر بھی ابھی تک میرے نتیجہ کی حیثیت فی الجملہ قیاسی نتیجہ کی ہے۔ لیکن اب آگے سنئے۔ جن صحابیوں کا شمار اُن لوگوں میں ہے جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں، اس فہرست میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور صحابہ میں معمر ترین بزرگ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ ان کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار دو سو چھیاسی ہے۔ دارمی میں ان سے یہ روایت منقول ہے کہ اپنی اولاد سے جن کی ایک بڑی تعداد تھی فرمایا کرتے :۔

یا بنی قیدوا ھذا العلم — میرے بچو! اس علم (حدیث) کو قلم بند کر لیا کرو۔

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حدیثوں کا مجموعہ یقیناً لکھا جا چکا ہوگا۔ صرف اسی قدر نہیں دارمی ہی میں منقول ہے کہ :۔

رأیت ابان یکتب عند انس — میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انس رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز روایت مستدرک میں سعید بن ہلال کا بیان ہے:۔

کنا اذا اکثرنا علی انس بن	ہم جب حضرت انس سے زیادہ پوچھ گچھ
مالك رضی اللہ تعالیٰ عنہ	لگاتے، تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ
فاخرج الینا محالا عندہ	نکالتے، اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں
فقال ھذہ سمعتھا من النبی	جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے میں
صلی اللہ علیہ وسلم فکتبتھا	نے سنیں اور ان کو لکھا اور لکھ کر حضور
وعرضتھا علیہ ۔ (مستدرک حاکم)	صلے اللہ علیہ وسلم پر پیش کر چکا ہوں۔

تھوڑے ردوبدل سے یہ الفاظ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے، اور حضرت انس کے متعلق کتابت حدیث کی جن دلچسپیوں کا تذکرہ دارمی سے میں نے پہلے نقل کیا ہے ان کو دیکھتے ہوئے صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، تو عہد نبوت میں علاوہ صادقہ کے حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی حدیثوں کے قلم بند ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر پیش کر کے انہوں نے ان روایتوں کی توثیق بھی کرالی تھی۔ کیا اب بھی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے عہد صحابہ میں بلکہ عہد نبوت ہی میں ان کے قلم بند ہو جانے پر کوئی شک کر سکتا ہے؟

مگر یہ داستان اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ حضرت انس ہی کی طرح دوسرے مکثر صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کی روایتوں کی تعداد جیسا کہ ابن جوزی نے تلقیح میں لکھا ہے، ایک ہزار پانسو چھ ہے۔ یہ تو پہلے گذر چکا کہ

حضرت جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کا مسجد نبوی میں درس کا ایک حلقہ تھا۔ اب ان کی روایتوں کے بھی قلم بند ہونے کا حال سنیئے۔ صحیح مسلم میں ان کے متعلق یہ روایت درج ہے، کہ حج کے متعلق انہوں نے ایک کتاب جمع کی تھی۔ نیز حافظ ابن حجر نے تہذیب میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ان کے ایک شاگرد وہب بن منبہ تھے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے شاگرد ہمام رجن کے صحیفہ ہمام کا ذکر گذر چکا کے بھائی تھے، اور انہوں نے اپنے استاذ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کو قلم بند کیا تھا۔ اسی طرح سلمان بن قیس یشکری نے بھی حضرت جابر کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور بڑے بڑے بزرگوں مثلاً شعبی اور سفیان وغیرہ نے قیس سے اس کو سنا بھی تھا۔ خود استاذ نے کتاب لکھی تھی تو شاگرد اس کی اتباع کیوں نہ کرتے۔

عورتوں میں سب سے بڑی تعداد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی حدیثوں کی ہے۔ محدثین نے ان کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار دس بتائی ہے۔ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق تو ثابت نہیں کہ انہوں نے اپنی حدیث جمع کی تھی، اگرچہ ان کے علم وفضل کا یہ حال تھا کہ فرائض جن کے مسائل کا حل بغیر حسابی قاعدوں کے ناممکن ہے بآسانی حل فرماتی تھیں، بڑے بڑے صحابہ ان سے فرائض کے پیچیدہ مسائل پوچھ بھیجتے تھے، ایک ایک دفعہ میں کسی شاعر کے قصیدہ کے ساٹھ ساٹھ بلکہ سو سو شعر برجستہ سنا دیتی تھیں، حدیث کی اشاعت کا شوق ان کا بے نظیر ہے، مگر خود اپنی حدیثوں کے جمع کرنے کا حال معلوم نہیں ہوا۔ لیکن ان کے براہ راست شاگرد اور حقیقی بہن کے لڑکے عروہ بن زبیر، جن کا شمار ان لوگوں میں ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ کی روایتوں کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ان کے متعلق عام طور سے مشہور ہے

کہ شروع میں انہوں نے بھی اپنے علم کو ایک کتاب میں قلم بند کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں حضرت عائشہ کی حدیثوں کا ہونا بھی ضرور ہے کہ سب سے بڑا سرمایہ ان کا یہی تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ واقعۂ حرہ میں جبکہ مدینہ لوٹا اور برباد کیا گیا تھا، غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے قصداً اپنی کتاب ضائع کر دی۔ بعد کو پچتاتے تھے اور کہتے تھے:۔

لوددت انی کنت فدیتھا باھلی ومالی۔ تہذیب (۱۴۲) ج ۷

اچھا ہوتا کہ میں اپنے اہل وعیال اور اپنے مال کو اسی کتاب پر فدا کر دیتا۔

بہرحال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ عہد صحابہ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مجموعہ بھی جمع ہو گیا تھا اگرچہ عروہ کی راہ سے یہ مجموعہ ضائع ہو گیا۔ لیکن حضرت عائشہ کی دوسری مشہور خاتون شاگرد جن کا نام عمرہ بنت عبد الرحمٰن ہے، جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گود میں پرورش پائی تھی اور حدیث عائشہ کے باب میں ان کا شمار عروہ کے برابر برابر تھا ان ہی عمرہ بنت عبد الرحمٰن کے علم کو ان کی بہن کے لڑکے ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے مشہور فرمان کی بنیاد پر جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں بھی ہے، جمع کر لیا تھا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابو بکر کے نام حضرت کا فرمان آیا تھا:۔

ان یکتب لہ من العلم من عند عمرۃ بنت عبد الرحمٰن والقاسم بن محمد

عمرہ بنت عبد الرحمٰن اور قاسم بن محمد کے علم (حدیثوں) کو وہ ان کے لئے لکھ کر تیار کریں۔

اور قاسم بن محمد کے پاس بھی وہی حضرت صدیقہ ہی کی حدیثوں کا زیادہ سرمایہ تھا کہ آپ کے والد محمد بن ابی بکر ان کی ایام طفلی ہی میں مشہور فتنہ میں شہید ہو چکے تھے،

اس لئے یتیم بھتیجہ کی پرورش حضرت عائشہ ہی نے فرمائی تھی۔ ان ہی کے تربیت یافتہ تھے، سب کچھ انہی سے سیکھا تھا۔ بہرحال حضرت عائشہ کی حدیثیں ان ہی دونوں کے ذریعہ سے ابوبکر بن محمد نے جمع کیں، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ نے ان کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ کے مرکزی شہروں میں بھیجیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ گو حضرت عروہ کی کتاب جل گئی، لیکن عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی راہ سے حضرت عائشہ کا جو علم قلم بند ہوا تھا وہ باقی رہا۔

مکثرین (یعنی جن کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار سے اوپر ہے) ان میں اکثروں کے حدیثی سرمایہ کے متعلق عہد نبوت و صحابہ ہی میں قلم بند ہونے کا حال معلوم ہو چکا۔ اب صرف دو تین اور رہ جاتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ نمبر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما کی روایتوں کا ہے، یعنی دو ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں ان کی طرف منسوب ہیں۔ پہلے تو خود ان کے متعلق ابن سعد میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے غلام رافع سے یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کارنامے لکھا کرتے تھے۔ ان کے مشہور آزاد کردہ غلام عکرمہ سے امام ترمذی نے اپنی کتاب العلل میں یہ روایت نقل کی ہے:۔

ان نفرا قد موا علی ابن عباس من اهل الطائف بکتب من کتبه فجعل یقرأ علیهم	حضرت ابن عباس کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے، اور ان کے سامنے ان کی کتابیں پڑھنے لگے۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی حدیثوں کا مجموعہ قلم بند ہو چکا تھا۔ لفظ "کتب" جو جمع کا صیغہ ہے، قابل غور ہے۔ ایک کتاب نہیں،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے چند کتابیں تیار کی تھیں۔ اور ان کے متعلق تو صحیح مسلم تک میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت علی کے فیصلوں اور فتاویٰ کا ایک بڑا حصہ لکھا ہوا ان کے پاس لایا گیا۔ ابن سعد ہی میں روایت یہ بھی ہے کہ ابن عباس کی وفات کے بعد جو علم انہوں نے چھوڑا وہ ایک بار شتر تھا۔ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس بار "شتر" کے کتابی مجموعہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیثوں کا ذخیرہ نہ تھا۔ خود ابن عباس کے ممتاز ترین رشید شاگرد سعید بن جبیر سے دارمی، طبقات ابن سعد وغیرہ میں یہ بیان منقول ہے کہ وہ ان کی حدیثوں کو لکھا کرتے تھے۔ کاغذ ختم ہو جاتا تو جو چیز ملتی حتےٰ کہ ہاتھ پر ہی لکھ لیتے، بعد کو گھر جا کر کاغذ پر اتارتے۔ سعید بن جبیر اُن کے علم کے سب سے بڑے راوی ہیں۔ جب وہ لکھا کرتے تھے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ابن عباس کی شاید ہی کوئی حدیث لکھنے سے رہ گئی ہو۔

ان کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی حدیثوں کا نمبر ہے۔ ان کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیس ہے اب تک مجھے کوئی تحریری ثبوت اس کا تو نہیں ملا کہ خود ابن عمر نے اپنی حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ لیکن دارمی ہی کی یہ روایت ہے، بلکہ طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ سلمان بن موسیٰ کا یہ بیان ہے کہ انہوں نے :۔

انه رای نافعا مولی ابن عمر علی علمه و یکتب بلین یدیه۔	ابن عمر کے مولیٰ نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہے تھے۔

نافع کے متعلق سب جانتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عمر کے چہیتے آزاد کردہ غلام تھے تیس سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ امام مالک کی ان ہی روایتوں کو جو نافع، ابن عمر کے

ذریعے سے وہ روایت کرتے ہیں بعض لوگ سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) قرار دیتے ہیں۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ابن عمر کا علم خود ان کے براہ راست شاگرد کے ذریعے سے یقیناً قلم بند ہو چکا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ابن عباس و ابن عمر کے زمانہ تک بنی امیہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی جس میں تصنیف و تالیف بلکہ ترجمہ تک کا چرچا مسلمانوں میں عام طور پر ہو چکا تھا۔ ان بزرگوں کی حدیثوں کا نہ قلم بند ہونا البتہ محل تعجب ہے۔ پھر جب دلائل موجود ہیں تو انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اور یہ حال تو ان بزرگوں کی حدیثوں کا ہے جو مکثرین کے طبقہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے سوا دوسرے اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جن کا شمار اس طبقہ میں نہیں ہے، ان میں ایک نہیں متعدد صحابیوں کے متعلق ثابت ہے کہ صرف ایک دو حدیث نہیں، بلکہ ان کے بھی اچھے خاصے مجموعے لکھے ہوئے موجود تھے، جن میں بعض تو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لکھوائے ہوئے تھے۔ مثلاً وائل بن حجر صحابی جو حضرموت کے شاہزادوں میں تھے، مدینہ آکر مسلمان ہوئے، اور کچھ دن قیام فرما کر جب واپس جانے لگے تو طبرانی صغیر میں مروی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحیفہ لکھوا کر ان کے حوالے کیا جس میں نماز۔ روزہ۔ شراب۔ سود وغیرہ کے احکام تھے۔

دوسری طویل چیز جو خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ہی لکھوائی ہوئی ہے اس کا تو ذکر بخاری تک میں ہے۔ آپ میں کون نہیں جانتا کہ حجۃ الوداع میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا تھا، اس میں ہر فقرہ بجائے خود اسلام کا ایک اصول تھا۔ اور اچھا خاصہ طویل ہے۔ ابو شاہ یمنی صحابی کی درخواست پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ

ان کو خود لکھوا کر دیا۔ بخاری کی روایت سے شاید شبہ ہو سکتا ہے کہ پورے خطبہ کی نقل کا شاید حکم نہیں دیا گیا تھا۔ امام اوزاعی جو سیر کے امام ہیں، ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا پورا خطبہ لکھوایا گیا تھا؟ بولے ہاں!

هذه الخطبة التی سمعها من النبی صلی اللہ علیه وسلم (یعنی ص۵۵۲ ج)	یعنی وہی خطبہ جسے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا لکھوا کر دیا گیا)

دارمی ہی کی ایک اور روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن والوں کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف قسم کے احکام ایک رسالہ کی شکل میں لکھوا کر بھیجے تھے۔

دارمی کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کتب الی اهل الیمن ان لا یمس القرآن الا طاهر ولا طلاق قبل ملاك ولا عتاق حتی یبتاع ص۲۹۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن والوں کو یہ لکھوا کر بھیجا کہ قرآن کو پاک آدمی کے سوا کوئی نہ چھوئے، اور قبل مالک ہونے کے (یعنی نکاح کے) طلاق نہیں ہے، اور جب تک غلام خریدا نہ جائے اس کے آزاد کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

اس کتاب میں جب اتنے تفصیلی مسائل تھے تو اسلام کے عام فرائض و واجبات کا ہونا تو زیادہ اغلب ہے۔ اسی طرح کنز العمال میں ایک روایت ہے کہ عمرہ بن حزم کو جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک تحریر بھی لکھوا کر ان کے حوالہ فرمائی گئی جس میں فرائض، صدقات، دیات (یعنی قتل کے خون بہا کا قانون) وغیرہ

کے متعلق بہت سی ہدایتیں تھیں۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے تہذیب میں حضرت سمرہ بن جبیر مشہور صحابی کے بیٹے سلیمان بن سمرہ کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

روی عن ابیہ نسخۃ کبیرۃ — اپنے والد سے وہ ایک بڑا نسخہ روایت کیا کرتے تھے۔

(تہذیب ص۱۹۸ ج ۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سمرہ کی حدیثیں بھی جمع ہو چکی تھیں خصوصاً "کبیرۃ" کے لفظ سے اس کی زیادہ تائید ہوتی ہے، ورنہ چند حدیثوں کے متعلق ظاہر ہے کہ "نسخہ کبیرہ" کا اطلاق صحیح نہیں ہو سکتا ترمذی نے کتاب الاحکام میں ایک روایت "باب العین مع الشاہد" کے سلسلہ میں جو درج کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ خزرج کے مشہور سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس کے حوالہ سے ان کے صاحبزادے بعض روایتیں بیان کیا کرتے تھے۔ اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں ہے، اس لئے کہ قبل الاسلام "کتاب" یعنی لکھنے میں جن لوگوں کو مہارت حاصل تھی ان میں ایک حضرت سعد بن عبادہ بھی تھے۔ بخاری کی ایک روایت سے جو کتاب الجہاد باب الصبر علی القتال میں مروی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اپنی حدیث لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح بخاری ترمذی اور صحاح کی دوسری کتابوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک صحیفہ کا ذکر پایا جاتا ہے جسے وہ اپنی تلوار کے نیام میں رکھا کرتے تھے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صحیفہ میں "شریعت" کے بعض اہم مسائل تھے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بیان فرماتے تھے۔ تلاش اور تتبع سے اگر اور کام لیا جائے تو اس قسم کے کتابی ذخیروں میں اور اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بالفعل اپنے بیان کی پہلی قسط کو اسی پر ختم کرتا ہوں، اور مقالہ کے دوسرے مباحث کا تذکرہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ قسطوں میں کیا جائے گا، جس میں سب سے پہلے یہ بیان کیا جائے گا کہ جب حدیث کے

کتابی ذخیروں کا اتنا بڑا سرمایہ عہد نبوت و صحابہ میں جمع ہو چکا تھا۔ اور حدیث کی عام کتابوں میں اس کا ذکر موجود تھا، پھر باوجود اس کے لوگوں کو یہ مغالطہ کس بنیاد پر ہوا کہ سب سے پہلے حدیث کی کتابی تدوین ابن شہاب زہری نے پہلی صدی کے اختتام میں عمر بن عبدالعزیز خلیفہ کے فرمان سے شروع کی۔ اس مغالطہ کے ازالہ کے بعد جن حقائق کا انکشاف ہوگا، ان کے نتائج پر بحث کرنے کے بعد "تدوین حدیث" کے دوسرے مباحث کا تذکرہ کیا جائے گا۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

اطلاع

اخبار "مسلمان" جو ملک کے مشہور اہل قلم مولانا نصر اللہ خاں عزیز بی۔ اے کی ادارت میں ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے اور علاوہ تمام سیاسی۔ اخباری علمی اور ادبی معلومات کے جو ایک بلند پایہ اخبار کے لوازم ہیں، حکومت الٰہیہ کے قیام اور جماعت اسلامی کے استحکام کی بھی دعوت دیتا ہے۔ اس کا مطالعہ حکومت الٰہیہ کے قیام کی سعید و مبارک منزل کی طرف اقدام کی حیثیت رکھتا ہے اور دینی برکات اور دنیوی معلومات کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ آج ہی سے اس کے مستقل خریدار بن جائیے تاکہ اس کے سلسلہ علم و نظر کی ہر کڑی آپ کے سامنے رہے۔ قیمت سالانہ نے بشمشاہی ۳ سہ ماہی عہ نمونہ کا پرچہ مفت طلب کیجئے۔

مینیجر اخبار "مسلمان" لاہور

حمائل شریف

مکتبہ جامعہ کی طرف سے خاص رعائت

اس حمائل شریف کی کتابت محترمہ فاطمۃ الکبریٰ بنت جناب محمد دین صاحب خوشنویس کی ہے۔ موصوفہ کو ہندوستان کی سب سے بہتر عربی خوشنویس ہونے کی حیثیت سے مختلف انجمنوں اور نمائشوں کی طرف سے بہت سے طلائی تمغے ملے ہیں۔ بیگم صاحبہ بھوپال و اعلیحضرت نواب حیدرآباد نے ہدیے اور وظائف پیش کئے ہیں۔ حمائل مترجم ہے اور ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ کا ہے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ہے

رمضان المبارک کے احترام میں مکتبہ نے حمائل شریف کے ہدیے میں خاص عایت کردی تھی یعنی ۳ کے عوض ۲ کردیا تھا امید ہے کہ مسلمان اس عایت سے فائدہ اٹھائیں گے محصول ڈاک مفت

ملنے کا پتہ

صدر دفتر مکتبہ جامعہ، قرول باغ، دہلی

شاخیں اور ایجنسیاں: ۱۔ مکتبہ جامعہ، جامع مسجد، دہلی، ۲۔ مکتبہ جامعہ لوہاری دروازہ لاہور ۳۔ مکتبہ جامعہ، امین آباد لکھنؤ۔ ۴۔ مکتبہ جامعہ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳۔ ۵۔ سرحد بک ایجنسی بازار قصہ خوانی، پشاور۔ ۶۔ کتاب خانہ عابد شاپ، حیدرآباد۔ دکن

جماعت اسلامی کا پہلا اجتماع

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں اسلامی تحریک کی جو تشریح اور اس کے لئے کام کرنے والی ایک جماعت کی جو ضرورت ظاہر کی گئی تھی اور اس جماعت کی تشکیل کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا اس کے متعلق "ترجمان القرآن" کی اشاعت صفر ۱۳۶۰ھ میں عامۃ الناس کو دعوت دی گئی کہ جو لوگ اس نظریہ کو قبول کر کے اس طرز پر عمل کرنا چاہتے ہوں وہ دفتر کو مطلع کریں۔ پرچہ چھپنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اطلاعات آنی شروع ہو گئیں اور معلوم ہوا کہ ملک میں ایسے آدمیوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے جو "جماعت اسلامی" کی تشکیل اور اس کے قیام اور بقا کے لئے جد و جہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ یہ طے کر لیا گیا کہ ان تمام حضرات کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ایک جماعتی شکل بنا لی جائے اور پھر اسلامی تحریک کو باقاعدہ اٹھانے کی تدابیر سوچی جائیں۔ اس غرض کے لئے یکم شعبان ۱۳۶۰ھ (۲۵ اگست ۱۹۴۱ء) اجتماع کی تاریخ مقرر ہوئی اور جن لوگوں نے جماعت اسلامی میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا ان سب کو ہدایت کر دی گئی کہ جہاں مقامی جماعتیں بن گئی ہیں وہاں سے صرف منتخب نمائندے آئیں اور جہاں لوگ ابھی انفرادی صورت میں ہیں وہاں سے حتی الامکان ہر شخص آ جائے۔

۲۸ رجب سے ہی لوگ آنے شروع ہو گئے اور یکم شعبان تک تقریباً ساٹھ آدمی آ چکے تھے۔ باقی کچھ لوگ بعد میں آئے۔ شرکائے اجتماع کی کل تعداد ۷۵ تھی۔

کارروائی

یکم شعبان ۱۳۶۰ھ۔ آنے والوں کا انتظار تھا نیز بعض دوسری وجہ سے بھی باقاعدہ اجتماع نہ ہو سکا البتہ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر لوگ بیٹھ گئے تھے صبح سے شام تک جماعت اور تحریک کے متعلق

بے ضابطہ تبادلہ خیالات کا سلسلہ جاری رہا۔ شام کو دیر تک لوگ دفتر ترجمان القرآن کے صحن میں بیٹھے رہے۔ قریب قریب ہر شخص سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طرف متوجہ تھا۔ لوگ مختلف قسم کے مسائل پیش کرتے اور مودودی صاحب انہیں حل کرتے رہے۔ عشاء کے بعد لوگ منتشر ہوئے اور اپنی اپنی قیام گاہوں میں چلے گئے۔

۲ شعبان ساڑھے آٹھ بجے صبح دفتر کے ایوان میں پہلا اجتماع ہوا۔ سب لوگ فرش پر بیٹھے تھے۔ مودودی صاحب ضرورۃً حاضرین کی اجازت سے کرسی پر بیٹھے اور اصل کارروائی شروع کرنے سے قبل آپ نے ایک نہایت اہم اور طویل خطبہ دیا جس کے دوران میں موجودہ اسلامی تحریک کی تاریخ پر بہت ضروری اور مفید روشنی ڈالی۔ آپ نے بتایا کہ ایک وقت تھا کہ میں خود روایتی اور نسلی مذہبیت کا قائل اور اس پر عمل پیرا تھا۔ جب ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ اس طرح محض ما الفینا علیہ آباءنا کی پیروی ایک بے معنی چیز ہے۔ آخر کار آپ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اسلام کو از سر نو سمجھا اور اس پر ایمان لائے۔ پھر آہستہ آہستہ اسلام کے مجموعی اور تفصیلی نظام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے قلب کو اس طرف سے مطمئن کر دیا تو جس حق پر خود ایمان لائے تھے اس کی طرف دوسروں کو دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا اور اس مقصد کیلئے "ترجمان القرآن" جاری کیا۔ ابتدائی چند سال الجھنوں کو صاف کرنے اور دین کا ایک واضح تصور پیش کرنے میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد دین کو ایک تحریک کی شکل میں جاری کرنے کے لئے پیش قدمی شروع کی۔ "ادارۂ دارالاسلام" کا قیام اس سلسلہ کا پہلا قدم تھا۔ ۱۹۵۷ء (۱۳۷۶ھ) میں یہ قدم اٹھایا گیا اور اس وقت صرف چار آدمی رفیق کار بنے۔ اس چھوٹی سی ابتدا کو اس وقت بہت حقیر سمجھا گیا۔ مگر الحمد للہ کہ ہم بددل نہ ہوئے اور اسلامی تحریک کی طرف دعوت دینے اور اس تحریک کے لئے ذہنی حیثیت سے ذہن ہموار کرنے کا کام لگاتار کرتے چلے گئے۔ اس دوران میں ایک ایک دو دو کر کے رفقاء کی تعداد بڑھتی رہی، ملک کے مختلف حصوں میں ہم خیال لوگوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بھی بنتے رہے، اور ہمارے لٹریچر کے ساتھ زبانی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ آخر کار تحریک کے اثرات کا گہرا جائزہ لینے کے بعد محسوس ہوا کہ اب جماعت اسلامی کی تاسیس اور تحریک اسلامی کو منظم طور پر اٹھانے کے لئے زمین تیار ہو چکی ہے اور یہ وقت دوسرا قدم اٹھانے کے لئے موزوں ترین وقت ہے چنانچہ

اسی بنیاد پر یہ اجتماع منعقد کیا گیا ہے۔

اس تاریخی تبصرے کے بعد مودودی صاحب نے بیان کیا کہ مسلمانوں میں عموماً جو تحریکیں اُٹھتی رہی ہیں اور جو اب چل رہی ہیں پہلے اُن کے اور اس تحریک کے اصولی فرق کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے:۔

اولاً اُن میں یا تو اسلام کے کسی جزو کو، یا مسلمانوں کے نبوی مقاصد میں سے کسی مقصد کو لے کر بنائے تحریک بنایا گیا ہے لیکن ہم عین اسلام اور اصل اسلام کو لے کر اُٹھ رہے ہیں، اور پورا کا پورا اسلام ہی ہماری تحریک ہے

ثانیاً اُن میں جماعتی تنظیم دنیا کی مختلف انجمنوں اور پارٹیوں کے ڈھنگ پر کی گئی ہے۔ مگر ہم ٹھیک وہی نظام جماعت اختیار کر رہے ہیں جو شروع میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ جماعت کا تھا۔

ثالثاً اُن میں ہر قسم کے آدمی اس مفروضہ پر بھرتی کر لیے گئے ہیں کہ جب یہ مسلمان قوم میں پیدا ہوئے ہیں تو "مسلمان" ہی ہوں گے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ارکان سے لے کر کارکنوں اور لیڈروں تک بکثرت ایسے آدمی ان جماعتوں کے نظام میں گھس گئے جو اپنی سیرت کے اعتبار سے ناقابل اعتماد تھے اور کسی بار امانت کو سنبھالنے کے لائق نہ تھے لیکن ہم کسی شخص کو اس مفروضہ پر نہیں لیتے کہ وہ "مسلمان" ہو گا "بلکہ جب وہ کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم اور مقتضیات کو جان کر اُس پر ایمان لانے کا اقرار کرتا ہے تب اُسے جماعت میں لیتے ہیں، اور جماعت میں آنے کے بعد اُس کے جماعت میں رہنے کے لیے اس بات کو شرط لازم قرار دیتے ہیں کہ اسلام میں جو کم سے کم مقتضیات ایمان ہیں اُن کو وہ پورا کرے۔ اس طرح انشاء اللہ مسلمان قوم میں سے صرف صالح عنصر ہی چھٹ کر جماعت میں آئے گا، اور جو جو صالح بنتا جائے گا اس جماعت میں داخل ہوتا جائے گا۔

رابعاً اُن تحریکوں کی نظر ہندوستان تک اور ہندوستان میں بھی صرف مسلم قوم تک محدود رہی ہے کسی نے وسعت اختیار کی تو زیادہ سے زیادہ بس اتنی کہ دنیا کے مسلمانوں تک نظر پھیلا دی، مگر بہر حال یہ تحریکیں صرف اُن لوگوں تک محدود رہیں جو پہلے سے "مسلم قوم" میں شامل ہیں، اور اُن کی دلچسپیاں بھی اُنہی مسائل تک محدود رہیں جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اُن کے کاموں میں کوئی چیز ایسی شامل نہیں رہی ہے جو غیر مسلموں کو اپیل کرنے والی

ہو بلکہ بالفعل اُن میں سے اکثر کی سرگرمیاں غیر مسلموں کے اسلام کی طرف آنے میں الٹی سدِّ راہ بن گئی ہیں۔ لیکن ہمارے لئے چونکہ خود اسلام ہی تحریک ہے اور اسلام کی دعوت تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ہے، لہٰذا ہماری نظر کسی خاص قوم یا کسی خاص ملک کے مخصوص وقتی مسائل میں الجھی ہوئی نہیں ہے بلکہ پوری نوعِ انسانی اور سارے کرۂ زمین پر وسیع ہے، تمام انسانوں کے مسائل زندگی ہمارے مسائل زندگی ہیں اور اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت سے ہم ان مسائل زندگی کا وہ حل پیش کرتے ہیں جس میں سب کی فلاح اور سب کے لئے سعادت ہے۔ اس طرح ہماری جماعت میں نہ صرف پیدائشی مسلمانوں کا صالح عنصر کھنچ کر آئے گا بلکہ نسلی غیر مسلموں میں بھی جو سعید روحیں موجود ہیں وہ اس میں شامل ہوتی چلی جائیں گی۔

اس توضیح کے بعد مودودی صاحب نے فرمایا کہ یہی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر ہم اپنی اس جماعت کو "اسلامی جماعت" اور اس تحریک کو اسلامی تحریک کہتے ہیں، کیونکہ جب اس کا عقیدہ الصبغۃ اللہ، نظامِ جماعت اور طریقِ کار بلا کسی کمی و بیشی کے وہی ہے جو اسلام کا ہمیشہ رہا ہے تو اس کے لئے اسلامی جماعت کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں ہو سکتا، اور جب یہ عین اسلام کے لنسبغ اللہ کی طرف اسلامی طریق ہی پر حرکت کرتی ہے تو اس کی تحریک اسلامی تحریک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر زمانہ نبوت کے بعد جب کبھی ایسی کوئی تحریک دنیا میں اٹھی ہے، اُس کو دو زبردست اندرونی خطرے پیش آئے ہیں:۔

ایک یہ کہ ایسی جماعت بننے اور ایسی تحریک لیکر اٹھنے کے بعد بہت جلدی لوگ اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اُن کی جماعت کی حیثیت وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں اسلامی جماعت کی تھی، بالفاظ دیگر یہ کہ جو اس جماعت میں نہیں وہ مومن نہیں ہے اور من شذ شذ فی النار۔ یہ چیز بہت جلدی اس جماعت کو مسلمانوں کا ایک فرقہ بنا کر رکھ دیتی ہے اور پھر اس کا سارا وقت اصل کام کے بجائے دوسرے مسلمانوں سے الجھنے اور مناظرے کرنے میں کھپ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایسی جماعتیں جس کو اپنا امیر بالاتمام تسلیم کرتی ہیں اُس کے متعلق اُن کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ

اُس کی وہی حیثیت ہے جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کی تھی، یعنی جس کی گردن میں اُس امام کی بیعت کا قلادہ نہیں وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، اور اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار اُس کی ساری تگ و دو بس اپنے امیر یا امام کی امارت و امامت منوانے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

مودودی صاحب نے کہا کہ ہم کو ان دونوں خطرات سے بچ کر چلنا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ ہماری حیثیت بعینہٖ اُس جماعت کی سی نہیں ہے جو ابتداءً نبی کی قیادت میں بنتی ہے، بلکہ ہماری صحیح حیثیت اُس جماعت کی ہے جو اصل نظام جماعت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اُس کو تازہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نبی کی قیادت میں جو جماعت بنتی ہے وہ تمام دنیا میں ایک ہی اسلامی جماعت ہوتی ہے اور اُس کے دائرے سے باہر صرف کفر ہی ہوتا ہے مگر بعد میں اُس نظام اور کام کو تازہ کرنے کے لئے جو لوگ اٹھیں، ضروری نہیں کہ ان سب کی بھی ایک ہی جماعت ہو ایسی جماعتیں بیک وقت بہت سی ہو سکتی ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بس ہم ہی اسلامی جماعت ہیں اور ہمارا امیر ہی امیر المومنین ہے۔ اس معاملہ میں تمام اُن لوگوں کو جو ہماری جماعت میں شامل ہوں غلو سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے کیونکہ بہرحال ہم کو مسلمانوں میں ایک "فرقہ" بننا نہیں ہے، خدا ہمیں اس سے بچائے کہ ہم اُس کے دین کے لئے کچھ کام کرنے کے بجائے مزید خرابیاں پیدا کرنے کے موجب بن جائیں۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے فرمایا کہ جماعت اسلامی کے لئے دنیا میں کرنے کا جو کام ہے اس کا کوئی محدود تصور اپنے ذہن میں قائم نہ کیجئے۔ دراصل اس کے لئے کام کا کوئی ایک ہی میدان نہیں ہے، بلکہ پوری انسانی زندگی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اس کے دائرۂ عمل میں آتی ہے۔ اسلام تمام انسانوں کے لئے ہے، اور ہر چیز جس کا انسان سے کوئی تعلق ہے اس کا اسلام سے بھی تعلق ہے لہٰذا اسلامی تحریک ایک ہمہ گیر نوعیت کی تحریک ہے، اور یہ خیال کرنا غلط ہے کہ اس تحریک میں کام کرنے کیلئے صرف خاص قابلیتوں اور خاص علمی معیار کے آدمیوں ہی کی ضرورت ہے نہیں یہاں ہر انسان کے لئے کام موجود ہے کوئی انسان بیکار نہیں ہے ہر شخص جو قابلیت بھی رکھتا ہو اس کے لحاظ سے وہ اسلام کی خدمت میں اپنا حصہ ادا کر سکتا ہے۔ عورت، مرد، بوڑھا، جوان، دیہاتی، شہری، کسان، مزدور، تاجر، ملازم،

مقرر، محرر، ادیب، آن پڑھ اور فاضل اجل، سب یکساں سامد اور یکساں مفید ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ جان بوجھ کر اسلام کے عقیدے کو اختیار کر لیں، اس کے مطابق عمل کرنیکا فیصلہ کر لیں، اور اُس مقصد کو جسے اسلام نے انسان کا نصب العین قرار دیا ہے اپنی زندگی کا مقصد بنا کر کام کرنے پر تیار ہو جائیں۔ البتہ یہ بات ہر اُس شخص کو جو جماعت اسلامی میں آئے اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ جو کام اس جماعت کے پیش نظر ہے وہ کوئی ہلکا اور آسان کام نہیں ہے۔ اسے دنیا کے پورے نظام زندگی کو بدلنا ہے۔ اسے دنیا کے اخلاق، سیاست، تمدن، معیشت، معاشرت، ہر چیز کو بدل ڈالنا ہے، دنیا میں جو نظام حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے اُسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے، اور اس کام میں تمام شیطانی طاقتوں سے اس کی جنگ ہے۔ اس کو اگر کوئی ہلکا کام سمجھ کر کرے گا تو بہت جلدی مشکلات کے پہاڑ اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر اُس کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ اس لئے ہر شخص کو قدم آگے بڑھانے سے پہلے خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کس خارزار میں قدم رکھ رہا ہے۔ یہ وہ راستہ نہیں ہے جس میں آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹ جانا دونوں یکساں ہوں۔ نہیں، یہاں پیچھے ہٹنے کے معنی ارتداد کے ہیں، خدا کی طرف سے پیٹھ موڑنے کے ہیں، لہذا جو قدم بڑھاؤ اس عزم کے ساتھ بڑھاؤ کہ اب قدم پیچھے نہیں پڑے گا۔ جو شخص اپنے اندر ذرا بھی کمزوری محسوس کرتا ہو بہتر ہے کہ وہ اسی وقت رک جائے

آخر میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ اس اجتماع کے انعقاد کی غرض یہ ہے کہ جو لوگ اسلامی عقیدہ کو جان بوجھ کر قبول کریں اور اس کے نصب العین کے لئے کام کرنے پر تیار ہوں، وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ختم کر کے اللہ اور رسول کی ہدایت کے مطابق ایک جماعت بن جائیں، اور باہمی مشورہ سے جماعتی طریق پر آئندہ کام کرنے کیلئے ایک نظام بنالیں۔ میرا کام آپ کو ایک جماعت بنانے کے بعد پورا ہو جاتا ہے۔ میں صرف ایک داعی تھا، بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا، اور میری تمام مساعی کی غایت یہ تھی کہ ایسا ایک نظام جماعت بن جائے۔ جماعت بن جانے کے بعد میرا آپ پر کوئی حق نہیں رہتا۔ اب جماعت کا کام ہے کہ اپنے میں سے کسی اہل تر آدمی کو اپنا امیر منتخب کرے، اور پھر یہ اُس امیر کا کام ہے کہ آئندہ اس تحریک کو چلانے کیلئے اپنی صوابدید کے مطابق ایک پروگرام بنائے اور اُسے عمل میں لائے۔ میرے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ جب سے میں نے دعوت دی ہے تو آئندہ اس تحریک کی رہنمائی کو بھی میں اپنا ہی حق سمجھتا ہوں۔ ہرگز نہیں، نہ میں

اسکا خواہشمند ہوں، نہ اس نظریہ کا قائل ہوں کہ داعی کو ہی آخر کار لیڈر بھی ہونا چاہیئے، نہ مجھے اپنے متعلق یہ گمان ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کا لیڈر بننے کی اہلیت مجھ میں ہے، اور نہ اس کام کی بھاری ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے کوئی صاحب عقل آدمی یہ حماقت کر سکتا ہے کہ اس بوجھ کے اپنے کندھوں پر لادے جانے کی خود تمنا کرے۔ درحقیقت میری غایت تمنا اگر کچھ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک صحیح اسلامی نظام جماعت موجود ہو اور میں اس میں شامل ہوں۔ اسلامی نظام جماعت کے ماتحت ایک چپڑاسی کی خدمت انجام دینا بھی میرے نزدیک اس سے زیادہ قابل فخر ہے کہ کسی غیر اسلامی نظام میں صدارت اور وزارت عظمیٰ کا منصب مجھے حاصل ہو۔ لہذا اس مفروضہ پر نہ چلیے کہ جس طرح تشکیل جماعت سے پہلے سارے کام میں اپنی ذمہ داری پر چلاتا رہا ہوں، اسی طرح تشکیل جماعت کے بعد بھی میں ہی آپ سے آپ امارت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لوں گا یا لینا چاہوں گا۔ جماعت بن جانے کے بعد میری اب تک کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے آئندہ کے کام کی پوری ذمہ داری جماعت کی طرف منتقل ہوئی جاتی ہے اور جماعت اپنی طرف سے اس ذمہ داری کو جس کے بھی سپرد کرنے کا فیصلہ کرے اس کی اطاعت اور خیر خواہی اور اس کے ساتھ تعاون کرنا ہر فرد جماعت کی طرح میرا بھی فرض ہوگا۔

اس تمہیدی تقریر کے بعد آپنے دستور جماعت اسلامی کا مسودہ پڑھنا شروع کیا۔ اس مسودہ کی کچھ کاپیاں پہلے ہی طبع کرالی گئی تھیں اور تمام آنے والوں کو اجتماع سے ایک یا دو روز قبل دیدی گئی تھیں تا کہ وہ اس پر اچھی طرح غور کر لیں۔ اجتماع عام میں اس کے متعلق ہر شخص کو اظہار رائے کا پورا پورا موقع دیا گیا۔ اس کا ایک ایک لفظ پڑھا گیا اور اس پر بحث ہوئی۔ قریب قریب مغرب کے وقت جا کے یہ جلسہ ختم ہوا۔ درمیان میں صرف دوپہر کے کھانے اور ظہر و عصر کی نمازوں کیلئے جلسہ ملتوی کیا گیا تھا۔ بہرحال شام کے آتے آتے ہر ضروری مسئلہ زیر بحث آکے طے ہو چکا تھا۔ دستور بعض ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ پورا کا پورا باتفاق کلی پاس ہو گیا۔

اس کے بعد سب سے پہلے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اٹھے اور کلمہ شہادت اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ کا اعادہ کیا اور کہا کہ لوگو گواہ رہو کہ میں آج از سر نو ایمان لاتا اور جماعت اسلامی میں

شریک ہوتا ہوں۔ اس کے بعد محمد منظور نعمانی صاحب کھڑے ہوئے اور آپ ہی کو دودی صاحب کی طرح تجدید ایمان کا اعلان کیا۔ بعد ازاں حاضرین میں سے باری باری آکے ہر شخص اٹھا، کلمہ شہادت ادا کیا، اور جماعت میں شریک ہوا۔ اکثر حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے بلکہ بعض لوگوں پر تو روتے روتے رقت طاری ہوگئی تھی۔ قریب قریب ہر شخص کلمۂ شہادت ادا کرتے وقت ذمہ داری کے احساس سے کانپ رہا تھا۔ جب سب لوگ شہادت ادا کر چکے تو مودودی صاحب نے اعلان کیا کہ اب جماعت اسلامی کی تشکیل ہوگئی، آئیے ہم سب مل کر رب العالمین سے دعا کریں کہ وہ ہماری جماعت کو استقامت اور استقلال بخشے اور ہم کو اپنی کتاب اور اپنے رسولؐ کی سنت کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دعا سے پہلے ابوالاعلیٰ صاحب نے اسلامی جماعت کی حیثیت اُس کے منشا اور نصب العین پر پھر ایک مرتبہ روشنی ڈالی اور حاضرین کو آگاہ کیا کہ انہوں نے آج کتنا بڑا عہد کیا ہے اور اُس کو کس طرح نباہنا چاہیئے۔ بعد ازاں محمد منظور نعمانی صاحب نے دعا شروع کی، دیر تک لوگ خدا کے حضور میں روتے اور گڑگڑاتے رہے، بالآخر مودودی صاحب نے ایک مختصر سی دعا پڑھی اور جلسہ برخاست ہوا۔

۳ر شعبان:۔ صبح آٹھ بجے پھر اجتماع ہوا۔ سب سے پہلے مودودی صاحب نے ایک ایک رکن جماعت کو الگ بلا کر اس سے دریافت کیا کہ وہ اپنے آپ کو جماعت کے کس طبقہ کے لئے پیش کرتا ہے۔ پھر جب ارکان جماعت کی طبقہ وار فہرست مکمل ہوگئی تو مودودی صاحب تقریر کے لئے اُٹھے اور حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جو لوگ ایک ہی عقیدہ، ایک ہی نصب العین اور ایک ہی مسلک رکھتے ہوں اُن کے لئے ایک جماعت بن جانے کے سوا چارہ نہیں، اور اُن کا ایک جماعت بن جانا بالکل ایک فطری امر ہے۔ وحدت کلمہ کا لازمی نتیجہ اتحاد و اجتماع ہے، اور افتراق صرف اُس جگہ ہوتا ہے جہاں کلمہ متفرق ہو۔ وحدت کلمہ کے باوجود نفسانیت کی بنا پر جو تفرقہ رونما ہوتا ہے اُس کی وجہ بھی دراصل یہ ہوتی ہے کہ نفسانیت خود ایک کلمہ ہے جو کلمۂ اسلام کی ضد واقع ہوا ہے اور جو اس کلمہ کا معتقد ہوتا ہے وہ باقی تمام امور میں دوسروں سے متفق ہونے کے باوجود اپنا راستہ الگ بناتا ہے۔ پس جب آپ نے کل شہادت ادا کی کہ آپ سب ایک ہی عقیدہ، ایک ہی نصب العین،

اور ایک ہی راہ عمل رکھتے ہیں، یعنی آپ کا کلمہ واحد ہے تو آپ خود بخود ایک جماعت بن گئے، اور میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھ میں یا آپ میں سے کسی میں وہ نفسانیت ہو جو غیر سبیل المومنین کے اتباع پر کسی کو آمادہ کرے۔ اب کہ آپ کی جماعتی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے تنظیم جماعت کی راہ میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے آپ کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام میں جماعتی زندگی کے قواعد کیا ہیں۔ میں اس سلسلہ میں چند اہم باتیں بیان کروں گا۔

پہلی چیز یہ ہے کہ جماعت کے ہر فرد کو نظام جماعت کا بحیثیت مجموعی اور جماعت کے افراد کا فرداً فرداً سچے دل سے خیر خواہ ہونا چاہئے، جماعت کی بدخواہی، یا افراد جماعت سے کینہ، بغض، حسد، بدگمانی، اور ایذا رسانی وہ بدترین جرائم ہیں جن کو اللہ اور اُس کے رسول نے ایمان کے منافی قرار دیا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ آپ کی اس جماعت کی حیثیت دنیوی پارٹیوں کی سی نہیں ہے جن کا تکیۂ کلام یہ ہوتا ہے کہ "میری پارٹی، خواہ حق پر ہو یا ناحق پر" نہیں، آپ کو جس رشتہ نے ایک دوسرے سے جوڑا ہے وہ دراصل اللہ پر ایمان کا رشتہ ہے، اور اللہ پر ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ آپ کی دوستی اور دشمنی محبت اور نفرت جو کچھ بھی ہو اللہ کے لئے ہو۔ آپ کو اللہ کی فرمانبرداری میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہے نہ کہ اللہ کی نافرمانی میں۔ تعاونوا علی البر والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جماعت کی خیر خواہی کا جو فرض آپ پر عائد ہوتا ہے اُس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ بیرونی حملوں سے آپ اس کی حفاظت کریں، بلکہ یہ بھی ہیں کہ اُن اندرونی امراض سے بھی اُس کی حفاظت کے لئے ہر وقت مستعد رہیں جو نظام جماعت کو خراب کرنے والے ہیں۔ جماعت کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو راہ راست سے نہ ہٹنے دیا جائے، اس میں غلط مقاصد اور غلط خیالات اور غلط طریقوں کے پھیلنے کو روکا جائے، اُس میں نفسانی دھڑے بندیاں نہ پیدا ہونے دی جائیں، اُس میں کسی کا استبداد نہ چلنے دیا جائے، اُس میں کسی دنیوی غرض، یا کسی شخصیت کو بت نہ بننے دیا جائے، اور اُس کے دستور کو بگڑنے سے بچایا جائے۔ اسی طرح اپنے رفقاء جماعت کی خیر خواہی کا جو فرض آپ میں سے ہر شخص پر عائد ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آپ اپنی جماعت کے

آدمیوں کی بیجا حمایت کریں اور انکی غلطیوں میں اُن کا ساتھ دیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ معروف میں اُن کے ساتھ تعاون کریں، اور منکر میں صرف عدم تعاون ہی پر اکتفا نہ کریں، عملاً اُن کی اصلاح کی بھی کوشش کریں۔ ایک مومن دوسرے مومن کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی جو کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں اُس کو راہ راست سے بھٹکتے ہوئے دیکھے وہاں اُسے سیدھا راستہ دکھائے اور جب وہ اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہو تو اُس کا ہاتھ پکڑ لے البتہ آپس کی اصلاح میں یہ ضرور پیش نظر رہنا چاہئے کہ نصیحت میں عیب چینی اور خُردہ گیری اور تشدد کا طریقہ نہ ہو بلکہ دوستانہ دردمندی و اخلاص کا طریقہ ہو جس کی آپ اصلاح کرنا چاہتے ہیں اُس کو آپ کے طرز عمل سے یہ محسوس ہونا چاہئے کہ اُس کی اخلاقی بیماری سے آپ کا دل دکھتا ہے، نہ کہ اُس کو اپنے سے فروتر دیکھ کے آپ کا نفس متکبرانہ لذت لے رہا ہے۔

تیسری بات جس کی طرف میں ابھی اشارہ کر چکا ہوں، مگر جس کی اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ اُسے واضح طور پر بیان کیا جائے یہ ہے کہ جماعت کے اندر جماعت بنانے کی کوشش کبھی نہ ہونی چاہئے۔ سازشیں، جتھہ بندیاں، نجوی (CANVASSING)، عہدوں کی امیدواری، حمیت جاہلیہ اور نفسانی رقابتیں، یہ وہ چیزیں ہیں جو ویسے بھی جماعتوں کی زندگی کے لئے سخت خطرناک ہوتی ہیں، مگر اسلامی جماعت کے مزاج سے تو ان چیزوں کو کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اسی طرح غیبت اور تنابز بالالقاب اور بدظنی بھی جماعتی زندگی کے لئے سخت مہلک بیماریاں ہیں جن سے بچنے کی ہم سب کو انتہائی کوشش کرنی چاہئے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ باہمی مشاورت جماعتی زندگی کی جان ہے۔ اس کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے جس شخص کے سپرد کسی جماعتی کام کی ذمہ واری ہو اُس کے لئے لازم ہے کہ اپنے کاموں میں دوسرے فقار سے مشورہ لے، اور جس سے مشورہ لیا جائے اُس کا فرض ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ اپنی حقیقی رائے کا صاف صاف اظہار کرے۔ جو شخص اجتماعی مشاورت میں اپنی صواب دید کے مطابق رائے دینے سے پرہیز کرتا ہے وہ جماعت پر ظلم کرتا ہے اور جو کسی مصلحت سے اپنی صواب دید کے خلاف رائے دیتا ہے وہ جماعت کے ساتھ غدر کرتا ہے، اور جو مشاورت کے موقع پر اپنی رائے

چھپاتا ہے اور بعد میں جب اُس کے منشا کے خلاف کوئی بات طے ہو جاتی ہے تو جماعت میں بددلی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے وہ بدترین خیانت کا مجرم ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ جماعتی مشورے میں کسی شخص کو اپنی رائے پر اتنا مصر نہ ہونا چاہیے کہ یا تو اُس کی بات مانی جائے ورنہ وہ جماعت سے تعاون نہ کرے گا یا اجماع کے خلاف عمل کریگا۔ بعض نادان لوگ بربنائے جہالت اس کو حق پرستی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ صریح اسلامی احکام اور صحابۂ کرامؓ کے متفقہ تعامل کے خلاف ہے۔ خواہ کوئی مسئلہ کتاب و سنت کی تعبیر اور نصوص سے کسی حکم کے استنباط سے تعلق رکھتا ہو یا دنیوی تدابیر سے متعلق ہو، دونوں صورتوں میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب تک مسئلہ زیرِ بحث رہتا، اُس میں ہر شخص اپنے علم اور اپنی صوابدید کے مطابق پوری صفائی سے اظہارِ خیال کرتا اور اپنی تائید میں دلائل پیش کرتا تھا، مگر جب کسی شخص کی رائے کے خلاف فیصلہ ہو جاتا تو وہ یا تو اپنی رائے واپس لے لیتا تھا، یا اپنی رائے کو درست سمجھنے کے باوجود فراخ دلی کے ساتھ جماعت کا ساتھ دیتا تھا۔ جماعتی زندگی کے لئے یہ طریقہ ناگزیر ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں ایک ایک شخص اپنی رائے پر اس قدر مُصر ہو کہ جماعتی فیصلوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے، وہاں آخر کار پورا نظامِ جماعت درہم برہم ہو کر رہے گا۔

آخری چیز جو جماعتی زندگی کے لئے اہم ترین ہے وہ یہ ہے کہ اسلام بغیر جماعت کے نہیں ہے، اور جماعت بغیر امارت کے نہیں ہے۔ اس قاعدۂ کلیہ کے مطابق آپ کے لئے ضروری ہے کہ جماعت بننے کے ساتھ ہی آپ اپنے لئے ایک امیر منتخب کر لیں۔ امیر کے انتخاب میں آپ کو جو امور ملحوظ رکھنے چاہئیں وہ یہ ہیں کہ کوئی شخص جو امارت کا امیدوار ہو اُسے ہرگز منتخب نہ کیا جائے، کیونکہ جس شخص میں اس کارِ عظیم کی ذمہ داری کا احساس ہوگا وہ کبھی اس بار کو اٹھانے کی خود خواہش نہ کرے گا، اور جو اس کی خواہش کرے گا وہ دراصل نفوذ و اقتدار کا خواہشمند ہوگا نہ کہ ذمہ داری سنبھالنے کا۔ ایسے کی اللہ کی طرف سے اُس کی نصرت و تائید کبھی نہ ہوگی۔ انتخاب کے سلسلہ میں لوگ ایک دوسرے سے نیک نیتی کے ساتھ تبادلۂ خیال کر سکتے

ہیں اگر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف بخوبی اور سعی نہ ہونی چاہیئے شخصی حمایت و موافقت کے جذبات کو دل سے نکال کر بے لاگ طریقہ سے دیکھیئے کہ آپ کی جماعت میں کونسا ایسا شخص ہے جس کے تقویٰ، علم کتاب و سنت، ذہنی بصیرت، تدبر اور راہ خدا میں ثبات و استقامت پر آپ سب سے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں۔ پھر جو بھی ایسا نظر آئے، اللہ پر توکل کر کے اُسے منتخب کر لیجئے۔ اور جب اُسے منتخب کر لیں تو اُس کی خیر خواہی اُس کے ساتھ مخلصانہ تعاون، معروف میں اُس کی اطاعت، اور منکر میں اُس کی اصلاح کی کوشش آپ کا فرض ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اسلامی جماعت میں امیر کی وہ حیثیت نہیں ہے جو مغربی جمہوریتوں میں صدر کی ہوتی ہے۔ مغربی جمہوریتوں میں جو شخص صدر منتخب کیا جاتا ہے اُس میں تمام صفات تلاش کی جاتی ہیں مگر کوئی صفت اگر نہیں تلاش کی جاتی تو وہ دیانت اور خوف خدا کی صفت ہے۔ بلکہ وہاں کا طریق انتخاب ہی ایسا ہے کہ جو شخص اُن میں سب سے زیادہ عیار اور سب سے بڑھ کر جوڑ توڑ کے فن میں ماہر اور جائز و ناجائز ہر قسم کی تدابیر سے کام لینے میں طاق ہوتا ہے وہی برسر اقتدار آتا ہے۔ اس لئے فطری بات ہے کہ وہ لوگ خود اپنے منتخب کردہ صدر پر اعتماد نہیں کر سکتے وہ ہمیشہ اس کی بے ایمانی سے غیر مامون رہتے ہیں، اور اپنے دستور میں طرح طرح کی پابندیاں اور روکاوٹیں عائد کر دیتے ہیں تاکہ وہ حد سے زیادہ اقتدار حاصل کر کے مستبد فرمانروا نہ بن جائے۔ مگر اسلامی جماعت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے صاحب امر کے انتخاب میں تقویٰ اور دیانت ہی کو تلاش کرتی ہے، اور اس بنا پر وہ اپنے معاملات پورے اعتماد کے ساتھ اُس کے سپرد کرتی ہے۔ لہذا مغربی طرز کی جمہوری جماعتوں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے دستور میں اپنے امیر پر وہ پابندیاں عائد کرنے کی کوشش نہ کیجئے جو عموماً وہاں صدر پر عائد کی جاتی ہیں۔ اگر آپ کسی کو خدا ترس اور متدین پا کر اُسے امیر بناتے ہیں تو اُس پر اعتماد کیجئے۔ اور اگر آپ کے نزدیک کسی کی خدا ترسی و دیانت اس قدر مشتبہ ہو کہ آپ اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تو اس کو سرے سے منتخب ہی نہ کیجئے۔

اس تقریر کے بعد انتخاب امیر کے مسئلہ پر مذاکرہ شروع ہوا۔ دوران مذاکرہ میں تین مختلف نظریے پیش کئے گئے جن پر دوپہر تک بحث ہوتی رہی اور کسی متفقہ فیصلے پر ختم نہ ہو سکی۔

ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ سردست عارضی طور پر کسی معین مدت کے لئے امیر کا انتخاب کیا جائے۔ کیونکہ اوّل تو ابھی ہماری جماعت میں اس قدر کم آدمی ہیں کہ انتخاب کی کچھ زیادہ گنجائش ہی نہیں ہے، اگر اس وقت ہم اپنی قلیل جماعت میں سے کسی اہل تر کا مستقل انتخاب کر لیں گے تو بعد میں جب جماعت بڑھے گی اور اہل ترین آدمی آئیں گے اُس وقت مشکل پیش آئے گی، دوسرے یہ مٹھی بھر جماعت اگر اس وقت اپنا مستقل امیر منتخب کر لے تو باہر جو بہت سے لوگ ہمارے نظریہ اور مقصد سے متفق ہیں اُن کو جماعت کے اندر آنے میں اس بنا پر تامل ہوگا کہ اس جماعت میں داخل ہونے کے ساتھ انہیں خود بخود اُس امیر کو بھی تسلیم کر لینا پڑے گا جس کے انتخاب میں اُن کی رائے کو دخل نہ تھا۔ اس طرح ہمارا انتخاب امیر آگے چل کر توسیع جماعت کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ بن جائے گا اور اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک بڑی جماعت بننے کے بجائے الگ الگ جماعتیں بننے لگیں گی اور بہت سی امارتوں کے جھنڈے بلند ہوں گے۔

دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ اس وقت سرے سے امیر منتخب ہی نہ کیا جائے بلکہ چند آدمیوں کی ایک مجلس کو انتظام اور رہنمائی کے اختیارات دے دیئے جائیں اور اس مجلس کے لئے ایک صدر منتخب کر لیا جائے۔ اس گروہ کے شبہات بھی مذکورۂ بالا نوعیت کے تھے، اور مزید براں اُن کا کہنا یہ بھی تھا کہ ابھی کوئی مرد کامل ایسا نظر نہیں آتا جو انبیاء کی جانشینی کے قابل ہو۔

تیسرے گروہ کا خیال یہ تھا کہ جماعت بلا امیر تو بالکل ہی بے اصل چیز ہے، رہا مدت معینہ کے لئے انتخاب، تو وہ ایک غیر اسلامی طریقہ ہے جس کا کوئی نشان ہم کو کتاب و سنت میں نہیں ملتا۔ علاوہ بریں یہ بات حکمت کے بھی خلاف ہے کہ ایک طرف تو ہم وہ انتہائی انقلابی نظریے لے کر اٹھ رہے ہیں جو

تمام دنیا کی شیطانی قوتوں کے لئے اعلان جنگ کا ہم معنی ہے اور دوسری طرف ہم خود ہی اپنی جماعت کے نظام کو اتنا سست اور ڈھیلا رکھیں کہ وہ کسی بڑی جدوجہد میں ثابت و قائم نہ رہ سکتا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ امارت کے بغیر، یا عارضی امارت کی بنیاد پر جو نظام جماعت بنایا جائے گا وہ ہرگز پختہ نہ ہوگا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ امیر کا انتخاب اسی وقت کیا جائے اور بلا تعین مدت کیا جائے۔

کئی گھنٹہ کی بحث کے بعد بھی جب اس مسئلہ میں اتف

(۳) گروہ سوم کی اس رائے سے اتفاق کیا گیا کہ علم کتاب و سنت اور حکمت عملی دونوں کا اقتضا یہی ہے کہ جماعت بلا امیر نہ رہے اور امیر کا انتخاب کسی مدت کے ساتھ مقید نہ ہو۔

(۴) گروہ اول کے تمام اعتراضات کو ان دو فقروں سے رفع کر دیا گیا۔

"امیر کی خدا ترسی و احساس ذمہ داری سے یہ توقع کی جائے گی کہ اپنے سے زیادہ اہل آدمی کے آجانے پر وہ خود اس کے لئے جگہ خالی کر دے گا۔ نیز ایسی صورت میں جبکہ جماعت اپنے نصب العین کے مفاد کے لئے ضرورت محسوس کرے، وہ امیر کو معزول کرنے کی بھی مجاز ہو گی۔"

(۵) گروہ دوم کے اعتراض کو اس فقرہ سے رفع کیا گیا:۔

"جماعت کی نظر میں انتخاب کے وقت جو شخص بھی مذکورۂ بالا اوصاف (تقویٰ، علم دین میں بصیرت اصابت رائے، اور عزم و حزم) کے لحاظ سے اہل تر ہو گا اس کو وہ اس منصب کے لئے منتخب کرے گی"

۱۴ دسمبر کی شام کو جب دوبارہ اجتماع عام ہوا تو محمد منظور صاحب نعمانی نے مجلس منتخبہ کی جانب سے اس تجویز کو پڑھ کر سنایا اور مختصراً اس کی تشریح کی جماعت نے بالاتفاق اُسے قبول کر لیا اور طے کیا کہ ۔۔۔

علم رکھنے والا تھا، نہ سب سے زیادہ متقی، نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل تھی۔ بہرحال جب آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کارِ عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا تو میں اب اللہ سے دعا کرتا ہوں اور آپ لوگ بھی دعا کریں کہ مجھے اس بار کو سنبھالنے کی قوت عطا فرمائے اور آپ کے اس اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے۔ میں اپنی حد وسع تک انتہائی کوشش کروں گا کہ اس کام کو پوری خلاترسی اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ چلاؤں۔ میں قصداً اپنے فرض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ میں اپنے علم کی حد تک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے نقشِ قدم کی پیروی میں کوئی کسر اٹھا رکھوں گا۔ تاہم اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو اور آپ میں سے کوئی محسوس کرے کہ میں راہ راست سے ہٹ گیا ہوں تو مجھ پر یہ بدگمانی نہ کرے کہ میں عمداً ایسا کر رہا ہوں، بلکہ حسن ظن سے کام لے اور نصیحت سے مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔ آپ کا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں اپنے آرام و آسائش اور اپنے ذاتی فائدوں پر جماعت کے مفاد اور اس کے کام کی ذمہ داریوں کو ترجیح دوں، جماعت کے نظم کی حفاظت کروں۔ ارکانِ جماعت کے درمیان عدل اور دیانت کے ساتھ حکم کروں۔ جماعت کی طرف سے جو انتظیم میرے سپرد ہوں۔ ان کی حفاظت کروں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دل و دماغ اور جسم کی تمام طاقتوں کو اس مقصد کی خدمت میں صرف کر دوں، جس کے لئے آپ کی جماعت اٹھی ہے۔ اور میرا آپ پر حق ہے کہ جب تک میں راہ راست پر چلوں آپ میرا ساتھ دیں، میرے حکم کی اطاعت کریں، نیک مشوروں سے اور امکانی امداد و اعانت سے میری تائید کریں اور جماعت کے نظم کو بگاڑنے والے طریقوں سے پرہیز کریں۔ مجھے اس تحریک کی عظمت اور خود اپنے نقائص کا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ وہ تحریک ہے جس کی قیادت اولوالعزم پیغمبروں نے کی ہے، اور زمانہ نبوت گذر جانے کے بعد وہ غیر معمولی انسان اس کے لئے کر اٹھتے رہے ہیں جو نسلِ انسانی کے گل سرسبد تھے۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں اس عظیم الشان تحریک کی قیادت کا اہل ہوں، بلکہ میں تو اس کو ایک بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس کارِ عظیم کے لئے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہ ملا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے فرائض امارت کی انجام دہی کے ساتھ میں برابر اس تلاش میں رہوں گا کہ کوئی اہل تر

آدمی اس کام کا بار اٹھانے کے لئے مل جائے۔ اور جب میں ایسے کسی آدمی کو پاؤں گا تو خود سب سے پہلے اُس کے ہاتھ پر بیعت کر دوں گا۔ نیز میں ہمیشہ ہر اجتماع عام کے موقع پر جماعت سے بھی درخواست کرتا رہوں گا کہ اگر اب اُس نے کوئی مجھ سے بہتر آدمی پا لیا ہے تو وہ اُسے اپنا امیر منتخب کرے، اور میں اس منصب سے بخوشی دست بردار ہو جاؤں گا۔ بہرحال میں انشاء اللہ اپنی ذات کو کبھی خدا کے راستہ میں سدِ راہ نہ بننے دوں گا اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں گا کہ ایک ناقص آدمی اس جماعت کی رہنمائی کر رہا ہے اس لئے ہم اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ نہیں، میں کہتا ہوں کہ کامل آئے اور یہ مقام جو آپ نے میرے سپرد کیا ہے ہر وقت اس کے لئے خالی ہو سکتا ہے البتہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اگر کوئی دوسرا اس کام کو چلانے کے لئے نہ اُٹھے تو میں بھی نہ اٹھوں۔ میرے لئے تو یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے۔ میرا مرنا اور جینا اس کے لئے ہے۔ کوئی اس راہ پر چلنے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو بہرحال مجھے تو اسی راہ پر چلنا اور اسی راہ میں جان دینا ہے۔ کوئی آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھوں گا۔ کوئی ساتھ نہ دے گا تو میں اکیلا چلوں گا۔ ساری دنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تن تنہا اُس سے لڑنے میں بھی باک نہیں ہے۔ آخر میں ایک بات کی اور توضیح کر دینا چاہتا ہوں۔ فقہ اور کلام کے مسائل میں میرا ایک خاص مسلک ہے جس کو میں نے اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر اختیار کیا ہے، اور پچھلے آٹھ سال کے دوران میں جو اصحاب "ترجمان القرآن" کا مطالعہ کرتے رہے ہیں وہ اُس کو جانتے ہیں۔ اب کہ میری حیثیت اس جماعت کے امیر کی ہو گئی ہے، میرے لئے یہ بات صاف کر دینی ضروری ہے کہ فقہ و کلام کے مسائل میں جو کچھ میں نے پہلے لکھا ہے اور جو کچھ آئندہ لکھوں گا یا کہوں گا اُس کی حیثیت امیر جماعتِ اسلامی کے فیصلہ کی نہ ہو گی بلکہ میری ذاتی رائے کی ہو گی۔ میں نہ تو یہ چاہتا ہوں کہ ان مسائل میں اپنی رائے کو جماعت کے دوسرے اہلِ علم و تحقیق پر مسلط کروں، اور نہ اسی کو پسند کرتا ہوں کہ جماعت کی طرف سے مجھ پر ایسی کوئی پابندی عائد ہو کہ مجھ سے علمی تحقیق اور اظہارِ رائے کی آزادی سلب ہو جائے۔ ارکانِ جماعت کو میں خداوند برتر کا واسطہ دے کر ہدایت کرتا ہوں کہ کوئی شخص فقہی و کلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے حجت کے طور پر پیش نہ کرے۔ اسی طرح

میرے ذاتی عمل کو بھی جسے میں نے اپنی تحقیق کی بنا پر جائز سمجھ کر اختیار کیا ہے، نہ تو دوسرے لوگ حجت بنائیں اور نہ بلا تحقیق محض میرا عمل ہونے کی حیثیت سے اس کا اتباع کریں۔ ان معاملات میں ہر شخص کے لئے آزادی ہے۔ جو لوگ علم رکھتے ہوں وہ اپنی تحقیق پر، اور جو علم نہ رکھتے ہوں وہ جس کے علم پر بھی اعتماد رکھتے ہوں اُس کی تحقیق پر عمل کریں۔ نیز ان معاملات میں لوگ مجھ سے اختلاف رائے رکھنے اور اپنی رائے کا اظہار کرنے میں بھی آزاد ہیں۔ ہم سب جزئیات و فروع میں اختلاف رائے رکھتے ہوئے اور ایک دوسرے کے بالمقابل بحث و استدلال کرتے ہوئے بھی ایک جماعت بن کر رہ سکتے ہیں جس طرح صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رہتے تھے۔

۴ شعبان: گذشتہ شام کو امیر جماعت نے اصحاب شوریٰ کا انتخاب کر لیا تھا۔ آج صبح آٹھ بجے شوریٰ کا پہلا اجلاس ہوا اور تحریک کے مستقبل اور جماعت کے لائحہ عمل پر سوچ بچار کیا گیا۔ کافی غور و خوض اور بحث و مذاکرہ کے بعد جو کچھ طے ہوا وہ حسب ذیل ہے:۔

تقسیم کار

فی الحال جماعت کے کام کو حسب ذیل شعبوں میں تقسیم کیا گیا:۔

(۱) شعبۂ علمی و تعلیمی | اس شعبہ کا کام یہ ہوگا کہ:۔

اسلام کے نظام فکر اور نظام حیات کا اُس کے مختلف فلسفیانہ اور عملی اور تاریخی پہلوؤں میں گہرا تفصیلی مطالعہ کرے، دنیا کے دوسرے نظامات فکر و عمل پر بھی وسیع تنقیدی و تحقیقی نظر ڈالے، اور اپنے نتائج تحقیق کو ایک ایسے زبردست لٹریچر کی شکل میں پیش کرے جو نہ صرف اسلامی اصول پر ذہنی و فکری انقلاب برپا کرنے والا ہو، بلکہ نظام اسلامی کے بالفعل قائم ہونے کے لئے بھی زمین تیار کر سکے۔

ایک ایسا نظریۂ تعلیم اور نظام تعلیم مرتب کرے جو اسلام کے مزاج سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہو اور دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے بنیاد کا کام دے سکے۔ اس سلسلہ میں دنیا کے رائج الوقت تعلیمی نظریات اور نظامات کا بھی تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کرنا ہوگا۔

اپنے نظریۂ تعلیمی کے مطابق نصاب اور معلمین تیار کرے اور بالآخر ایک درس گاہ قائم کرکے آئندہ نسل کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا کام شروع کردے۔

ایک ایسی تربیت گاہ قائم کرے جو دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے بہترین کارکن تیار کرے تین سال قبل ادارۂ دارالاسلام کے نام سے جو ادارہ قائم کیا گیا تھا وہ جماعت اسلامی کے اس شعبہ میں ضم کردیا گیا۔ سردست یہ شعبہ مرکز میں امیر جماعت کی براہ راست نگرانی میں رہے گا۔ بعد میں اگر ممکن ہوا تو اس کی شاخیں باہر بھی مختلف ایسے مقامات میں قائم کردی جائیں گی جہاں ایسے ایک شعبہ کی رہنمائی کرنے کے لئے مناسب اشخاص موجود ہوں گے۔

جماعت کے تمام کارکنوں، اور خصوصاً مقامی جماعتوں کے امراء کا فرض ہوگا کہ جہاں جہاں اس شعبہ میں کام کرنے کی اہلیت رکھنے والے لوگ ملیں ان کے متعلق ضروری معلومات امیر جماعت کو بہم پہنچائیں۔ نیز مقامی جماعتوں کو اس طرف بھی توجہ کرنی ہوگی کہ اپنے حلقہ سے جس شخص یا اشخاص کو وہ شعبۂ علمی کے لئے مرکز میں بھیجیں اُن کی ضروریات زندگی کی کفالت کا انتظام مقامی طور پر کرنے کی کوشش کریں۔ علاوہ بریں مقامی جماعتیں اس شعبہ کے کام میں اس طرح بھی مدد کرسکتی ہیں کہ اس کے کتب خانہ کے لئے ہر علم و فن کی معیاری کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

(۲) شعبۂ نشر و اشاعت | شعبۂ علمی و تعلیمی سے جو لٹریچر تیار کیا جائے اس کو پھیلانے کا کام اس شعبہ کے سپرد ہوگا۔ اس کا فرض ہوگا کہ جماعت کے لٹریچر کو جہاں تک ممکن ہو خدا کے بندوں تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ اس شعبہ کے لئے ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے جو نشر و اشاعت کے کام میں مہارت رکھتے ہوں۔ نیز اس شعبہ کو ایسے آدمیوں کی بھی ضرورت ہے جو سفر کرکے مختلف مقامات پر جائیں اور مختلف حلقوں میں زبانی تبلیغ بھی کریں اور اپنا لٹریچر بھی پھیلائیں۔

سردست یہ شعبہ بھی مرکز میں امیر جماعت کے زیر نگرانی رہے گا۔ بعد میں کوشش کی جائے گی کہ

باہر بھی مختلف مقامات پر ذمہ دار اصحاب کی نگرانی میں نشر و اشاعت کے چھوٹے چھوٹے مرکز قائم کر دیئے جائیں جہاں سے اخبار یا رسالے، یا پمفلٹوں اور کتابوں کی شکل میں جماعت کی نمائندگی کرنے والا لٹریچر شائع ہو سکے۔

ہر جگہ جماعت اسلامی کے ارکان کے لئے اور مقامی جماعتوں کے لئے اس شعبہ کے ساتھ تعاون کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ طباعت کے کام، یا نشر و اشاعت کے طریقوں میں مہارت رکھتے ہوں، یا اچھے سفیر مبلغ بن سکتے ہوں، یا تجارتی پہلو میں اس شعبہ کو کامیاب بنانے کی قابلیت رکھتے ہوں وہ اپنی خدمات پیش کریں اور مقامی امراء اس قسم کی صلاحیتیں رکھنے والے اشخاص کی اطلاع ناظم شعبۂ نشر و اشاعت کو دیں۔ دوسرے یہ کہ ہر جگہ مقامی جماعت ایک ریڈنگ روم اور بک ڈپو قائم کرے جس میں ادارہ کی مطبوعات جمع کی جائیں، جو لوگ پڑھنا چاہیں وہ ریڈنگ روم میں ان کا مطالعہ کریں اور جو خریدنا چاہیں وہ بک ڈپو سے کتابیں خرید لیں۔

۳۔ شعبۂ تنظیم جماعت | اس شعبہ کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔ (۱) رکنوں کو ہدایات دینا۔ (۲) جہاں مقامی جماعتیں بن گئی ہوں وہاں کے کام کی نگرانی کرنا، ان سے رپورٹیں طلب کرنا اور ان کو مشورے دینا۔ (۳) جہاں انفرادی شکل میں جماعت کے ارکان موجود ہوں وہاں مقامی جماعتیں بنانے کی کوشش کرنا۔ (۴) جو اشخاص یا ادارے یا جماعتیں عقیدہ اور نصب العین میں اس جماعت سے متفق ہوں ان سے ربط قائم کرنے کی سعی کرنا۔ (۵) تحریک کی رفتار کا جائزہ لیتے رہنا اور اس کو آگے بڑھانے کی تدابیر عمل میں لانا۔

اس شعبہ کا صدر دفتر مرکز میں امیر جماعت کے ماتحت ہوگا۔ خارج میں اس کی چار شاخیں حسب ذیل حلقوں میں قائم کی گئی ہیں:۔

(۱) میرٹھ، بریلی، آگرہ اور لکھنؤ ڈویژن کے لئے صدر مقام بریلی ہے جہاں محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان نائب میر کی حیثیت سے کام کریں گے۔

(۲) الہ آباد، بنارس، گورکھپور، فیض آباد ڈویژن اور صوبۂ بہار کے لئے صدر مقام سرائے میر

ضلع اعظم گڈھ ہے جہاں امین احسن صاحب اصلاحی نائب امیر ہوں گے۔

(۳) صوبۂ مدراس کے لئے صدر مقام عمر آباد، ضلع شمالی ارکاٹ ہے جہاں سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری استاذ تفسیر جامعۂ دارالسلام نائب امیر ہوں گے۔

(۴) انبالہ و جالندھر ڈویژن کے لئے صدر مقام کپورتھلہ ہے جہاں سید محمد جعفر صاحب پھلواروی خطیب جامع کپورتھلہ نائب امیر ہوں گے۔

مذکورۂ بالا حلقوں میں جماعت کے جو ارکان انفرادی طور پر رہتے ہوں، یا جو مقامی جماعتیں بنی ہوئی ہوں وہ جملہ معاملات میں اپنے اپنے حلقہ کے نائب امیر کی طرف رجوع کریں۔ اور ان حلقوں کے ماسوا دوسرے مقامات پر جو اشخاص یا جماعتیں ہوں وہ سردست مرکزی دفتر سے تعلق رکھیں۔ بعد میں مزید حلقے قائم کرنے اور نائبین مقرر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) شعبۂ مالیات | مرکز میں ادارۂ دارالاسلام کے حسابات ۳۱ اگست ۱۹۴۱ء تک ختم کر کے جماعت اسلامی کی طرف منتقل کر دیئے گئے اور جماعت کا مرکزی بیت المال قائم کر دیا گیا جو براہ راست امیر جماعت کے ماتحت رہے گا۔ نیز ہر جگہ کی مقامی جماعتوں کے لئے طے کیا گیا کہ ہر جماعت اپنا مقامی بیت المال قائم کرے، مقامی ضروریات کو مقامی آمدنی سے پورا کرے، اپنے سہ ماہی حسابات اپنے حلقہ کے نائب امیر کو، یا کوئی حلقہ نہ ہونے کی صورت میں امیر جماعت کو بھیجتی رہے، اور جب مرکزی بیت المال کو مدد کی ضرورت ہو تو امیر کی طرف سے حکم آنے پر اپنی زیر تحویل رقوم بھیج دے۔

سردست آمدنی کی سب سے بڑی مد ادارۂ دارالاسلام کی مطبوعات ہیں اور ان کی کثرت اشاعت پر ہی جماعت کے کام کی ترقی موقوف ہے۔ اس مد کی تمام آمدنی مرکزی بیت المال میں آنی چاہیے۔ دوسری مد زکوٰۃ ہے۔ تمام ارکان جماعت جو صاحب نصاب ہوں اپنی زکوٰۃ اپنی مقامی جماعت کے بیت المال میں داخل کریں یا مقامی جماعت موجود نہ ہو تو مرکز میں بھیجیں۔ تیسری مد رقوم اعانت ہیں۔ جماعت کے

..... ذی استطاعت ارکان کا فرض ہے کہ زیادہ سے زیادہ جس قدر مالی ایثار کر سکتے ہوں کریں اور جماعت کو مالی حیثیت سے مضبوط بنائیں۔ رہے جماعت سے باہر کے لوگ تو ان سے ہرگز کوئی مدد نہ طلب کی جائے، البتہ اگر وہ بخوشی اور بلا شرط کوئی مدد دینا چاہیں تو قبول کر لی جائے لیکن کوئی بڑی سے بڑی مالی اعانت بھی اس صورت میں قبول نہ کی جائے جبکہ یہ اندیشہ ہو کہ اس کے معاوضہ میں جماعت کی پالیسی پر اثر ڈالنے کی کوشش کی جائیگی۔

[یہاں مناسب معلوم ہتا ہے کہ جماعت کی موجودہ مالی پوزیشن بھی ظاہر کر دی جائے ۱۹۳۸ء میں جب ادارۂ دار الاسلام قائم کیا گیا تھا، مودودی صاحب موجودہ امیر جماعت نے اپنی تمام کتابیں (باستثنار الجہاد فی الاسلام و رسالہ دینیات (اردو انگریزی) ادارہ کے لئے وقف کر دی تھیں۔ ۷ جنوری ۱۹۳۹ء کو ۱۳۲ روپے کے سرمایہ سے کام شروع کیا گیا۔ اُس وقت سے ۳۱ اگست ۱۹۴۱ء تک آمد و خرچ کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

آمدنی		خرچ	
از مد فروخت کتب	۲۹۴۸-۱۵-۶	طباعت کتب	۳۲۰۰-۳-۶
از مد زکوٰۃ	۱۳۰-۰-۰	خرچ ڈاک	۵۹۰-۴-۹
از مد اعانت اہل خیر	۶۳۸-۱۲-۰	تنخواہ ملازمین	۴۸۰-۰-۰
میزان	۴۷۱۷-۱۱-۶	سفر خرچ	۱۳۵-۱۴-۳
ابتدائی سرمایہ	۱۳۲-۰-۰	مصارف دار الاقامہ	۱۲۵-۱-۰
جملہ	۴۸۴۹-۱۱-۶	صرف از مد زکوٰۃ	۶۳-۰-۰
جملہ آمدنی	۴۸۴۹-۱۱-۶	متفرقات	۳۶-۱۱-۰
جملہ خرچ	۴۷۷۴-۱۲-۶	اسٹیشنری	۲۷-۳-۶
باقی	۷۴-۱۴-۰	مصارف اجتماع اول	۱۱۷-۸-۶
			۴۷۷۴-۱۲-۶

اس کے علاوہ ادارہ کی جو رقوم تاریخ مذکورہ تک مختلف تاجروں اور ایجنٹوں کے ذمہ واجب الادا تھیں ان کی مقدار ۳۵۶ روپیہ دو آنہ تھی، اور جو ذخیرۂ کتب ادارہ کے دفتر میں ۳۱ اگست ۱۹۴۱ء کو موجود تھا اس کی قیمت کا تخمینہ ۲۰۱۲ روپیہ ہے]

(۵) شعبہ دعوت و تبلیغ | یہ شعبہ اس جماعت کا سب سے اہم شعبہ ہے اور دراصل جماعت کی کامیابی کا انحصار ہی اس شعبہ کی کارگزاری پر ہے۔ ہر شخص جو جماعت اسلامی کا رکن ہو، لازمی طور پر اس شعبہ کا رکن ہوگا۔ اُس کو دائماً ایک مبلغ کی زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اُس کے لئے لازم ہوگا کہ جہاں جس حلقہ میں بھی اُس کی پہنچ ہو سکتی ہو، جماعت کے عقیدہ کو پھیلائے، اس کے نصب العین کی طرف دعوت دے، اور جماعت کے نظام کی تشریح کرے۔ مگر تبلیغی مصالح کے لحاظ سے یہ ضروری معلوم ہوا کہ کام کرنے کے لئے آٹھ مختلف حلقے معین کر دیئے جائیں اور جماعت کا ہر رکن اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے صرف انہی حلقوں میں تبلیغ کرے جن سے وہ زیادہ مناسبت رکھتا ہو۔ یہ حلقے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کالجوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا حلقہ
(۲) علماء اور مدارس عربیہ کا حلقہ۔
(۳) صوفیہ اور مشائخ طریقت کا حلقہ
(۴) سیاسی جماعتوں کا حلقہ
(۵) شہری عوام کا حلقہ
(۶) دیہاتی عوام کا حلقہ
(۷) عورتوں کا حلقہ
(۸) غیر مسلموں کا حلقہ

ہر رکن کو اپنے متعلق ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا چاہئے کہ وہ ان میں سے کس حلقہ یا کن حلقوں میں تبلیغ کا اہل ہے جن حلقوں میں کام کرنے کی اہلیت وہ اپنے اندر نہ محسوس کرتا ہو، یا تجربہ سے اس کو معلوم ہو جائے کہ وہ فلاں حلقوں میں ناکام رہے گا اُن میں تبلیغ کرنے سے اس کو پرہیز کرنا چاہئے تاکہ وہ لوگوں کو قریب لانے کے بجائے دور پھینک دینے کا موجب نہ بن جائے۔

تبلیغ کے سلسلہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان میں رہنمائی کے لئے مقامی امراء یا نائبین امیر، یا خود

امیر جماعت سے رجوع کیا جائے۔

ہدایات

مذکورۂ بالا لائحۂ عمل طے ہونے کے بعد ۴ شعبان ہی کو پھر اجتماع عام منعقد ہوا جس میں امیر جماعت نے حاضرین کو اس لائحۂ عمل کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور پھر کام کرنے کے لئے حسب ذیل ہدایات دیں:-

(۱) ہر وہ بستی جہاں دو آدمی ایسے موجود ہوں جو جماعت اسلامی میں داخل ہو چکے ہوں، وہاں لازم ہے کہ مقامی جماعت بنالی جائے اور دونوں میں سے ایک صالح تر آدمی مقامی امیر منتخب کیا جائے، اور امیر جماعت کو اطلاع دے کر اس کے انتخاب کی منظوری حاصل کی جائے۔ علیٰ ہذا القیاس جہاں دو سے زیادہ آدمی شریک جماعت ہوں وہاں بھی بلا کسی تفاضیت کے کسی ایسے آدمی کو مقامی امارت کے لئے نامزد کیا جائے جو زیادہ نیک سیرت، متبع شریعت، معاملہ فہم اور تحریک اسلامی کے مزاج کو سمجھنے والا ہو اور جس کو بستی کے لوگ بالعموم عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔ مگر مقامی لوگوں کا کسی کو منتخب کر لینا مقامی امارت کے لئے کافی نہ ہوگا تاوقتیکہ امیر جماعت یا آپ کے حلقہ کا نائب امیر اس کے تقرر کی اجازت نہ دے۔

(۲) امیر جماعت اگر مصالح اجتماعی کے لحاظ سے کسی کو مقامی امارت یا کسی دوسرے منصب پر مقرر نہ کرے یا کسی کو معزول کر کے دوسرے کو مقرر کرے تو اس پر برا نہ ماننا چاہیے۔ اس معاملہ میں اصل چیز نصب العین کی خدمت ہے نہ کہ شخصی اعزاز۔ جس شخص کو آپ نے اپنی جماعت کا امیر منتخب کیا ہے اس پر اعتماد کیجئے کہ وہ جماعت کی عظیم تر مصلحتوں کے لحاظ ہی سے عزل و نصب کرے گا۔

(۳) جماعت میں جب کوئی نیا شخص داخل ہو تو اسے پورا احساس ذمہ داری دلا کر از سر نو کلمۂ شہادت ادا کرایا جائے اور پھر اس سے دریافت کیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو جماعت کے کس طبقہ میں شامل ہونے کے لئے پیش کرتا ہے۔ اس معاملہ میں کسی بڑے سے بڑے اور مشہور شخص کے لئے بھی استثنا نہیں ہے۔ بڑے سے بڑے عالم اور شیخ طریقت کو بھی داخل جماعت ہوتے وقت تجدید ایمان کرنی ہوگی۔ اس تجدید ایمان کے موقع پر ہر شخص کو متنبہ کر دیا جائے کہ یہ راصل

زندگی کے ایک نئے باب کا افتتاح ہے۔ جو کچھ تم اب تک تھے وہ اب نہیں رہے۔ آج سے تم ایک پابند نظام مومن کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کر رہے ہو، آج سے تمہاری زندگی ایک بامقصد زندگی بن رہی ہے اور تم خدا اور مومنوں کو گواہ بنا رہے ہو کہ تمہاری تمام سعی و جہد اس مقصد کیلئے اس نظام کی پابندی میں صرف ہو گی۔

(۴) جو شخص جماعت میں داخل ہو اس کو تحریک اسلامی کے لٹریچر کا بیشتر حصہ پڑھوا دیا جائے، تاکہ وہ اس تحریک کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو جائے اور تحریک کے ارکان میں ذہنی و عملی ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اس معاملہ میں بھی کسی کے متعلق یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ وہ تو پہلے ہی سب کچھ سمجھتا ہوگا۔ اگر اس مفروضہ پر ایسے لوگوں کی بڑی تعداد جماعت میں داخل کر لی گئی جو اس تحریک کے لٹریچر پر نظر نہ رکھتے ہوں تو اندیشہ ہے کہ جماعت کے ارکان ایک دوسرے سے متضاد باتیں اور متضاد حرکات کریں گے۔ جو لوگ تعلیم یافتہ نہ ہوں ان کو زبانی طور پر ضروری مطالب سمجھا دیئے جائیں اور تحریک کے مزاج کے مطابق ان کی ذہنیت تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس غرض کیلئے ہر مقامی جماعت میں کم از کم ایک دو ایسے آدمیوں کا رہنا ضروری ہے جنہوں نے خوب گہری نظر سے ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہو۔

(۵) مقامی امراء اپنے حلقہ کے ارکان جماعت کی صلاحیتوں کا فرداً فرداً جائزہ لیں اور جو شخص جس کام کا اہل ہو اس کو وہی کام سپرد کریں اور برابر دیکھتے رہیں کہ وہ اپنے کار مفوضہ کو کس طرح انجام دیتا ہے۔ اس معاملہ میں ہر رکن جماعت کو خود بھی اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا بے لاگ تخمینہ (بلا انکسار اور بلا مبالغہ) کرنا چاہیئے اور اپنے سردار کو بتا دینا چاہیئے کہ وہ کیا کام کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔

(۶) ہر جگہ جہاں مقامی جماعت موجود ہو تمام ارکان جماعت کو جمعہ کے روز خواہ صبح یا شام، یا بعد نماز جمعہ ایک جا جمع ہونا چاہیئے۔ اس اجتماع میں ہفتہ بھر کے کام کا جائزہ لیا جائے، آئندہ کام کے لئے باہمی مشورہ سے تجاویز سوچی جائیں، بیت المال کے حسابات دیکھے جائیں، اور تحریک کے لٹریچر کے متعلق کوئی نئی چیز شائع ہوئی ہو تو اس کا مطالعہ کیا جائے۔

(۷) جماعت کے ارکان کو قرآن اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیر صحابہ سے خاص شغف ہونا چاہیئے۔ ان چیزوں کو بار بار زیادہ سے زیادہ گہری نظر سے پڑھا جائے اور محض عقیدت کی پیاس بجھانے کے لئے نہیں بلکہ ہدایت و رہنمائی

حاصل کرنے کے لئے پڑھا جائے جہاں ایسا کوئی آدمی موجود ہو جو قرآن کا درس دینے کی اہلیت رکھتا ہو وہاں درس قرآن شروع کر دیا جائے۔

۸) اس تحریک کی جان دراصل تعلق باللہ ہے۔ اگر اللہ سے آپ کا تعلق کمزور ہو تو آپ حکومت الٰہیہ قائم کرنے اور کامیابی کے ساتھ چلانے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا فرض عبادات کے ماسوا نفل عبادات کا بھی التزام کیجئے۔ نفل نماز، نفل روزے، اور صدقات وہ چیزیں ہیں جو انسان میں خلوص پیدا کرتی ہیں، اور ان چیزوں کو زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ کرنا چاہئے تاکہ ریا نہ پیدا ہو۔ نماز سمجھ کر پڑھئے، اس طرح نہیں کہ ایک یاد کی ہوئی چیز کو آپ زبان سے دُھرا رہے ہیں، بلکہ اس طرح کہ آپ خود اللہ سے کچھ عرض کر رہے ہیں۔ نماز پڑھتے وقت اپنے نفس کا جائزہ لیجئے کہ جن باتوں کا اقرار آپ عالم الغیب کے سامنے کر رہے ہیں کہیں آپ کا عمل اُن کے خلاف تو نہیں ہے اور آپ کا اقرار جھوٹا تو نہیں ہے۔ اس محاسبۂ نفس میں اپنی جو کوتاہیاں آپ کو محسوس ہوں اُن پر استغفار کیجئے، اور آئندہ ان خامیوں کو رفع کرنے کی کوشش کیجئے۔ عبادات میں اس امر کا خیال رکھئے کہ جس قدر عمل کی آپ دائماً پابندی کر سکتے ہوں بس اسی کا التزام کیا جائے۔ نیز یہ کہ اُن تمام مجاہدوں اور ریاضتوں اور مشاغل اور آداب سے پرہیز کیا جائے جو احادیث صحیحہ سے ثابت نہ ہوں، اور احادیث کی صحت کے باب میں محدثین ہی سند ہو سکتے ہیں نہ کہ ہر محدث، خواہ کسی خود ساختہ کتنی ہی بڑی شخصیت کے بزرگ ہوں۔ زیادہ خطرناک بدعات وہ بری چیزیں نہیں ہیں جن کی برائی کو سب جانتے ہیں بلکہ وہ بظاہر اچھی چیزیں ہیں جن کو اچھا سمجھ کر شریعت میں اضافہ کر لیا جاتا ہے

۹) جماعت کے ارکان کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ایک بہت بڑا دعویٰ لیکر بہت بڑے کام کے لئے اٹھ رہے ہیں۔ اگر ان کی سیرتیں اُن کے دعوے کی نسبت سے اس قدر پست ہوں کہ نمایاں طور پر اُن کی پستی محسوس ہوتی ہو تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے دعوے کو مضحکہ بنا کر رکھ دیں گے۔ اسلئے ہر شخص کو جو اس جماعت میں شامل ہو اپنی دوہری ذمہ داری محسوس کرنی چاہئے۔ خدا کے سامنے تو وہ بہرحال ذمہ دار ہے، اگر خلقِ خدا کے سامنے بھی اس کی ذمہ داری بہت سخت ہے۔ جس بستی میں بھی آپ لوگ موجود ہوں وہاں کی عام آبادی سے آپ کے اخلاق بلند تو

ہونے چاہئیں، بلکہ آپکو بلندی اخلاق، پاکیزگی سیرت اور دیانت و امانت میں ضرب المثل بن جانا چاہیئے۔ آپ کی ایک معمولی لغزش نہ صرف جماعت کے دامن پر بلکہ اسلام کے دامن پر دھبہ لائیگی اور آپ بہت سے لوگوں کیلئے سبب گمراہی بن جائینگے۔

(۱۰) جماعت کے ارکان کو ایسے تمام طریقوں سے پرہیز کرنا چاہیئے جو ان کو مسلمانوں میں ایک فرقہ بنانے والے ہوں۔ اپنی نمازیں عام مسلمانوں سے الگ نہ پڑھئے، نماز میں اپنی جماعت الگ نہ بنایئے، بحثیں اور مناظرے نہ کیجئے، جہاں تحقیق کیلئے نہیں بلکہ مدافعت اور مخالفت کی بنا پر اس تحریک کو معرض بحث میں لایا جائے وہاں صبر و ضبط سے کام لیجئے، خصوصاً جہاں میری ذات پر حملے کئے جائیں وہاں تو ہرگز مدافعت نہ کیجئے، میں نہ خود اپنی مدافعت کرتا ہوں اور نہ اپنے رفیقوں کو چاہتا ہوں کہ وہ اس فضول کام میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کریں)، البتہ جہاں کوئی شخص سنجیدگی سے طالب تحقیق ہو وہاں اپنی تائید میں استدلال کیا جا سکتا ہے، مگر جب بحث میں گرمی آتی محسوس ہو تو سلسلۂ بحث بند کر دیجئے کیونکہ مناظرہ وہ بلا ہے جس سے ہزار فتنے پیدا ہوتے ہیں اور کوئی ایک فتنہ بھی فرو نہیں ہوتا۔

(۱۱) تحریک اسلامی اپنا ایک خاص مزاج رکھتی ہے اور اس کا ایک مخصوص طریق کار ہے جس کے ساتھ دوسری تحریکوں کے طریقے کسی طرح جوڑ نہیں کھاتے۔ جو لوگ اب تک مختلف قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں اور جن کی طبیعتیں انہی کے طریقوں سے مانوس رہی ہیں، انہیں اس جماعت میں آ کر اپنے آپ کو بہت کچھ بدلنا ہوگا۔ جلسے اور جلوس، جھنڈے اور نعرے، یونیفارم اور مظاہرے، ریزولیوشن اور ایڈریس، بے لگام تقریریں اور گرما گرم تحریریں، اور اس نوعیت کی تمام چیزیں ان تحریکوں کی جان ہیں مگر اس تحریک کے لئے سم قاتل ہیں۔ یہاں کا طریق کار قرآن اور سیرت محمدی اور صحابہ کی سیرتوں سے سیکھیے اور اس کی عادت ڈالیے۔ اپنی زبان یا قلم یا مظاہروں سے عوام پر سحر نہیں کرنا ہے کہ ایک ریوڑ کے ریوڑ آپکے پیچھے آ جائیں اور آپ انہیں ہانکتے پھریں۔ آپ کو ان میں حقیقت اسلامی کی معرفت پیدا کرنی ہے، عرفان حقیقت کے بعد ان میں یہ عزم پیدا کرنا ہے کہ اپنی انفرادی زندگی اور گردوپیش کی اجتماعی زندگی کو اس حقیقت کے مطابق بنائیں اور جو کچھ باطل ہو اس کو مٹانے میں جان و مال کی بازی لگا دیں۔ لوگوں کے اندر یہ گہری تبدیلی ساحری اور شاعری سے پیدا نہیں ہوا کرتی۔ آپ میں سے جو مقرر ہوں وہ پچھلے انداز

تقریر کو بدلیں اور ذمہ دار مومن کی طرح جچی تلی تقریر کی عادت ڈالیں۔ اور جو محرر ہیں انہیں بھی غیر ذمہ دارانہ انداز تحریر کو بدل کر اُس آدمی کی سی تحریر اختیار کرنی چاہیے جو لکھتے وقت احساس رکھتا ہے کہ اسے اپنے ایک ایک لفظ کا حساب دینا ہے

(۱۲) اسلامی تحریک میں کام کرنے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپکے گرد و پیش جو ہنگامے و ناطلب لوگوں نے برپا کر رکھے ہیں اور جن کا آپ کی تحریک کے نصب العین سے کوئی تعلق نہیں ہے ان سے آپ اس قدر بے تعلق ہو کر رہیں کہ گویا وہ آپکے لئے معدوم محض ہیں۔ آپ کو اسمبلیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور انکے الیکشنوں سے اور ہندو اور مسلمان اور سکھ وغیرہ قوموں کے نسانی جھگڑوں سے، اور مختلف پارٹیوں اور مذہبی فرقوں اور مقامی قبیلوں اور برادریوں کے نزاعات سے بالکل کنارہ کش رہنا چاہیے۔ بالکل یکسو ہو کر اپنے نصب العین کے پیچھے لگ جایئے اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دیجئے۔ جو عمل خدا کی راہ میں نہیں ہے اس میں مشغول ہو کر آپ اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کریں گے حالانکہ آپ کو اپنے وقت اور اپنی قوتوں کا حساب دینا ہے۔

(۱۳) اپنے مسلک کی تبلیغ میں حکمت اور موعظۂ حسنہ کو ملحوظ رکھیئے۔ حکمت یہ ہے کہ آپ مخاطب کی ذہنیت کو سمجھیں، اس کی غلط فہمی یا گمراہی کے اصل سبب کی تشخیص کریں اور اس کو ایسے طریقہ سے تلقین کریں جو زیادہ سے زیادہ اس کے مناسب حال ہو۔ اور موعظۂ حسنہ یہ ہے کہ جس پر آپ تبلیغ کریں اس کے سامنے آپ اپنے آپ کو دشمن اور مخالف کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے بہی خواہ اور دردمند کی حیثیت سے پیش کریں اور ایسے باوقار طریقہ اور شیریں انداز سے راہ راست کی طرف دعوت دیں جو کم سے کم تلخی پیدا کرنے والا ہو۔ اس کے ساتھ دو باتیں اور بھی ملحوظ رکھیئے۔ ایک یہ کہ جو شخص ہدایت سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہو اور دنیا کی زندگی میں مست ہو اس کے پیچھے نہ پڑیئے بلکہ جس میں یہ کیفیت نظر آئے اس سے اعراض کیجئے۔ دوسرے یہ کہ بے موقع تبلیغ نہ کیجئے۔ جب کوئی شخص یا کوئی گروہ دعوت الی الخیر سننے یا کسی نصیحت کو قبول کرنے کی موڈ میں نہ ہو اُس وقت اسے دعوت نہ دیجئے یا ایک وقت میں جتنی خوراک وہ قبول کر سکتا ہو اس سے زیادہ خوراک اس کے اندر اتارنے کی کوشش کرنا، یا تشدد، الحاح، جبر اور تلطف

وغیرہ طریقوں کو بے محل استعمال کرنا بجائے مفید اثر ڈالنے کے الٹا خراب اثر ڈالتا ہے۔ بعض لوگ کام کرنے کے جوش میں ان حدود کو نظر انداز کر جاتے ہیں، حالانکہ اسلام ایک حکیمانہ دین ہے اور اس کے مبلغ کو حکیم ہونا چاہیے۔

یہ ہدایات دینے کے بعد امیر جماعت اور اصحاب شوریٰ ایک الگ کمرے میں بیٹھ گئے اور ارکان جماعت کو علیحدہ علیحدہ بلا کر ہر ایک کے حالات اور صلاحیتوں کے لحاظ سے کام سپرد کیا، نیز جہاں جہاں مقامی جماعتیں بن چکی تھیں وہاں کے لئے امراء کا تقرر کیا۔

۵ شعبان:۔ کل کا لقیہ کام آج انجام دے کر اجتماع عام ختم کر دیا گیا۔ پھر امیر جماعت نے اصحاب شوریٰ کے مشورہ سے حسب ذیل امور طے کئے:۔

۱۔ جماعت کے ارکان میں جو لوگ اہل قلم ہوں ان کو چاہیے کہ ملک کے اخبارات اور رسائل میں جماعت کے نظریہ کو پھیلانے اور جماعت کے متعلق جو غلط فہمیاں شائع ہو رہی ہیں ان کا سدباب کرنے کی احسن طریق کوشش کریں۔

۲۔ جماعت کے ارکان کا اجتماع عام ہر سال کیا جائے جس کے لئے موسم اور دوسرے اعتبارات سے مارچ کا مہینہ موزوں رہے گا۔ اجتماع عام کے موقع پر جن لوگوں کو امیر جماعت مناسب سمجھے یا جن کے متعلق مقامی امراء سفارش کریں انہیں ایک مہینہ تک مرکز میں تربیت کے لئے روک لیا جائے گا۔

۳۔ جماعت کے چند منتخب ارکان جو ہر اعتبار سے جماعت کے مسلک کی بہترین ترجمانی کر سکتے ہوں، سال میں ایک مرتبہ وفد یا وفود کی شکل میں ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کریں اور دعوت عام کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ ملک کے بڑے بڑے اداروں، کالجوں، یونیورسٹیوں، دینی مدرسوں اور انجمنوں میں نفوذ کی کوشش کریں۔

۴۔ طے ہوا تھا کہ ایک ہفتہ وار اخبار جماعت کی طرف سے جاری کیا جائے اور اس کے لئے عبداللہ مصری صاحب نامزد بھی کر دیئے گئے تھے، لیکن اب نصر اللہ خاں صاحب عزیز کے شریک جماعت ہو جانے کی وجہ سے اس تجویز کو سردست عملی جامہ پہنانے کی ضرورت نہیں رہی۔ جماعت کی ضروریات کے لئے جناب عزیز کا اخبار "مسلمان" (لاہور) اب کافی ہوگا۔

(بقیہ اشارات صفحہ ۲۶۴/۱۶ سے آگے)

اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ	تم سے معذرت صرف وہی لوگ چاہتے ہیں جو اللہ اور یوم
الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ (التوبہ۔۴۵)	آخر پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دلوں میں شک ہے۔
وَمَآ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ	جس روز دونوں پارٹیوں کا مقابلہ ہوا اُس دن تم پر جو مصیبت
فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِیَعْلَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیَعْلَمَ	نازل ہوئی وہ اللہ کے اذن سے تھی، اور اس لیے تھی کہ اللہ دیکھنا
الَّذِیْنَ نَافَقُوْا۔ (آل عمران۔۱۷۰)	چاہتا تھا کہ مومن کون ہیں اور منافق کون۔

معلوم ہوا کہ مدعی ایمان کا سچ اور جھوٹ قطعی طور پر جس بات سے کھلتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کفر و اسلام کی کشمکش میں اسلام کے لئے کتنی جانفشانی دکھاتا ہے، کتنی محنت، کتنا وقت، کتنا مال صرف کرتا ہے، کتنے خطرات اور کتنے نقصانات اُس چیز کے لئے برداشت کرتا ہے جس کے برحق ہونے پر وہ کہتا ہے کہ میں ایمان لایا ہوں۔ یہ ایمان پیمائی کا ایسا مقیاس ہے جو اندر چھپی ہوئی مقدارِ ایمان کا پورا اندازہ بتا دیتا ہے۔ جو اس معاملہ میں پیچھے ہٹ گیا، میں نہیں کہتا بلکہ قرآن کہتا ہے کہ اس کا پیچھے ہٹنا اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس کے اندر ایمان نہیں ہے۔

اب اُن شرائط پر ایک نگاہ ڈالیئے جو ہم نے جماعت اسلامی کی رکنیت کے لئے بیان کی ہیں۔ ان میں ایسی کونسی چیز ہے جس کے ماخذ کا قرآن میں پتہ نہیں چلتا؟ قرآن کی بیان کردہ شرائط پر اضافہ تو درکنار ہم کو تو یہ خوف ہے کہ کہیں اُن میں تخفیف کرنے کا الزام ہم پر نہ آجائے۔

رہی یہ چیز کہ اہل ایمان کے گروہ میں داخل کرتے وقت لوگوں سے کلمۂ شہادت کے علاوہ بھی بعض چیزوں کا عہد لیا جائے، تو اس کا ثبوت بھی قرآن اور حدیث دونوں سے ملتا ہے اور اس میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے جو قاعدۂ کلیہ ہم نے مستنبط کیا ہے وہ یہ ہے کہ وقت

کے حالات کو ملحوظ رکھ کر اُن برائیوں کے ترک کرنے کا عہد لیا جائے جو سوسائٹی میں عام طور پر پھیلی ہوئی ہوں، اور اسی طرح اُن چیزوں کے التزام کا عہد لیا جائے جن کی اسلامی تحریک کے لئے زیادہ ضرورت ہو۔ مثلاً سورۂ ممتحنہ میں عورتوں سے خاص طور پر اُن برائیوں سے اجتناب کا عہد لینے کی ہدایت کی گئی جو اُس وقت عرب کی عورتوں میں پھیلی ہوئی تھیں:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (الممتحنہ ۱۲)

اے نبی، جب تمہارے پاس ایمان لانے والی عورتیں آئیں اور تم سے اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں گی اور چوری نہ کریں گی اور زنا نہ کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اور اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور نیک کاموں میں تمہارے حکم سے سرتابی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے اللہ سے دعائے مغفرت کرو (کہ پہلے جو کچھ ہو چکا اللہ اسے معاف فرمائے) یقیناً اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اسی طرح بیعت عقبہ کے موقع پر جب انصار کا وفد اسلام قبول کرنے کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو آپ نے ان سے صرف کلمہ ہی نہیں پڑھوایا تھا بلکہ اور بھی چند باتوں کا عہد لیا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت سے متعدد روایتوں میں اس عہد کے مختلف حصے مروی ہیں جنکو ملا کر پورے معاہدۂ بیعت کا مضمون اس طرح بنتا ہے:۔

قال وحوله عصابة من اصحابه بايعوني على ان لا تشركوا بالله شيئا ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا اولادكم ولا تاتوا ببهتان تفترونه بين ايديكم وارجلكم

صحابہ کے ایک گروہ کی موجودگی میں آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ رکھو گے اور نیک کاموں

ولا تعصونی فی معروف (بخاری کتاب الایمان)

میں تیرے حکم کی خلاف ورزی نہ کروگے۔

بایعناہ علی ان لا نشرک باللہ شیئاً ولا نسرق ولا نزنی ولا نقتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا ننتہب ولا نقصی۔ او قال ولا نعصی۔

ہم نے آپ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائینگے، چوری نہ کرینگے، زنا نہ کرینگے کسی جان کو جسکی حرمت اللہ نے قائم کی ہے حق کے بغیر قتل نہ کرینگے، لوٹ مار نہ کرینگے، اور اپنے معاملات کا فیصلہ خود نہ کرینگے (یعنی قانون اپنے ہاتھ میں نہ لینگے) یا یہ کہا کہ نافرمانی نہ کریں گے۔

(بخاری باب وفود الانصار)

بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی نشاطنا وکسلنا وعلی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر وعلی ان نقول بالحق ولا نخاف فی اللہ لومۃ لائم وعلی ان ننصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قدم علینا یثرب فنمنعہ مما نمنع منہ انفسنا وازواجنا وابناءنا ولنا الجنۃ

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ مصیبت اور راحت دونوں میں حکم سنیں گے اور مانیں گے، بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے، حق بات کہیں گے اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ کریں گے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب یثرب تشریف لے آئینگے تو ہم آپ کی مدد کرینگے حتیٰ کہ جس طرح اپنی جانوں کی اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اس طرح آپکی حفاظت کرینگے اور ہمیں جنت کے سوا کوئی دنیوی صلہ مطلوب نہیں ہے۔

(مسند احمد)

اپنی نظائر کو پیش نظر رکھ کر ہم نے جماعت اسلامی کی رکنیت کے لئے کلمۂ شہادت کے علاوہ چند شرائط تجویز کی ہیں جن میں سے بعض کا پورا کرنا لازم ہے اور بعض کے مطابق بتدریج اپنی زندگی کی اصلاح کرنے کا ہر شخص کو عہد کرنا ہوگا ان شرائط کو تجویز کرنے میں ہم نے خدا اور رسول کی ہدایات کے ساتھ وقت کے حالات اور ضروریات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی نقص ان میں باقی رہ گیا ہو تو وہ ہمارے اپنے قصور علم کا نتیجہ ہے، اللہ ہمیں اس کی اصلاح کی توفیق بخشے۔

ہمارا کتب خانہ

الجہاد فی الاسلام قیمت بے جلد چار روپے مجلد پانچ روپے

رسالہ دینیات (اردو) قیمت بے مجلد بارہ آنے مجلد ایک روپیہ

سیاسی کشمکش حصہ اول قیمت بے مجلد چھ آنے (۶/)

" " دوم قیمت بے جلد ایک روپیہ چار آنے

" " سوم قیمت بے جلد ایک روپیہ (عہ)

مسئلہ قومیت قیمت بے جلد بارہ آنے (۱۲/)

سیاسی کشمکش ہر سہ حصص مع مسئلہ قومیت مجلد چار روپے

تنقیحات قیمت بے جلد ایک روپیہ چار آنے مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

تفہیمات قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنے مجلد دو روپے

پردہ قیمت بے جلد ایک روپیہ چار آنے مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

خطبات قیمت بے جلد ایک روپیہ چار آنے مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

سلامتی کا راستہ قیمت ایک عدد ۳/ قیمت پانچ عدد ۱۲/

اسلام کا نظریہ سیاسی قیمت ایک عدد ۳/ قیمت پانچ عدد ۱۲/

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے قیمت ایک عدد ۳/

" " " " قیمت پانچ عدد ۱۲

اسلام اور جاہلیت قیمت ایک عدد ۳/ قیمت ۵ عدد ۱۲/

نیا نظام تعلیم قیمت ایک عدد ۳/ پانچ عدد ۱۲/

تجدید و احیاء دین قیمت ایک عدد ۸/ پانچ عدد ۶/

ایک اہم استفتاء قیمت ایک عدد ۱/ پانچ عدد ۴/

دستور جماعت اسلامی قیمت ایک عدد ۱/ پانچ عدد ۴/

جماعت اسلامی کے اجتماع اول کی روداد

قیمت ایک عدد ۱/ قیمت پانچ عدد ۵/

ہمارے نبی کے صحابہ قیمت ۸/

سید البشر قیمت ۷/

النبی الخاتم قیمت مجلد ۸/

تذکرہ ولی اللہی (الفرقان کا ولی اللہ نمبر) قیمت ۶/

TOWARDS UNDER STANDING ISLAM Rs. 1/8/-

PROCESS OF ISLAMIC REVOLUTION As. -/6/-

NATIONALISM AND INDIA As. -/6/-

ISLAMIC CONCEPTION OF STATE As. -/3/-

ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور

رسالہ دینیات

رسالہ دینیات | یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اس میں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۲ محصول ڈاک ۲ خرچ وی پی ۳

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in veiw has been to present within a brief space the most systemaic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and ucid account of what this religion in reality is.

Price 1-8-0

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

صرف سرور قی پکن پریس بیل روڈ لاہور میں طبع ہوا

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انھیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور فلاسفہ ذہنیت رکھنےوالی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

بس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں آج سے شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور